FICTION HOUSE

وزیر آباد کی گوگی
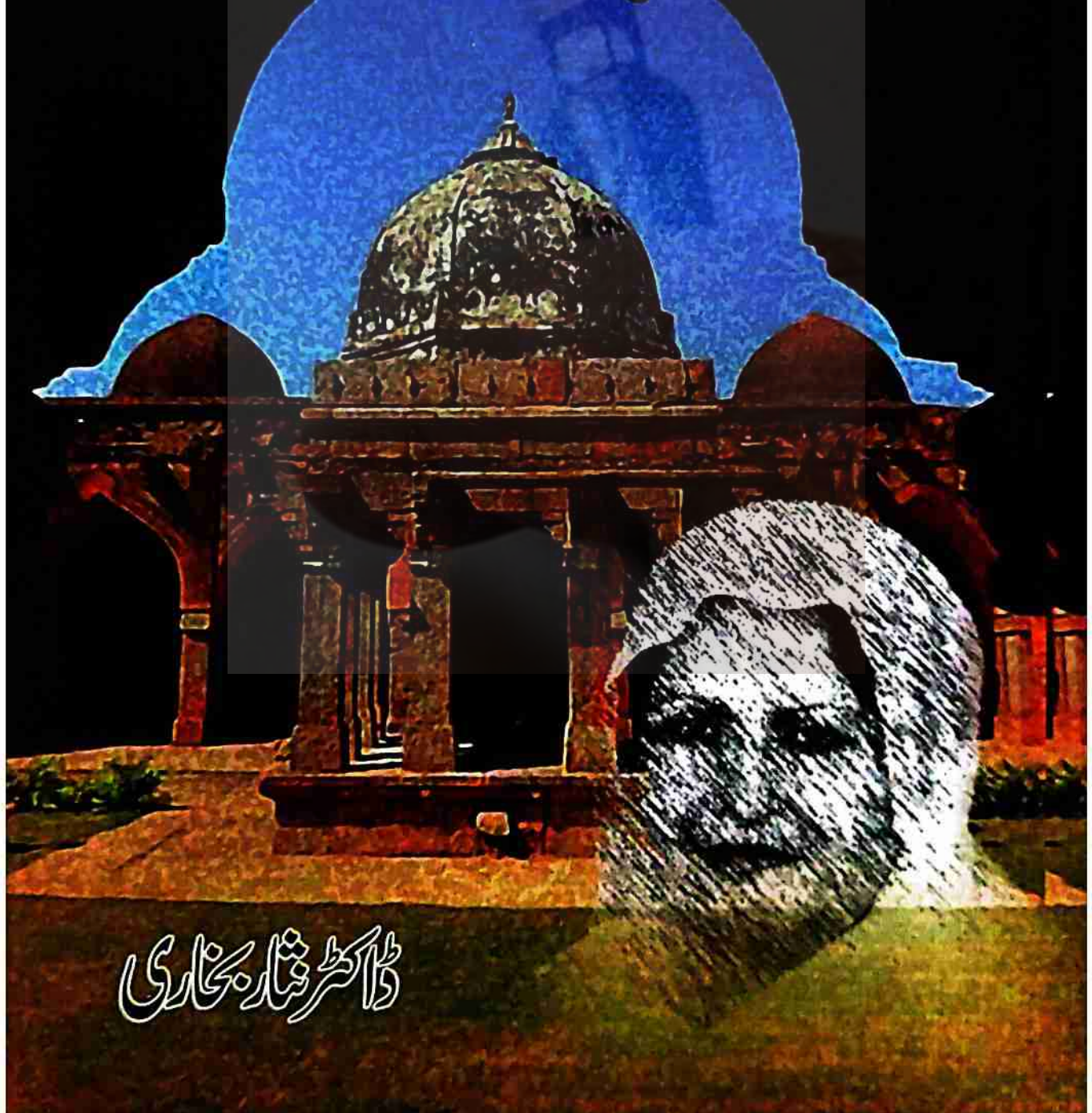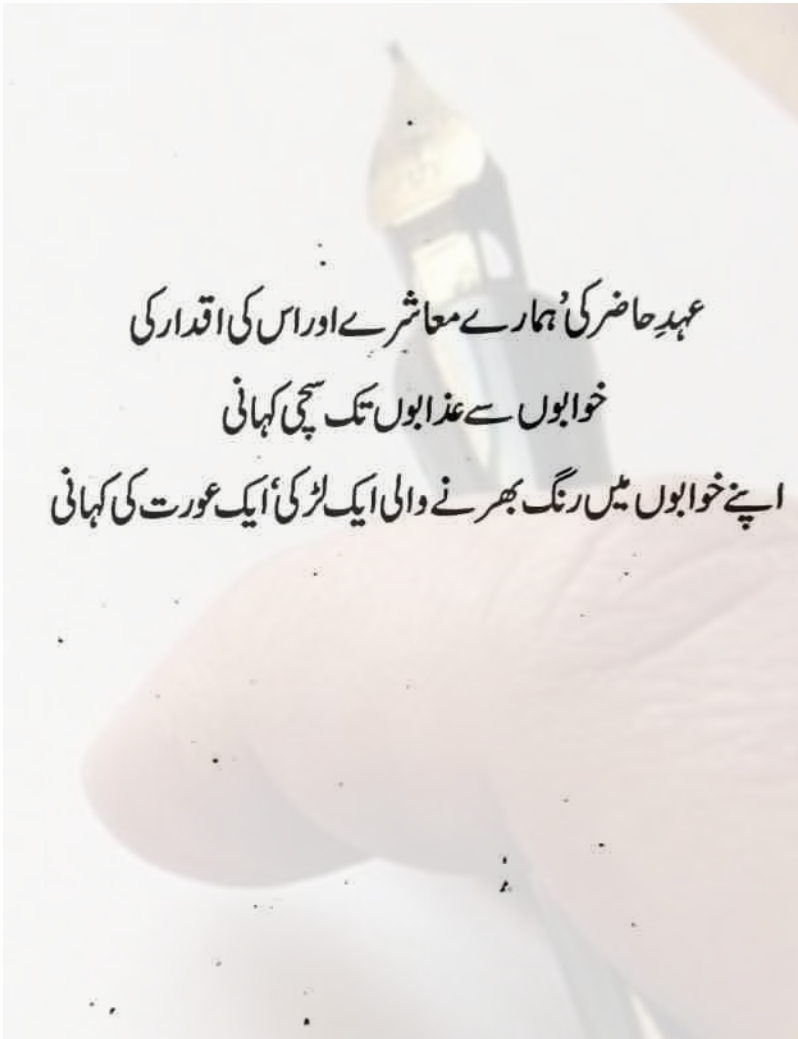
عہدِ حاضر کی ' ہمارے معاشرے اور اس کی اقدار کی

خوابوں سے عذابوں تک سچی کہانی

اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے والی ایک لڑکی ' ایک عورت کی کہانی

وزیر آباد کی گوگی

ڈاکٹر نثار بخاری

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد

e-mail: fictionhouse1991@gmail.com

مصنف کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

نام کتاب	:	وزیر آباد کی گوگی
مصنف	:	ڈاکٹر نثار بخاری
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2018ء
قیمت	:	-/500 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ، لاہور۔فون:042-36307550-1,37249218

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک، حیدر آباد۔فون:022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار، کراچی۔فون:021-32603056
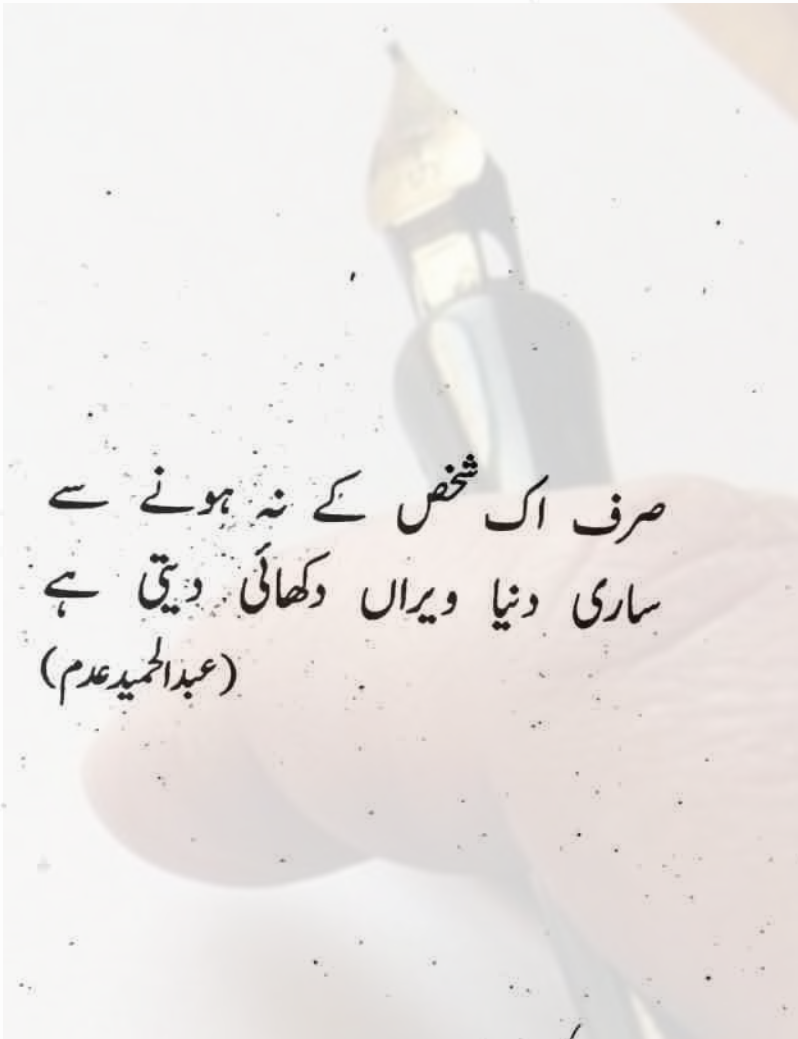
لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

عصمی کی کہانی۔۔۔۔۔

عصمی ہی کے نام!!

کہانیاں تھیں ' کہیں کھو گئی ہیں' میرے ندیم
محبتیں تھیں 'فنا ہو گئی ہیں' میرے ندیم
(فیض احمد فیض)

صرف اک شخص کے نہ ہونے سے
ساری دنیا ویراں دکھائی دیتی ہے
(عبدالحمید عدم)

پہلے اس چھوٹی سی کہانی کو پڑھیئے

1965 کی پاکستان بھارت جنگ جاری تھی جب میرے والدین نے رشتہ برادری میں ایک لڑکی کو میری شریکِ حیات بنانے کے لئے پسند کیا۔ لڑکی بہت اچھی تھی۔ اس کے گھر والے بھی راضی تھے۔ لیکن میری مشکل یہ تھی کہ میں کسی مکمل اجنبی لڑکی سے شادی کرنی چاہتا تھا جو مجھے جانتی ہو اور نہ میں اسے۔ دوسرے' مجھے رنگت میں ہلکا سانمک پسند تھا اور ماں باپ کی پسند خالص دودھ' مکھن کی بنی تھی۔ بہر کیف' ماں نے ترازو کے ایک پلڑے میں مجھے اور دوسرے میں اسے بٹھا دیا تو میں آپ ہی آپ بک گیا۔ پھر وہ لڑکی تو اپنے گھر پہ انجان بیٹھی رہی اور میں نے اسے اپنی چاہت بنانے کے لئے اتنا سوچا' اتنا سوچا کہ وہ میرے خوابوں میں بھی رچ بس گئی۔

تب یوں ہوا کہ میرے گھر والوں نے کسی سبب وہ رشتہ رد کر دیا۔ میرے لئے یہ اک 'سونامی' تھا جس نے مجھے تہہ و بالا کر دیا۔ انہی دنوں میری چھوٹی بہن کو "آل پاکستان انٹر کالجیٹ کانٹیسٹ۔ 1966 کے لئے افسانہ درکار تھا۔ دل لگی اب دل کی لگی بن چکی تھی۔ چنانچہ افسانے کے سارے لوازمات سمیٹ کر میں نے اپنی چاہتوں' جذبات کو اس کہانی میں پرو دیا۔ دوسروں کی طرح یہ افسانہ بھی سٹیج پر پڑھا گیا۔ اس مقابلے میں ہزاروں طلبا' ان کے والدین اور دور دور سے آئے مہمانوں نے شرکت کی۔ میں نے سوچا سامعین میں بیٹھے میرے ماں باپ میرے دل کی آواز سن کر جان لیں گے کہ ان کی خواہش کو اپنی خواہش بناتے بناتے میں اپنی کشتیاں جلا چکا ہوں۔ لیکن وہ میری فریاد سننے گئے ہی نہیں۔

"چنبے کی کلی" میری کہانی۔ محض اک داستان' اک افسانہ تھا۔ جو میری لکھی اور بہت سی کہانیوں کی طرح سچ میں ڈھل گئی۔ یہ میری چھوٹی بہن کی ملکیت ہے کہ اسی کے نام سے انٹر کالجیٹ کانٹیسٹ میں شامل اور پھر شائع ہوا۔۔۔ "نظریہٗ ضرورت " کے تحت' بہت معذرت کے ساتھ میں نے اسے مستعار لیا ہے۔
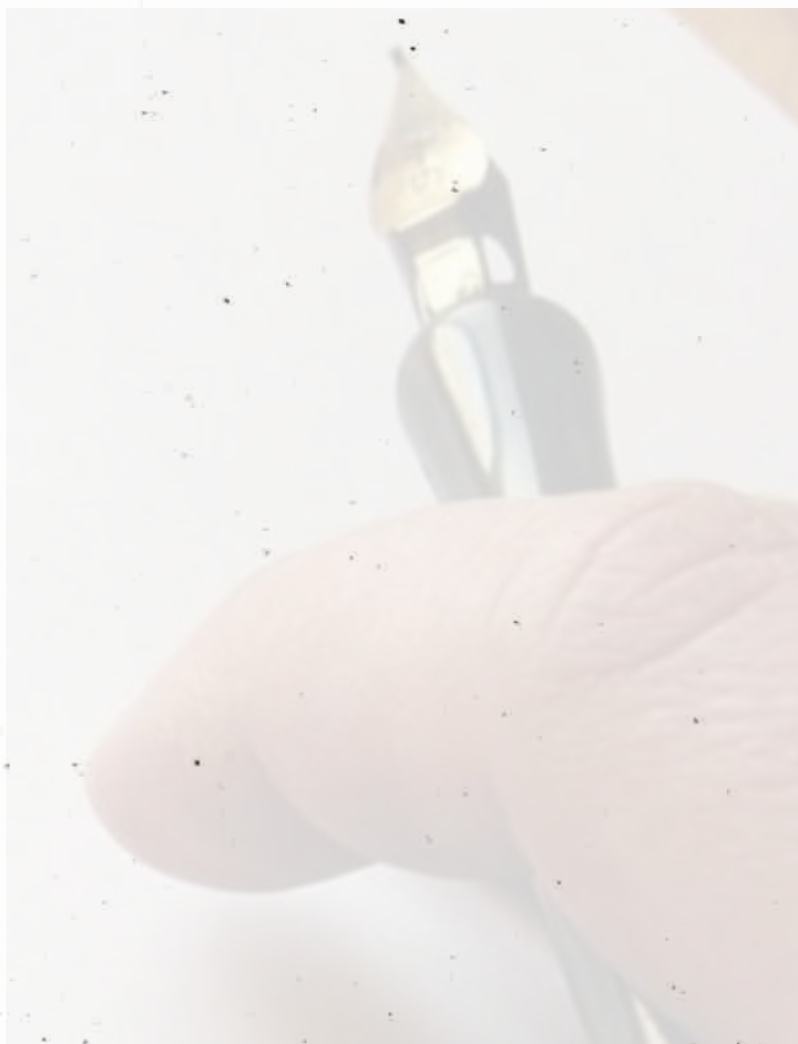
''چنبے کی کلی''

میری انگلی پہ لپٹی بل کھاتی زنجیر ٹوٹ کر فرش پر جا پڑی۔ اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو عم زاد افتخار کا لیکچر جاری تھا۔

"لامپی میں فطرت کی رنگینی بہت ہی انوکھی ہے۔ میں وہاں دو مرتبہ ماموں کے ہاں جا چکا ہوں۔ تمہاری وہاں تقرری کے بعد تمہیں ماموں سے ملنے کا پہلا اتفاق ہو گا۔ بچپن میں شاید تم نے انہیں دیکھا ہو۔ بہر کیف۔۔۔" سگریٹ مسل کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ " لامپی ایک قصبہ سہی لیکن اس کی اونچی نیچی پہاڑیاں اور ان سے پھوٹتے چشمے تمہیں پسند آئیں گے۔ وہاں کا اصل حسن تو لمپی جھیل ہے۔۔۔ بالم اور گوپی کی مکمل داستان۔ بے شمار جھرنے اس جھیل میں جا ملتے ہیں۔ وہیں لمپی کنارے ماموں سرخ اینٹوں والے بنگلے میں رہتے ہیں۔ دراصل وہ پہلے ایک مندر تھا جس کے کچھ آثار اب بھی بنگلے کی پشت پر موجود ہیں۔ ممکن ہے اس کی دیوار سے سر پھوڑتی ننھی منی لہروں میں تم دیومالا کی کہانیاں تلاش کرو لیکن بنگلے کے اندر ماموں کی شراب نوشی اور ان کے صاحبزادوں کی لغویات تمہارے لئے تکلیف دہ ثابت ہوں گی۔ ان کے ماحول سے دور رہنا۔ بہر کیف۔۔۔ اس کیچڑ میں تمہیں ایک کنول بھی ملے گا۔۔۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اور اگر کبھی تمہیں محسوس ہو کہ پتھر میں دراڑیں پڑ گئی ہیں تو عصمت کی رفاقت یقیناً" تمہارے لئے ایک اچھا پیام ہو گی۔۔۔"

وہ لحظہ بھر کو رکا۔ اسی لمحے انجن نے وصل دی اور وہ مسکرا کر بولا۔ "خیر۔۔۔ پروفیسر صاحب! اب تم لامبی گورنمنٹ کالج میں ملازمت کے لئے جارہے ہو۔ زوالوجی پڑھاؤ گے لہٰذا دل کی باتیں تمہیں میں نہیں سمجھا سکتا۔ کبھی خود جان لو گے۔ میں اطلاع کا منتظر رہوں گا کہ چنبے کی اس کلی نے تمہارے دل کی لطیف دھڑکنوں کو جگادیا ہے۔۔۔"

گاڑی سرکنے لگی تھی۔ میں ڈبے کی جانب بڑھا۔ وہ بھی میرے ساتھ بولتا چلا آیا۔

"گاڑی لامبی نہیں جاتی۔ رام پور اتر جانا۔ وہاں سے تمہیں بس مل جائے گی۔ لامبی اڈے پر شاید ماموں تمہیں لینے آئے ہوں۔ میں نے انہیں خط لکھ دیا تھا۔۔۔"

"اچھا۔۔!" میں نے سر ہلایا اور سوار ہو گیا۔ دروازے میں کھڑے میں نے دیکھا۔ وہ بازو لہرا کر مجھے الوداع کہہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا وجود سمٹتا گیا۔ تبھی اس کی باتیں میرے ذہن میں ابھرنے لگیں۔ "اسی کیچڑ میں تمہیں ایک کنول بھی ملے گا۔ اور اگر کبھی تمہیں محسوس ہو کہ پتھر میں دراڑیں پڑ گئی ہیں تو۔۔۔" میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ "لمبی تیرا کنول میں بھی دیکھوں گا!!" میں نے سوچا۔

اور وہ کنول میں نے لامبی پہنچنے سے اگلی صبح دیکھا۔ میں بستر پہ نیم دراز' کتاب پڑھ رہا تھا جب وہ میرا ناشتہ لائی۔ نگاہیں جھکائے' نچلے لب کے کنارے کو دانتوں تلے دبائے وہ چند لمحے میرے قریب کھڑی رہی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر پل بھر اس نے میری جانب دیکھا اور ٹرے میز پر رکھ کر چائے بنانے لگی۔ چینی ہلاتے ہوئے یکبارگی اس کے لب کانپے اور وہ آہستہ سے بولی۔

"شام آپ چائے پیتے ہیں نا۔۔۔؟!"

"اگر بارِ خاطر نہ ہو تو۔۔۔" جانے میری آواز اتنی کیوں بدل گئی۔ اس کی پلکیں اٹھیں' سیاہ پتلیوں میں اک ستارہ دمکا اور میں نے محسوس کیا لمپی کی ساکن لہروں میں تلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ وہ خاموشی سے چلی گئی۔ پتھر پہ نرم لہروں کے پہلے چھینٹے جذب ہو گئے تھے۔

اس سے دوسری ملاقات بالکل غیر متوقع طور پر کالج میں ہوئی۔ چارج لینے کے بعد میں کلاس میں پہنچا تو لڑکیوں کی پہلی صف میں نگاہیں پھسلتی ہوئی اس پر جا رکیں۔ مجھے ایسا گمان بھی نہ تھا۔ بس اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ نگاہیں جھکائے ناخن سے میز کی سطح کھرچ رہی تھی۔ اس کے لبوں کی لرزش اور انگلی کی بے چین حرکت سے اس کی گھبراہٹ عیاں تھی۔ ایک بار اس نے سر اٹھایا' پلکیں تیزی سے جھپکیں اور پھر مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے سر جھکا لیا۔ اس لمحے میرا اعتماد جیسے ڈگمگا سا گیا۔ بہت مشکل اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر جب لیکچر ختم ہوا تو پہلی بار میں نے اس کی نگاہوں میں تحسین کی جھلک دیکھ لی۔ پیریڈ کے بعد میرے قریب سے گذرتے جو محتاط سی مسکان اس کے لبوں پر تیر گئی تھی اس کا پیام مجھے مل گیا تھا۔

کئی روز بیت گئے۔ گھر اور کالج میں وہ میرے احساسات کے قریب تر آتی گئی۔ میری سوچ اور تصور میں اس کا پیکر گہرا ہوتا گیا۔ پھر انہی دنوں گھر سے مجھے افتخار کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ ملازمت مل جانے کے بعد اب میری شادی کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ تب پہلی مرتبہ' یونہی' عصمت میرے مستقبل کی ایک جھلک بن کر میری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ میرے ذہن' میرے جذبات نے کچھ اتنی اپنائیت کے ساتھ اسے قبول کیا کہ میں نے جواب میں افتخار کو اس سے متعلق سب کچھ لکھ دیا۔ "لمپی کی نرم لہروں نے پتھر کو شکستہ کر دیا ہے۔۔۔" اس کے بعد سبھی اس تیزی سے ہوا جس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ امی اور ابا جان دونوں لامپی آئے اور ہم دونوں کا منگنی بندھن کر کے لوٹ گئے۔ یہ اتنا اچانک تھا کہ عصمت سنبھل سکی نہ میں۔ وہ مجھ سے کترانے لگی اور جب میں کالج ہاسٹل میں اٹھ آیا تو اس پر شرم و حیا کا احساس

اور بھی گہرا ہو گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دسمبر ٹیسٹ میں وہ میرے ہی مضمون میں فیل ہو گئی۔ مجھے اس پر ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی بہت ہوا۔ اب ماموں سے ذکر کر کے اسے پڑھانے کی ذمہ داری بھی میں نے اپنے اوپر لے لی۔

اس حیا آلود ماحول کو توڑنا بہت کٹھن تھا۔ کتنے ہی روز گذر گئے پھر سمجھوتہ ہوا اور بالآخر دوستی ہو گئی۔ دوستی ہوئی تو جنبے کی وہ سمٹی کلی چٹکنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی سہمی سمٹی شوخیاں ابھرنے لگیں۔ گذرتے لمحوں کے ساتھ میں اسے اچھی طرح جان گیا۔ ہر شام میں اسے پڑھانے جاتا تو کوئی نئی شرارت میری منتظر ہوتی۔ بھولی بھولی باتیں' معصوم کھکھلاتے قہقہے میری روح میں کچھ یوں جذب ہو جاتے کہ چنبیلی کی ڈھیروں کلیاں میری نگاہوں کے سامنے جھڑنے لگتیں۔ مجھے یوں لگتا جیسے زندگی پیہم اس کی آرزو میں ڈھل گئی ہو۔ دل کی ہر دھڑکن اس کا نام۔ میں پل پل اسے تکے جاتا۔

امتحان کے دن قریب آرہے تھے اور اس کی شوخی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ دوسرے مضامین تو خیر جیسے تیسے میں نبٹا لیتا تھا لیکن اردو پڑھانا میرے لئے بہت کٹھن کام تھا۔ مقالے' افسانے یا ناول کے ارتقا سے متعلق کچھ کہنے کو لب ہلاتا تو وہ دوپٹے کوٹی کوزی بنا کر کانوں پر چڑھا لیتی۔ اب میں لاکھ سمجھاؤں' خوشامد کروں' دھمکی دوں کہ پھر دوبارہ نہیں پڑھاؤں گا لیکن اس پر خاک بھی اثر نہ ہوتا۔ تکیئے یا چٹائی کے نیچے چھپائی ہوئی چمن زارِ غزل نکال کر پنکھا جھلنے لگتی۔ میں ہار مان کر بے بسی سے اس کا منہ تکتے رہ جاتا۔ اسے شاید اسی قدر انتظار ہوتا۔ دیئے کی مدھم لو میں اس کی آنکھیں دمک اٹھتیں۔ کانوں کے گرد لپٹا غلاف اتر جاتا۔ وہ الہامی کتابوں کی مانند کتاب کو چوم کر ماتھے تک لے جاتی اور پھر مسکرا کر شعر پڑھنے لگتی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے' آنکھیں موندے اسے مطلب سمجھائے جاتا۔ یونہی مئی کا دوسرا ہفتہ بھی ختم ہو گیا۔ امتحان میں صرف دو ہفتے رہ گئے تو وہ بھی قدرے سنجیدہ ہو گئی۔ لیکن میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے اس کا نہیں میرا اپنا امتحان قریب آگیا ہو۔ ایک مرتبہ پھر

دہرائی شروع ہو چکی تھی۔ ایک مضمون ختم ہوتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ چند غزلیں رہ گئی تھیں۔ ذرا فارغ وقت ملا تو میں اسے لے بیٹھا۔ اس نے غالب کا شعر پڑھا۔

"کسی کو دے کے دل کوئی۔۔۔"

میں مطلب سمجھانے لگا تو اس نے ٹوک دیا۔ پھر ایک بار میری آنکھوں میں جھانکا اور جیسے اس کے سارے وجود کا پیار اس کی آواز میں سمٹ آیا ہو' پلکیں جھکا کر بولی۔

"اس کا مطلب تو میں سمجھتی ہوں۔۔۔۔"

موتیے کی بے شمار سپید سپید کلیاں میری نگاہوں کے سامنے بکھر گئیں۔ چاندنی بھی انہی کی طرح چٹک گئی تھی۔ اک حسین سا تاج محل میرے سپنوں میں ابھرنے لگا۔ لمبی کنارے' حسین خوابوں کی مانند ترشا ہوا تاج محل۔ میرے لب ہولے سے ہلے۔۔۔ "عصمی۔۔۔" وہ سہمی سمٹی محتاط سی سرگوشی لمبی کی ننھی منی لہروں میں ڈوب گئی۔ خواب محل کے ہر گوشے میں عصمت کی آواز تھرانے لگی اور وہ سمٹتا ہوا دیئے کی ٹمٹماتی لو میں جذب ہو گیا۔ میں نے عصمت کی طرف دیکھا وہ انگلی ہلا ہلا کر بار بار گا رہی تھی۔

"تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو۔۔۔۔"

"عصمت پلیز۔۔۔!" میں اس کی ایسی بے رحمی پر سسک اٹھا۔ اس کا لہراتا بازو تھم گیا۔ چند لمحے وہ بڑے غور سے مجھے گھورتی رہی اور پھر سر دھننے لگی۔

"وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔۔۔۔"

اک شرارہ سا میرے من میں پھوٹا اور میری نس نس کو جلا گیا۔ میں نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر کتاب چھین لی۔ وہ یکدم ساکت ہو گئی۔ شاید اس کے احساس کو ٹھیس لگی تھی۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں اور کتاب اسے واپس کرتے ہوئے بولا۔

"عصمی! کسی وقت تم بہت سنگدل ہو جاتی ہو۔ ذرا سوچو تو۔ تمہارے اس امتحان۔۔۔"

اس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر بولی۔ " اچھا اب سنجیدگی سے۔
وعدہ رہا۔"

یہ وعدہ کئی بار ہوا اور کئی بار ٹوٹا۔ حتیٰ کہ امتحان کی صبح آگئی۔ وہ تمام رات میں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ میرا دھیان اسی طرف لگا رہا۔ اس روز مجھ سے ٹھیک طرح لیکچر بھی نہ دیا گیا۔ خرگوش کے نظامِ دوران خون کے درمیان ہی کہیں ذہن کے گوشوں سے ٹینی سن اور شیکسپیئر آن نکلتے۔ ذہنی انتشار سے تنگ آ کر میں نے کلاس چھوڑ دی اور اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر دراز اس سے متعلق سوچنے لگا۔ پھر مجھے عصمت ہی نے آ کر جگایا۔ وہ بہت خوش تھی لیکن میں نے جب تک ہر سوال کا جواب پوچھ نہ لیا میری تسلی نہ ہوئی۔ اسی طرح اگلی کئی راتیں میں نے جاگ کر گذاریں۔ کئی گھنٹے میرا دماغ ماؤف رہا۔ کتابوں کا ڈھیر آہستہ آہستہ سرکتا گیا۔ پرچے ایک ایک کر کے کم ہوتے گئے۔ جس روز وہ اردو کا پرچہ کر کے آئی اس کا چہرہ کچھ اترا ہوا تھا۔ میرا جی دھک سے رہ گیا۔ اس نے پرچہ مجھے تھمایا اور ایک طویل سانس لے کر بولی۔

"پرچہ اچھا نہیں ہوا۔۔۔!!"

"اچھا نہیں ہوا؟" میرا سارا وجود بھک سے اڑ گیا۔ "عصمی! اردو کا پرچہ اچھا۔۔۔"

"ہاں!۔" اس نے کرسی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں میچ لیں۔ "وہ پہلا شعر تھا نا۔

"ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغِ شوقِ سجود جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے"

"میر کا یہ شعر تو تم نے کئی بار کیا ہوا تھا۔۔۔" میں جلدی سے بولا۔

"کیا تو تھا' پر۔۔۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "اب جو لکھنے لگی تو مطلب ادھورا رہ گیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سر جھکنے لگا اور میری آنکھ لگ گئی۔۔۔" وہ رک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں گم سم اسے تک رہا تھا۔ تب وہ مسکرا کر بولی۔

"پھر میں نے اک خواب دیکھا اور خواب میں اک شہزادہ دیکھا۔۔۔"

اور اس خواب کی بات نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا کہ آگے کیا ہوا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ شہزادہ اس خواب دیکھنے والی چنچل شہزادی کا ہاتھ تھام کر اسے اجلے سفید پروں والی پریوں کے دیش لے گیا ہو گا۔ میں تیزی سے اٹھا اور اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ وہ مچلی تو میں نے اس کے بالوں کو تھوڑا اور کسا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"کسی وقت تم بہت بے رحم ہو جاتی ہو۔ میری جان پہ بن آئی تھی اور تم۔۔۔"

وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسے' آنکھیں میچے ہنستی رہی۔ میں ہی اپنی جگہ پہ لوٹ آیا۔ اس نے ایک آنکھ ذرا سی کھول کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"اتنے روز نہیں ستایا۔ آج تو لِٹل لِٹل اجازت ہونی چاہئیے نا؟" میں خاموش رہا تو وہ ہاتھ باندھے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ "روٹھ گئے؟ اچھا اب صلح۔ اب تو امتحان ختم' ستانا بھی ختم۔۔۔" چنبے کی کلی مہک رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اسے اپنے تصور میں سمیٹ لیا۔

امتحان ختم ہوا تو میری اور اس کی قربت بھی ٹوٹ گئی۔ مجھے اپنا وجود کھوکھلا محسوس ہونے لگا۔ اس کے شوخ معصوم قہقہے اک یاد سی بن گئے اور وہ یاد تنہائی میں اور بھی ستانے لگی۔ بہت جی چاہتا اس سنگ بیٹھ کر مستقبل کے حسین تانے بانے بنوں' خوبصورت پھولوں سے بھری کیاریاں بناؤں۔ لیکن عصمت کی آئندہ تعلیم کا خیال ان سے بھی زیادہ ابھرنے لگا تھا۔ اور میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ماموں جان سے بات کیسے کروں؟ پھر ایک شام میں نے ہمت کر ہی لی۔ وہ بنگلے سے ملحق احاطے میں تنہا تھے۔ شاید غم غلط کرنے کی تیاریوں میں تھے لیکن مجھے

دیکھ کر بوتل تکیئے کے نیچے چھپادی۔ اس لمحے مجھے اس انسان کی بے بسی پر بہت ترس آیا۔ اپنے غموں کی کیسی کیسی خود ساختہ دیواریں انہوں نے اپنے گرد کھڑی کرلی تھیں۔ میرا جی چاہا انہیں سمجھاؤں لیکن میرے مقصد نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر میں نے جھجکتے جھجکتے ساری بات کہہ ڈالی۔ مجھے معلوم تھا کفالت ان کی مجبوری بنے گی تبھی ان کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی میں نے عصمت کے تمامتر اخراجات کی ذمہ واری اپنے اوپر لے لی۔ وہ کافی دیر سوچ میں ڈوبے رہے پھر بولے۔

"عصمت کی رضامندی۔۔۔"

"اسے میں منالوں گا۔۔۔" میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹ دی۔

لیکن جب عصمت کی باری آئی تو وہ اکڑ گئی۔

"میں نہیں بنتی ڈاکٹر واکٹر۔ مجھے کوئی ملازمت کرنی ہے ؟!"

میں نے بہت خوشامد کی، قسمیں دیں لیکن اس کا بس ایک ہی جواب تھا۔ "آگے نہیں پڑھوں گی"۔ اب ایک ہی حربہ میرے پاس رہ گیا تھا۔ میں اسے کلائی سے پکڑ کھینچتا علیحدگی میں لے گیا۔

"بخدا تمہاری ملازمت کا میرے ذہن میں شائبہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ذراسوچو تو عصمی! شادی سے کچھ بعد ہی اگر میں مر۔۔۔"

اس نے تیزی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چھی! ایسی باتیں بھی بھلا کرتے ہیں۔۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے۔ "خدا کرے۔۔ خدا کرے۔۔۔ آپ سے پہلے میں مر جاؤں۔۔۔"

میرا جی چاہا ٹوٹنے سے پہلے ہی مالا کے تمام موتی سمیٹ لوں لیکن دہکتے ہوئے لوہے پر جو ضرب میں نے لگائی تھی اس میں ابھی کچھ کسر باقی تھی۔ میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں! اور کچھ نہیں سنوں گی۔۔۔"وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔"آپ مجھ سے مشورہ لیتے ہی کیوں ہیں۔یوں بھی آپ کہیں اور میں بھلا نہ مانوں؟؟؟!"

کہکشاں کے سارے ستارے ایک بار دمکے اور پھر سلگتی پھلجھڑی کے شراروں کی مانند سب کے سب پھوٹ بہے۔ میں نے پہلی بار اس کا یہ روپ دیکھا تھا۔اسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ دھند میں ڈوبتا ابھرتا فقط مناسب سی تشبیہات ہی ڈھونڈ تا رہا۔ میرے ذہن میں سینکڑوں کتابوں کے اوراق الٹتے چلے گئے۔ کیٹس' شیلے' ورڈزورتھ' حافظ' جامی' سعدی' لیکن کوئی بھی شہ پارہ مجھے شاہکار تشبیہہ نہ دے سکا۔ اس تمام رات وہ آنسو میری آنکھوں میں جھڑتے رہے اور میں عصمت کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اس کے احساس کو ٹھیس لگائی تھی لیکن مجھے خوشی تھی کہ میری خواہش پوری ہو گئی۔ اب مجھے صرف اس کے رزلٹ کا انتظار تھا۔

جس صبح نتیجہ نکلنا تھا وہ ساری رات ہم دونوں نے مندر کی ٹوٹی سیڑھیوں پہ بیٹھے گذار دی۔ یوں جیسے دو اجنبی روحیں راستہ بھول کر ادھر آن نکلی ہوں۔ کبھی کبھار اس کے لب تیزی سے ہلنے لگتے اور دعا کے مدھم سے ایک دو لفظ سنائی دے جاتے۔ میں ہولے سے "آمین" کہتا اور آنکھیں بند کر کے نور کی اس کرن کی تلاش میں نکل جاتا جس نے گوتم کو شانتی بخشی تھی۔ پھر وہ کرن نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں مچلی اور میرے من میں پھوٹ بہی۔ عصمت نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔

"آذان ہو رہی ہے۔ اخبار تو اب آگیا ہو گا نا۔۔؟؟" وہ بے یقینی سے خود ہی سر ہلانے لگی۔

" اخبار تو اب آگیا ہو گا نا۔۔؟" میں نے منہ بنا کر اسے چڑایا۔"رات ہی رات میں کیا حلیۂ بنالیا ہے۔ جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔"

"ہائے اللہ! جائیے بھی نا!۔" اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔ "سچی میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔۔"

پھر مجھے جانا ہی پڑا۔ اتنی سویرے سویرے لاری اڈہ جاتے جاتے میری ورزش تو خوب ہو گئی لیکن اخبار واقعی آچکا تھا۔ دھڑکتے دل سے میں نے اس کا رول نمبر ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ اوپر ہی مل گیا۔ وہ سارے زون میں دوم رہی تھی۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ سیدھے راستے کی بجائے کھیتوں ہی میں دوڑنے لگا۔ وہ مندر کی سیڑھیوں پر ہی بہت بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے بازو لہرا لہرا کر "دوم۔۔۔ دوم۔۔۔ زون میں دوم' کالج میں اول۔۔۔" کا نعرہ لگانا شروع کر دیا لیکن جب تک اس نے خود اپنی آنکھوں سے اخبار میں اپنا رول نمبر دیکھ نہ لیا اسے یقین نہ آیا۔ پھر یکدم اسے نجانے کیا ہوا وہ اخبار وہیں پھینک کر گھر کے اندر بھاگی۔ میں ورق سمیٹ کر اندر پہنچا تو وہ مصلے پر کھڑی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر مجھے زور کی ہنسی آگئی۔

"ارے! یہ مولوی صاحب۔۔۔"

اک ملکوتی سی مسکان اس چاند کے ہالے پر تیر گئی۔ میں چنبے کی اس چٹکی سپید کلی کو تکتا رہا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی شاندار کامیابی حاصل کرے گی۔ اب اس پر میڈیکل کالج کے راستے کھلے تھے۔ داخلے کی باری آئی تو مجھے اپنے رفیقِ کار رازی سے کچھ مالی امداد لینی پڑی۔ پھر جب عصمت کو ہوسٹل میں چھوڑ کر واپس لوٹا تو یوں لگا جیسے اس کے دور چلے جانے سے میرا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ اگلے ہی روز مجھے اس کا خط ملا۔ دو سطور کا ادھورا خط سب کچھ کہہ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"کتنے ہی کاغذ میلے کئے پر مجھے خط لکھنا نہیں آیا۔ آپ چلے گئے تو جیا بہت اداس ہو گیا۔ سوچتی ہوں۔۔۔"

اور اس سوچتی ہوں۔۔۔ کے بعد وہ عمرِ خیام کی خوبصورت ' بے پناہ دلنواز رباعی کی طرح بکھر گئی تھی۔ خط کے جواب میں خود پہنچا تو وہ مہکنے لگی۔ واپسی کے لئے جلد لوٹنے کا وعدہ لے کر چھوڑا۔ پھر یہ وعدہ ہر ملاقات کی رسم بن گیا۔ دسمبر کی چھٹیوں میں وہ آئی تو میری بھی استاد بن گئی۔ سفید اوور کوٹ پہنے وہ مجھے دل کی اناٹومی پر لیکچر دینے لگی۔ اِذن' بطن اور پیری کارڈیم سے چلی تو دل کے باریک باریک ریشوں کو چھیڑنے لگی۔ میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ پل بھر رکی تو میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"عصمی! دل میں محبوب کس جگہ رہتا ہے اور درد کس جگہ ہوتا ہے۔۔۔؟؟"

وہ اتنے زور سے ہنسی کہ میں خجل ہو گیا۔ کتنے ہی لمحے اس کی ہنسی نہ رکی تو میں نے اسے چٹیا سے پکڑ لیا۔ تب یکدم ہی چپ ہو کر اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ شرارت سے ناچتی پتلیوں پر شبنم کی ہلکی سی تہہ تیر رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے بندھے ہاتھوں کو دیکھا اور مسکرا کر چھوڑ دیا۔

چھٹیاں یوں چپکے سے ہی گذر گئیں۔ وہ چلی گئی تو پھر اک گھمبیر سی اداسی میری رگ و جان پہ حاوی ہو گئی۔ ان دنوں تنگدستی کی بنا پر میں نے گھر رقم بھیجنی بند کر دی تھی۔ ابا جان کا خط ملا۔ "فوراً" پہنچو۔۔۔" مجھے 'ہز میجسٹی کے ایسے احکامات سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ تھے تو قانون دان لیکن ان کے قانون میں برابری حقوق کی کوئی شق نہ تھی۔ جب جی چاہتا معمولی سی بات پر کورٹ مارشل کر دیتے۔ میں پہنچا تو سوال ہوا۔

"رقم بھیجنی کیوں بند کر دی۔۔۔؟؟"

"بینک میں جمع کر رہا ہوں۔۔۔" میں نے ڈرتے ڈرتے جھوٹ بولا۔ "سوچا تھا اکٹھی رقم بہتر طور کسی کام لائی جا سکتی ہے۔۔۔"

"ہم۔۔۔" وہ فائلوں پر نگاہ دوڑاتے رہے۔ "دسمبر کی چھٹیوں میں کیوں نہیں آئے۔۔؟!"

"تعلیمی وفد آیا ہوا تھا۔۔۔" میں نے فوراً بات بنائی۔ "کالج کو ڈگری کلاسز تک بڑھانے کا منصوبہ تھا لہٰذا پرنسپل کے حکم پر اس میٹنگ میں شرکت کرنی پڑی۔۔۔" انٹرویو ہو گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی قانونی انچ کی زد میں نہیں آیا۔ افتخار نے روکا بھی لیکن میں موقع ملتے ہی لامپی کھسک آیا۔

دن پکھیرو بن گئے۔ کالج میں میری مصروفیات لیکچر دینے اور اپنی ریسرچ تک ہی محدود تھیں۔ راتیں یادوں کے سہارے کٹتی رہیں۔ عصمت کبھی کبھار چھٹیوں میں آ جاتی اور کبھی میں اس سے ملنے چلا جاتا۔ اسی طرح دو برس بیت گئے۔ وہ بہت محنت کر رہی تھی۔ پہلے سال کا امتحان اس نے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ دوسرے سال اس کے نتیجہ کا علم مجھے کراچی میں ہوا۔ میں کالج کی طرف سے سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔ عصمت نے مجھے لکھا تھا۔ اس بار یونیورسٹی بھر میں اول آنے پر اس کا وظیفہ جاری ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ لامپی واپس جاتے ہوئے میں لاہور میں اس کا انعام اسے دے کر جاؤں۔ میرے لئے یہ دہری خوشی تھی۔ حکومت مجھے سائنس کانفرنس میں نمایاں اہمیت کی رپورٹ پیش کرنے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے رہی تھی۔ پھر بھی عصمت کی شاندار کامیابی میری نگاہ میں زیادہ بلند تھی۔ اسے تحفہ دینے کے لئے میں نے اس کی پسند کا سفید فر کوٹ خریدا اور پھر اس اپنے آنے کی اطلاع دیئے بغیر ہی اس کے ہاسٹل جا پہنچا۔ وہ آئی تو مجھے کچھ روئی روئی سی لگی۔ پر جانے کیوں' میں نے کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ اسے مبارکباد دینے کے بعد میں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی خوشخبری سنائی۔ وہ چپ بیٹھی سب سنتی رہی۔ پھر جب اس کا تحفہ دیتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں حیرانی سے اسے تکے گیا۔

"عصمی!۔۔۔" پریشانی میں مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہ ہو سکی۔

"تم۔۔۔تم۔۔۔"

اک پھیکی سی مسکان اس کے لبوں پر آئی اور وہ بڑے تحمل سے بولی۔

"مجھے نہیں چاہئیں یہ تحفے۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" میں اور پریشان ہو گیا۔

وہ دونوں ہتھیلیوں میں میرا چہرہ لے کر چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پھر میرے شانے سے لگ کر بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔

"منگنی ٹوٹ گئی عاصم!۔۔۔"

وہ ہچکیوں میں مجھے سب کچھ بتاتی رہی۔ میری عدم موجودگی میں ابا جان لامپی آئے تھے اور پھر منگنی ٹوٹ گئی۔ اسے صرف اسی قدر علم تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن لامپی پہنچا تو وہاں بھی تلخیاں میری منتظر تھیں۔ ماموں جان نے مجھے بلوا بھیجا۔ میں ندامت سے سر جھکائے پہنچا تو وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ کافی دیر اپنے خیالات کو مجتمع کرتے رہے پھر بولے۔

"عصمت نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہو گا۔۔" انہیں یک بیک کھانسی چھڑ گئی۔

میں الماری کی طرف لپکا تو مجھے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"بیٹھو! شراب میں نے چھوڑ دی ہے۔۔۔"

"چھوڑ دی ہے؟" مجھے بہت اچنبھا ہوا۔

"بیٹی کا باپ ہوں نا!۔ اس کے درد کی لہر میرے سینے میں بھی اتر گئی تھی۔ اسے شراب نہ مٹا سکی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔۔۔۔۔" وہ چند لحظے رکے۔" خوش رنگ پھولوں کو زردی چاٹ گئی ہے۔۔ میں نے عصمت کو سمجھایا تھا کہ حالات بدل گئے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایسی ذہنی وابستگی کس قدر اذیتناک ہوتی ہے۔۔۔ تم دونوں کو ملنے سے نہیں روکنا تو نہیں چاہتا لیکن میں بے بس ہو چکا ہوں۔۔۔"

میرا جی گھٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے جو کہا میں سمجھ گیا۔ وجہ انہوں نے مجھے بھی نہیں بتائی۔ پھر میں نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہاں بھی میری شنوائی نہ ہوئی۔ اباجان کا استدلال تھا۔ "اس کا باپ شراب پیتا ہے۔۔۔"

"انہوں نے چھوڑ دی ہے۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"موسم دیکھ کر جی مچل جائے گا۔۔۔" انہوں نے میری بات کی پرواہ نہ کی۔ "پھر اس کے بھائی آوارہ ہیں۔۔۔"

"لیکن اس میں عصمت کا کیا قصور ہے۔؟؟؟"

"اس کا قصور۔۔۔؟!" انہوں نے بہت خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا۔ "وہ رقم تم بینک میں جمع کرواتے رہے ہونا؟ چھٹیوں میں تعلیمی وفد۔۔۔"

یہاں بھی شنوائی نہ ہوئی تو میں چپ چاپ لامپی چلا آیا۔ وہ میرے لئے بالکل اجڑ گیا تھا۔ وہیں مجھے عصمت کے دو تین خط ملے۔ اس نے مجھ سے ان حالات کے بارے پوچھا تھا۔ دل پر جبر کر کے میں نے اسے سب کچھ لکھ دیا۔ اس کے بعد اس کے خط آنے بھی بند ہو گئے۔

سب کچھ داؤ پر لگا کر میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا۔ میرے دکھ ہی جب میری محرومی کا مداوا بن گئے تو میں نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ میں نے اپنے آپ کو خوردبینوں کے ان عدسوں میں گم کر دیا جن پر میری پلکوں کی مسلسل رگڑ سے خراشیں آگئی تھیں۔ اس محنت کے صلے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مجھے مل چکی تھی۔ حکومت نے مجھے دوسری جگہ پرنسپل کے عہدے کی بھی پیشکش کی۔ لیکن میں نے اسے قبول نہ کیا۔ میرے راستے میں کوئی کہکشاں تو تھی نہیں۔ فقط لامپی کے پتھر تھے جن سے میری بہت ساری یادیں وابستہ تھیں۔ میں انہیں چھوڑ کر کہاں جاتا۔ زندگی انہی پتھروں میں گذرتی رہی۔ میری کنپٹیوں پہ چاندی کی تہہ جمنے لگی اور میں اپنے آپ کو اور زیادہ محو کرتا گیا۔ پھر انہی دنوں ایک حکومتِ افریقہ نے دوسرے ممالک سے کچھ پروفیسر مانگے تو میں نے بھی درخواست دے دی۔ کچھ ماہ بعد اس کی منظوری

آگئی۔ وطن چھوڑنے کے خیال سے یادوں کے دیپ ایک بار بھڑکے اور پھر بجھ گئے۔ میں نے سوچا کون کس کے لئے جیتا ہے؟ سنگلاخ سی یادوں کے سہارے زندگی گذارنی بہت کٹھن ہے۔ انہی تلخیوں کو سوچ کر میں نے پاسپورٹ کی درخواست بھی بھیج دی۔ جس روز پاسپورٹ لے کر لوٹا تو عصمی کا چھوٹا بھائی ظہیر میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"کئی روز سے آرہا ہوں۔ آپا کا خط آیا ہے۔۔۔" اس نے خط مجھے تھما دیا۔ میں نے اس کی تہیں کھولیں۔ ماموں جان کی طرف تھا۔ عصمت نے لکھا تھا کہ اگلے ماہ فائنل امتحان کے بعد وہ گھر آرہی ہے۔ اور کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں نے خط لوٹایا تو وہ بولا۔ "آپا آپ کے گھر بھی گئی تھیں۔ کوئی پندرہ روز رہ کر آئی ہیں۔۔۔"

مجھے اُس بات کی خبر نہ تھی۔ شاید کوئی امید افزا نتیجہ نہ نکلا ہو گا ورنہ عصمت مجھے ضرور لکھتی۔ تبھی اس انجانے خوف کی بنا پر میں ظہیر کو کچھ نہ پوچھ سکا۔ وہ چلا گیا تو ساری رات میرا ذہن سلگتا رہا۔ عصمت لامپی آرہی تھی۔ اس سے دور رہ کر تو یوں جی لیا تھا لیکن اب۔۔۔؟؟

اگلے ہی روز میں نے ملک چھوڑ دینے کی تگ و دو تیز کر دی۔ پھر بھی ہیلتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ لینے میں دس روز بیت ہی گئے۔ چند روز بعد مجھے جہاز کی ٹکٹ مل گئی۔ ٹھیک بارھویں روز مجھے ملک چھوڑ دینا تھا۔ میں نے سوچا۔ "عصمت جب لامپی آئے گی تو اسے پتہ چلے گا میں اس سے کتنا دور جا چکا ہوں۔۔۔"

جس روز جہاز نے اڑان لینی تھی اس سے ایک روز قبل میں نے لامپی کو خیر باد کہہ دیا۔ کالج کے سارے سٹاف نے مجھے الوداع کہی۔ رازی مجھے گلے ملتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"وطنِ عزیز کو ابھی تم ایسے سائنسدانوں کی بہت ضرورت ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ حکومت تمہیں جلد واپس بلا لے۔۔" میں جواباً" فقط مسکرا دیا۔

لامپی کو چھوڑتے ہوئے مجھے بہت سی بیتی باتیں یاد آئیں۔ لپی کی سرگوشیاں کرتی لہریں۔ اس کے کنارے بسنے والا سرخ اینٹوں کا بنگلہ اور مندر کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر گذری ہوئی وہ رات۔ سبھی میری آنکھوں میں چبھتی رہیں پر پتھروں میں رہ کر جانے میرا دل بھی پتھر ہی ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی چیز نہ روک سکی۔ لیکن اگلے روز وہی باتیں ایرپورٹ پر مجھے یاد آئیں تو درد کے سوتے خود ہی پھوٹ بہے۔

جہاز کی اڑان میں کچھ ہی وقت رہ گیا تو مسافروں کو نشستیں سنبھالنے کے لئے کہا گیا۔ سیڑھیوں کے پاس رک کر اک بار میں نے اپنی چاہتوں کو الوداع کہا اور رومال سے آنکھیں خشک کر رہا تھا کہ دور سے ابھرتی صدا سنائی دی۔ "عاصم۔۔۔۔!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایر ہوسٹس کے ہمراہ سفید فرکوٹ پہنے عصمت دوڑتی چلی آرہی تھی۔ خوشی اور درد کی اک ملی جلی لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ وہ ہانپتی ہوئی میرے قریب آگئی۔

"راززی نے مجھے ٹیلیگرام سے اطلاع دے دی تھی۔ پھر میں نے ابی کو بھی بلالیا اور۔۔۔" اس نے ہاتھ سے باہر جنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ ابا جان اور ماموں دونوں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ "ہم آپ کو روکنے آئے ہیں۔ میں آپ کے گھر گئی تھی۔ انہوں نے سب کچھ مان لیا ہے۔۔۔" نگاہیں جھکائے وہ اپنی انگلی میں میری پہنائی منگنی کی انگوٹھی گھمانے لگی۔ "اگر ہم وقت پر نہ پہنچتے تو۔۔۔ تو آپ جارہے تھے نا۔۔۔؟؟!"

"میں جارہا ہوں۔۔۔!" درد کی لہر کو میں نے سینے ہی میں دبالیا۔

"آپ۔۔۔" اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ "آپ۔۔۔ آپ نہیں جائیں گے۔۔۔" وہ میرے شانے سے لگ کر رونے لگی۔

اس لمحے میں نے دور سے سٹاف کو اپنی جانب دوڑتے دیکھا۔ اس نے آتے ہی ایک حکمنامہ مجھے تھمادیا۔ لکھا تھا۔

"بعض وجوہات کی بنا پر' جن کی وضاحت حکومت لازمی نہیں سمجھتی' آپ کا پاسپورٹ منسوخ کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ منسٹری آف ڈیفنس۔!" میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اب رازی کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ پھر بھی میں سٹاف سے بولا۔ " لیکن میں ٹکٹ۔۔۔"

"نہیں۔۔!" یک بیک عصمت پھوٹ پڑی۔ اس پر وحشت طاری تھی۔ وہ مجھے گریبان سے پکڑ کر طیارے سے ایک طرف کھینچ لے گئی۔ "آپ۔۔۔" اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔ "نہیں جائیں گے۔ کہہ دیجئے نا!۔۔ سچی آپ بن۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔۔۔" وہ میرے قدموں میں جھکنے لگی۔

میں نے طیارے کی جانب دیکھا۔ سیڑھی کب کی ہٹ چکی تھی اور اب وہ موڑ کاٹ رہا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے میں نے عصمت کو دیکھا۔ میرا سارا پیار میرے لبوں میں سمٹ آیا۔ اور میں نے شانوں سے تھام کر اسے اٹھالیا۔

"عصمی!۔۔۔" میں نے جی جان سے اسے پکارا۔ اور پھر ساری کائنات کے سامنے جھک کر اس کی پیشانی پر اپنی محبت کی پہلی مہر ثبت کر دی۔

"کٹھور۔۔!!" وہ چٹکی۔

عمرِ خیام کی رباعی' چنبے کی کلی کی مانند بڑے دلکش انداز میں کِھل اٹھی تھی۔

)()()(
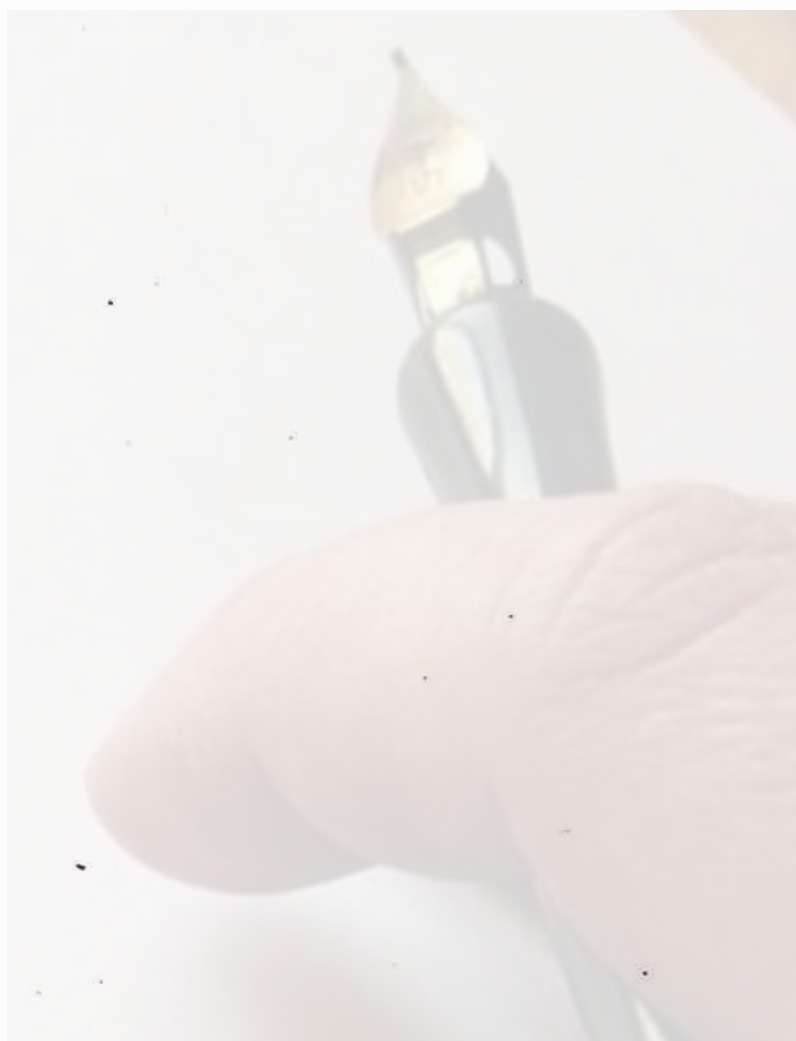
اس داستان کو حقیقت میں ڈھلتے آٹھ برس بیت گئے۔ کاتبِ تقدیر نے وقت کو موڑا اور پھر سچ مچ اُس لڑکی سے میرا جیون ملن ہو گیا۔

ساری زندگی وہ بار بار مجھے کہتی رہی۔ ''ایک بار پھر مجھ پر کوئی کتاب لکھونا۔۔۔'' لیکن انسانی سرشت میں ہے کہ جسے پالیا اس کی قدر نہیں رہتی۔ میں ہنس کر اسے ٹال دیتا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ساتھ چلتے ایک روز وہ میرا ہاتھ چھوڑ دے گی تو میں اسے بہت یاد کرتے اس کی آرزو پوری کروں گا۔ ''وزیر آباد کی گوگی'' اسی کی کے گرد بکھرے لمحوں کی داستان ہے۔ اسے کینسر تشخیص ہوا اور ہم اس مرض کے آدابِ سفارت سے نابلد تھے۔ بے شمار غلطیاں ہوئیں۔ گھر کے اندر کوتاہ بین تھے تو اس چار دیواری کے باہر دانش مند رشتہ داروں نے بھی اپنی بلاؤں کا منہ اسی کی طرف موڑ دیا۔ ساری کہانیوں کو سمیٹ کر وہ چلی گئی۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کے کسی پیارے کو ایسا اذیت ناک مرض ہو۔ بس جی جان سے اس کا خیال رکھیئے گا۔ ورنہ یہ بت ٹوٹتے ہیں تو اپنے پیچھے کراہتی یادیں اور خس و خاشاک لمحے ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ کہانی صرف اس لئے لکھی گئی کہ آپ لرزتی ٹمٹماتی لو کے پسِ منظر میں ان دیکھی موہوم سی تحریروں کو پڑھیں اور درد کی بجائے چاہتوں کی خوشبو میں اسے رخصت کر سکیں۔

گوگی آپ کی منتظر ہے اس سے مل لیجئے۔

کینسر سے پہلے

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
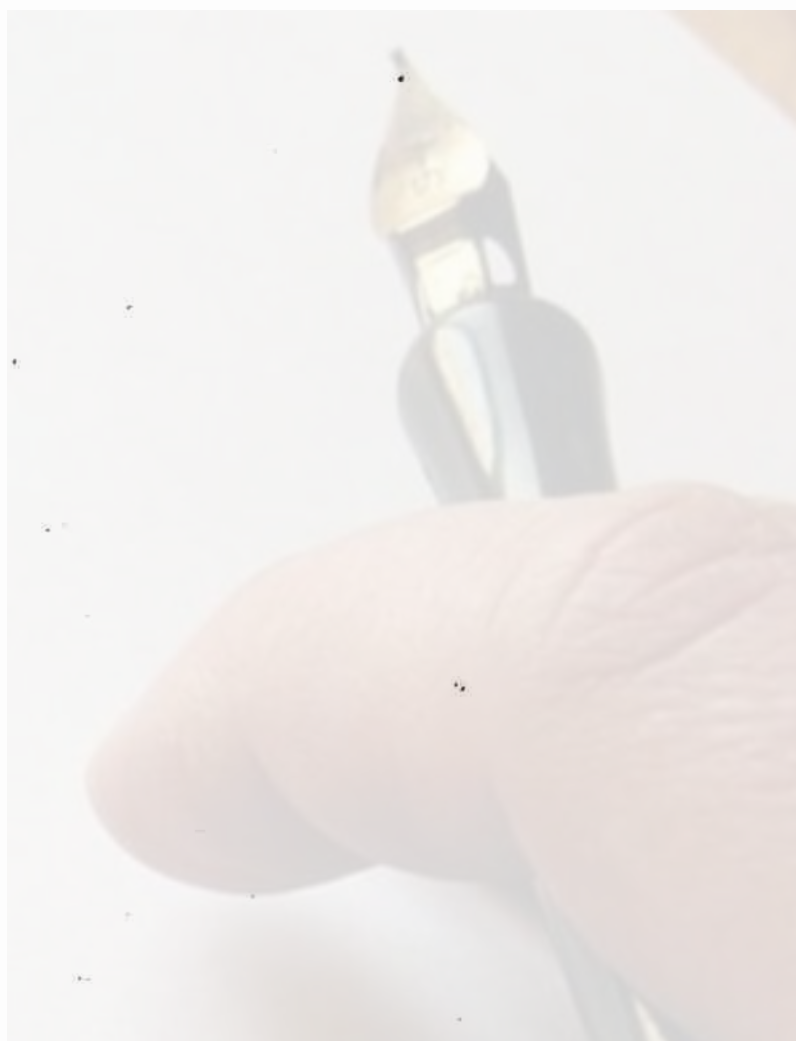
وزیر آباد کی گوگی

وزیر آباد کی گوگی 23مارچ 1947 کی سحر سمبڑیال میں پیدا ہوئی۔ کہتے ہیں کہ صبح اس کے ابا 'شاہ جی' تیار ہو کر معمول کے مطابق اپنی روڈ انسپکٹری کی ڈیوٹی پر جانے لگے تو دائی نے کپڑے میں لپٹی نومولود بچی کے کان میں آذان اور منہ میں شہد کی گڑھتی دینے کے لئے انہیں آن روکا۔ دو بیویوں کے مجازی خدا شاہ جی کو پہلی بیوی سے چار بیٹیاں اور تین بیٹے دے چکی تھیں دوسری بیوی کی لگن بھی کچھ ایسی ہی تھی اور وہ ان سب کے کانوں میں آذانیں دیتے کچھ تھکن محسوس کر رہے تھے کہ اب یہ نئی مہمان بلائے جان آ گئی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر دائی کا منہ بند کیا اور حکم جاری کرنے والے تھے کہ اس فریضے کے لئے پڑوس کی مسجد سے ملا جی کو بلا لے لیکن تبھی ان کا معتمد بیلدار نورا ہانپتا ہوا آ پہنچا اور اس نے سرکار کا پرچہ انہیں تھما دیا۔ شاہ جی نے اسے کھولا' پڑھا۔ اور پھر چہک کر سارے گھر میں باآواز بلند یہ خوشخبری نشر کر دی کہ ان کی تنخواہ اب پندرہ روپے سے تیس روپے ماہانہ ہو گئی ہے۔ یعنی دوگنی تنخواہ۔ ایسا تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آنکھوں میں تشکر کی دھند پھیلی تو بلا سوچے سمجھے' آپ ہی آپ ان کے ہاتھ اور بازو بچی کی جانب پھیل گئے۔ دائی نے خاموشی سے ان کی امانت انہیں سونپ دی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ بچی نے ان کی بانہوں میں آتے ہی ایک لحظے کے لئے اپنی مندی ہوئی آنکھیں کھولیں' اس آغوش کو پہچانا اور ہلکی سی ایک مسکان کے ساتھ واپس اپنے خوابوں میں کھو گئی۔ اور حالانکہ شاہ جی کو روحانیت کے ساتھ دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا لیکن انہیں محسوس ہوا کہ بچی کی اس ایک نگاہ نے ان کی روح کو چھو لیا تھا۔ پہلے بے چینی سے انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ہر کسی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ارے بھئی کسی نے اس کا کوئی نام بھی رکھا ہے یا نہیں؟" انہوں نے ہر کسی کا چہرہ دیکھا۔ "کیا نام رکھا ہے اس کا۔۔۔؟"

'ہا خائے۔۔۔!" دائی نے گرد کھڑے گھر کے بڑے اور بچوں کا بھی خیال نہ کیا۔ اپنے گال پہ انگلی ٹکا کر حیرت سے بولی۔ " آج صبح صبح کہیں چڑھ تو نہیں گئی شاہ جی! ابھی چار گھنٹے پہلے تو وہ پیدا ہوئی ہے۔ نام تو ہمیشہ آپ ہی رکھتے ہیں۔ اب تک سوچا نہیں تھا کیا۔۔۔؟"

شاہ جی اس بے لگام پشتینی دائی کے زیادہ منہ نہیں لگتے تھے کہ اس طرح یہ چھوٹے لوگ منہ چھٹ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جیب سے ایک روپے کا چھچماتا سکہ نکال کر فرش پہ پھینکا اور بولے۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔۔۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی" تم بس اپنے انعام سے غرض رکھا کرو۔۔۔"

اور اس کے بعد دائی واقعی چپ ہو گئی۔ بھلے ہی ان کے آگے جھک کر زمین سے روپیہ اٹھانا پڑا لیکن تنخواہ بڑھنے کی خبر سن کر اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب کی بار وہ اس سے کم پر نہ مانے گی۔ یہ مراد پوری ہو گئی تو کیا اس کی مت ماری تھی کہ وہ جملے پھینکتی؟ شاہ جی ویسے بھی بہت جلالی تھے۔ سارے گھر کا خون خشک رہتا تھا اور بچوں کا تو کھڑے کھڑے پاجامہ گیلا کر دیتے تھے۔ کیا خبر سزا کے طور پر انعام آدھا یا بالکل ہی ضبط کر لیتے تو وہ ان کا کیا بگاڑ لیتی؟ خوامخواہ اپنے ہی پیٹ سے کوئی دشمنی کیوں لگائے؟

اتنے میں شاہ جی نے صحن میں کرسی ڈلوالی تھی۔ پھر اس پر براجمان ہو کر ایک پرانا اردو اخبار ڈھونڈ نکلوایا' اس کا بھونپو بنایا اور اپنی بھاری بھرکم آواز میں' پورے اسلام میں ڈوبی لتھڑی آذان کے علاوہ چاروں کلمے بھی اس کے کان میں انڈیل دیئے۔ فارغ ہوئے تو کتنے ہی لمحے وہ غور سے بچی کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

"بالکل شہزادی ہے۔ میری پاکیزہ شہزادی۔ اور اس کا نام وہ ہو گا جو بہت بڑے اور مشہور لوگوں کا ہوتا ہے۔ عصمت۔۔۔" ان کی مراد عصمت انونو اور عصمت چغتائی سے تھی جن کے نام انہوں نے کئی باز اخباروں میں پڑھے تھے۔ یکلخت انہیں اپنا سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا محسوس ہوا اور وہ لمبا سانس لے کر بولے۔ "اور اس کے آنے پر میری تنخواہ ڈبل ہو گئی ہے اس لئے میری اس چھوٹی سی شہزادی کا پورا نام ہو گا۔۔۔ "عصمت شہزادی"

"لیکن پیار سے ہم اسے "گوگی" کہا کریں گے۔" ان کا بڑا بیٹا ریاض حسین کچھ جذباتی ہو کر ان کے دبدبے سے باہر ہو گیا اور دخل دے بیٹھا۔ "ہمارا ٹیچر کہتا ہے روٹی کو گوگی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ ہمارے لئے ڈھیر ساری روٹی لائی ہے اس لئے گوگی ہو گئی۔۔"

عجیب بات ہے کہ شاہ جی نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور غصہ کی بجائے اس پر فخر محسوس ہوا۔ مسیں بھیگ آئی تھیں اور سکول جا کر بچہ کافی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اب نویں جماعت میں تھا۔ انہوں نے اسے پاس بلایا۔ جیب سے چند سکے نکال کر اسے دیئے اور کہا۔

"باقی سب بچوں میں بھی ٹکا ٹکا بانٹ دو۔ یہ میری عصمت شہزادی کا صدقہ ہے۔۔۔" ان کی شریعت۔۔ اول خویش بعد درویش تھی اور اس نذر نیاز کے سب سے اول مستحق ان کے اپنے ہی بچے تھے۔ "اور ہاں باقی سب لوگ بھی سن لو۔۔۔" وہ باآواز بلند بولے۔ "میری جتنی تنخواہ بڑھی ہے اتنی سے تم سب عصمت شہزادی کا عقیقہ اور اپنا جشن منا سکتے ہو۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔۔۔"

خوشی کی لہر آنگن سے خوشبو کی طرح گھر کے سارے کمروں میں بھی پھیل گئی۔ بڑی بیوی نے بچی کو آذان کے لئے بھیجنے سے پہلے بی بی پاک کی منت مانی تھی کہ اس کی نذر قبول ہو جائے۔

اب یہ معجزہ ہو گیا تو اس کے درد اور ٹیسوں سے بکھرے بدن نے سکون سے ایسی انگڑائی لی کہ سارے تار خود ہی کس بل کر بام پر آ گئے۔ چھوٹی بیوی نے بڑی کی نظر اتاری' بلائیں لیں۔ دل ہی دل اس نے بھی بی بی پاک کی منت مان لی کہ دو ماہ بعد اس کا پیدا ہونے والا بچہ بھی کوئی ایسا ہی نصیبوں والا شہزادہ یا شہزادی ہو' اور وہ بھی ایک بار ایسی ہی بھرپور انگڑائی لے سکے۔ پھر اپنے ہی خوابوں میں کھوئی وہ چارپائی پہ بیٹھ کر بڑی کی ٹانگیں دبانے لگی۔

ادھر باہر سب بچے پیسوں میں سے اپنا اپنا حصہ لینے کے لئے بڑے بھیا ریاض حسین کو بیرونی دروازے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ لیکن اس کے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے کہ اسے شاہ جی سے ایک سوال پوچھنا تھا۔ خوف تو تھا لیکن یہ موقعہ اسے اپنا تجویز کیا ہوا نام خاموشی سے قبول کر لینے پر ملا تھا اور اسے وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی اندرونی کشمکش پہ قابو پا کر وہ بولا۔

"ابا! آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے؟" اس نے اپنا سر کھجا کر ان کی اجازت کا انتظار کیا لیکن شاہ جی نے جیسے اس کی بات ان سنی کر دی تو وہ سٹپٹا کر خود ہی بول پڑا۔ "اتنا پیار آپ نے کبھی مجھ سے تو نہیں کیا۔ مجھے تو اس طرح کبھی گود نہیں اٹھایا تھا۔۔۔"

جواب پانے میں وہ ذرہ بھر بھی غافل ہوتا تو ماں کی بڑی سی گالی کے ساتھ پیشاوری چپل اس کا سر چوم گئی ہوتی۔ بچی کے اوپر جھکے جھکے شاہ جی نے اپنا گولا اٹھایا اور دیکھے بنا آواز کی سمت داغ دیا۔

"کتے کے۔۔۔" شاہ جی نے اپنے آپ کو بھی گالی میں لپیٹ لیا۔" تیری یہ ہمت کہ تو باپ پر اعتراض کرے؟ میں نے تو تیری ماؤں کو ایسا سیدھا کر دیا ہوا ہے کہ وہ ایک دوسری کو لوریاں دیتی اور تھپک تھپک سلاتی ہیں۔۔۔"

لیکن ریاض حسین نے یہ سب نہیں سنا۔ وہ تو پیشاوری چپل کو غچہ دے کر' غصے سے گھر کے پیچھے پیپل کے پیڑ کو پتھر مار رہا تھا۔

" آپ نے مجھے جوتا مارا ہے۔ مجھے۔۔۔" وہ غصے سے ابل رہا تھا۔ " اب دیکھنا ابا! آپ سے بدلہ کیسا لیتا ہوں۔ اگر میں نے آپ کا یہ نام عصمت شہزادی چلنے دیا تو۔۔۔ آپ خود بھی اسے گوگی کہہ کر نہ بلائیں تو کہنا۔ میرا نام بھی ریاض حسین ہے۔ اور میں نویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔۔۔"

اور یوں باپ بیٹے میں ٹھن گئی۔ شاہ جی بڑے شہ زور اور بڑے کایاں تھے۔ ہفتے میں ایک بار پھجے پہلوان کے اکھاڑے میں کسرت کرتے تھے۔ پھجے نے اپنی قصائی کی دوکان سے دیسی دنبے کھلا کھلا کر انہیں رستم وزیر آباد بنا دیا تھا اور وہ بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیتے تھے۔ گجرات سے گوجرانوالہ تک' شیر شاہ سوری روڈ (اب جی ٹی روڈ) مع پل چناب اور پلکھو ریسٹ ہاؤس ان کی عملداری میں تھا انگریز افسروں کی خاطر داری کرتے وہ خود بھی کبھی دو گھونٹ لگا لیا کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ ایک بار انہوں نے طیش میں آ کر اپنے ایک بگڑے ہوئے ہندو ایکسین کو تھپڑ مار دیا۔ انگریز ایسے کارندوں کو پسند کرتا تھا جو ان کا کنٹرول قائم رکھنے میں معاون ثابت ہو۔ چنانچہ خود انہوں نے ہی سارا قصور بوتل کے جن پر ڈال دیا اور کیس ختم۔ عشق وشق میں شاہ جی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیویاں دو تھیں تو صرف اس لئے کہ بچوں کے رونق میلے کے لئے عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑی بیوی ماں باپ کی پسند تھی اور دوسری وہ جو شاہ جی کی قمیض پیچھے سے تھام کر جھولتی چلی آئی تھی۔ البتہ ان میں مشترک بات یہ تھی کہ دونوں چٹی ان پڑھ اور معمولی صورت تھیں چنانچہ شاہ جی نے ایک بار حکم دے دیا کہ دونوں نے پیار محبت اور امن سے مل جل کر رہنا ہے تو چپ چاپ انہوں نے ایک دوسری کے دکھ درد کی سانجھ اپنا وطیرہ بنا لی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن اب اپنے ایسے ہی زعم میں ریاض حسین سے ٹکر لے کر وہ بہت بڑی غلطی کر بیٹھے تھے۔ اس نے سارے بچوں

کو "گوگی" نام کا پاٹھ پڑھا دیا تھا۔ اب شاہ جی ایک بار عصمت شہزادی کو پکارتے تو بچے تین تال میں "گوگی گوگی گوگی" نام کا الاپ شروع کر دیتے۔ شاہ جی جلد ہی سمجھ تو گئے لیکن مقابلہ جاری رکھا۔ دنوں کا چلن بدلا' موسم تبدیل ہوئے۔ گھر میں کسی ایک نے شاہ جی کا ساتھ نہ دیا. ایک روز کسی سرکاری دورے سے تھکے ماندے گھر لوٹے۔ صحن ہی میں کرسی ڈلوا لی۔ کسی پیر فقیر سے گڑیا کے لئے دھاگے کی ایک "گانی" دم کروا کے لائے تھے۔ کافی دیر کنکھیوں سے جھانکتے اس کا انتظار کرتے رہے۔ کوئی اسے اٹھائے نہیں آیا تو بالآخر اپنی طرح داری کا خول بالائے طاق رکھ کر انہوں نے ہار مان ہی لی۔ "اوئے کوئی ہے۔۔۔" ان کی باخبر ' باملاحظہ ' ہوشیار کرنے والی آواز لگی۔

"ذرا" گوگی" کو تو لے کر آؤ میرے پاس۔۔"

برصغیر کی کانٹ چھانٹ کا تذکرہ تو ہر پنڈال میں چل رہا تھا لیکن یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اس کا کسی کو اندازہ بھی نہ تھا۔ صدیوں کے بنے محبت کے رشتے بھی انگشت بدنداں تھے کہ کو لکتہ سے چلی چنگاری نے اچانک ہی سارے ماحول میں آگ لگا دی۔ جابجا بے موسم کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ انسانوں کا ہانکا شروع ہو گیا۔ ٹرینوں مین کٹی ہوئی لاشیں ادھر سے ادھر سفر کرنے لگیں۔ زمین کا سینہ درد کی شدت سے اتنا سمٹا کہ خون کی بو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ کراہوں اور سسکیوں نے احساس کو زخمی کر دیا لیکن شاہ جی اپنی ہی فکروں میں گم تھے۔ انہیں اپنی ہی عملداری میں ریسٹ ہاؤس کے آگے 'پلکھو' کنارے ایک ٹیلے پر بنا مندر اور اس کے ساتھ بنا پنڈت' پروہت کا گھر بے حد پسند تھا۔ بائیں ندیا اور آگے دگنے رقبے پہ پھیلا باغ۔ انہیں پتہ تھا کہ وزیر آباد انہی کی بادشاہت میں رہے گا اس لئے اس مندر سے دل لگا بیٹھے۔ ادھر پنڈت جی کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ انگریز کی مت ماری گئی تھی جو داسیوں سے بسا ان کا " راجہ اندر دربار " اجاڑنے کے درپے ہو گئے تھے۔ کمبختوں پر بنگال کا جادو ٹونا' ٹوٹکا کچھ بھی تو کام نہیں کرتا۔ چنانچہ مجبوراً" انہوں

نے علاقے کے بادشاہ۔ شاہ جی سے سمجھوتا کر لیا کہ بحفاظت انہیں سرحد کی دوسری طرف سمگل کر دیں تو وہ اپنے ہاتھوں انہیں گھر اور مندر کا قبضہ دے کر جائیں گے۔ شاہ جی کے سارے بیلدار' ان کے ساتھ مل کر کام کرنے والے مزدور اور پھر پھجے پہلوان سمیت اکھاڑے کے سارے پہلوان اور قصائی انسان دوستی ثابت کرنے کے لئے حرکت میں آگئے اور یوں شاید پورے پاک وہند میں پہلی پرامن دہری ہجرت عمل میں آگئی۔ شاہ جی سمبڑیال سے مہاجر بنے اور وزیر آباد مندر کے نئے پروہت ہو گئے۔ مندر کے نام وقف باغ' ندیا پلکھو کا کنارا اور پیچھے ریسٹ ہاؤس تک ملحقہ کھلا علاقہ سب ان کی ریاست ہو گئی۔ پرانے پنڈت جی کسی نئی جگہ اپنی دوکان چمکانے سرحد سے پار ہو گئے۔ پتہ نہیں انہوں نے وہاں " راجہ اندر" کا کوئی نیا اکھاڑہ بسایا یا نہیں لیکن شاہ جی دل سے راجاؤں کے راجہ تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ اتنا بڑا رقبہ زیادہ دیر ان کی دسترس میں نہیں رہے گا اس لئے بھارت سے جو کوئی بھی لٹا پٹا' اجڑا خاندان ان کے پاس آیا انہوں نے اسے مندر کے پچھواڑے گھر بنانے کا پروانہ دے دیا۔ انگریز نے جلیانوالہ باغ میں بارود سے آزادی کا نعرہ لگانے والی زبانوں کو خاموش کر دیا۔ تب ان کے راج پاٹ کی بقا کا معاملہ تھا۔ ابخود ہجرت کا وقت آیا اور جان پہ بنائی۔ تو آزادی کا پروانہ ہندو' مسلمان کو تھما کر خود گھر میں بند ہو گیا کہ لو مارو اور مرو۔ ادھر نوزائیدہ مملکت خداداد پاکستان ابھی پالنے میں تھی۔ اس لئے بسانے اور بسنے والوں کو روکتا کون ؟ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ریسٹ ہاؤس کے ماتھے پر سینکڑوں احسان مند لوگوں کی مہاجر کالونی وجود میں آگئی۔ ادھر گھر میں اپنے اعتماد والے بیلداروں سے شاہ جی نے گھر کے رہائشی حصے اور تہہ خانے میں جگہ جگہ فرش اکھڑوا دیئے کہ شاید دبایا ہوا کوئی خزانہ مل جائے لیکن پنڈت جی سچے برہمن تھے۔ زمین کے پرت بھی چاٹ لے گئے' ملتا کیا؟ ہاں البتہ اس تلاش میں بیلداروں نے اونچی نیچی اینٹیں لگا کر پورے گھر کے فرش تہہ و بالا کر ڈالے۔ اور ساتھ ہی

مندر کا ایک حصہ بھی منہدم کر ڈالا۔ بالآخر تھک ہار کر شاہ جی نے سوچا۔ جو کچھ مل گیا ہے اسی پر صبر شکر کرو اور یوں زندگی پھر سے اپنی ڈگر پہ چل نکلی۔

اس گھر کے آنگن میں دونوں بیگمات نے اپنے اپنے رنگا رنگ شاہکار سجا دیئے۔ بڑی بیگم کے سات بچے حیات رہے۔ پہلی بڑی بیٹی ثریا' جسے شاہ جی ہمیشہ ' سریا' کہہ کر بلاتے تھے۔ دوسرا ریاض حسین۔ تیسری پھٹے ڈھول کی طرح سارا دن رونے والی مسعودہ۔ چوتھا اس کا بھائی شبیر شاہ جس کا رنگ اتنا کالا تھا کہ سب اسے دیکھتے مگر وہ انہیں نظر نہ آتا۔ گھر والوں کی ایسی بے حسی دیکھ کر ایک دن مہترانی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔ پھر قینچی سے بھی زیادہ بے لگام زبان چلانے والی مقبول بی بی۔ ارد گرد کے لوگ کہتے تھے اس کی زبان پہ سانپ بیٹھا ہے۔ اس کے بعد عصمت شہزادی آئی جسے گھر والوں نے آدھی آدھی رات چاندنی سے اشارے اور باتیں کرتے دیکھا' سنا اور خوفزدہ ہو گئے۔ توتلی زبان میں اس نے بتایا کہ سفید پروں والے روشنی سے گندھے اس کے کچھ ساتھی اس کے پاس آتے ہیں اور وہ سب مل کر کھیلتے ہیں۔ لیکن چھوٹی ماں نے مندروں میں کالے چہرے اور لال زبان والی ڈائن کو دیکھ رکھا تھا اس نے شور مچا دیا کہ بچی پر مندر کی کسی دیوی دیوتا کا سایہ پڑ گیا ہے۔ شاہ جی کچھ دیر تو خاموشی سے اس کی اول فول سنتے رہے پھر انہوں نے اپنی پیشاوری چپل اتار کر ہاتھ میں لے لی اور اسی سے سایے کا اتہ پتہ پوچھا۔ وہ کیا بتاتی؟ بات تو صرف منہ کی تھی اب جان پہ آن بنی تو چھوٹی بیوی کو "نہ' نہ" ورد کرتی' سر جھٹکتی اپنے کمرے میں چلے جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔ شاہِ جنات سے تو وہی ٹاکرہ لے جس کی شامت آئی ہو۔ ایسے لمحوں شاہ جی کو بھی ہلاکو خان کی طرح زندگی کا مزا آ جاتا تھا جب بیوی اپنی جرح بھول اختلاجی کیفیت میں پسپائی اختیار کرتی تھی۔ یہ ہوئی نا 'مردانگی'!!۔ وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔

"جو دیوی دیوتا اپنے مندر کو چھوڑ کر بھاگ گئے وہ ان کی " گوگی شہزادی " کے
سایے کو بھی چھو کر دیکھیں تو جل جائیں گے۔ عصمت یعنی پاکیزگی نام ہے اس
کا۔ پاگل' ان پڑھ لوگو! حوروں' پریوں کے ساتھ کھیلتی ہے یہ۔ "

بڑی بیگم کا آخری شہ پارہ افتخار کو بگاڑا ہوا' کھارا' یا 'کھارے شاہ' تھا۔ اور ہر کسی کا' کھا' کر بھی اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرا۔ دوسری بیگم نے صرف تین بچوں سے اس گھر کی رونق بڑھائی۔ پہلے نمبر پر وہ' نصیبوں والا شہزادہ' منظور شاہ عرف 'جھورا' تھا جس کے لئے انہوں نے بی بی پاک کی منت مانی تھی۔ بڑا ہو کر وہ ریلوے پولیس میں ملازم ہوا۔ سب سے پہلے اس نے گالیوں کی ڈکشنری ازبر کی اور ان میں اپنی نت نئی اختراعات کی وجہ سے ہر جگہ مشہور ہوا۔ بڑے بڑے افسران کے کام کرتا تھا چنانچہ کراچی سے پشاور تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ شاہ جی کی طرح قدرتی طور پر اس کا رعب دبدبہ تھا۔ لمحوں منٹوں میں کسی کا بھی دل جیت لیتا۔ ایک ہی نگاہ میں آدمی کا وزن جان لیتا تھا لہٰذا ٹرین کے بھکاریوں سے بھی پتی وصول کر لیتا تھا۔ انسان دوست بھی تھا۔ اپنے آخری دور میں شاہ جی اس کی لاپرواہیاں اور لاابالی پن دیکھ کر ہمیشہ پریشان رہے لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے بیٹوں میں سے وہی ایک باقی رشتہ داروں کے لئے خضر راہ ثابت ہوا اور ان کی مشکلات میں پھنسی کشتیاں پار لگواتا رہا۔ باغ و بہار آدمی تھا وہ۔ اس کے بعد دوسری بیگم نے شاہ جی کو دو بیٹیاں بعنوان 'خالدہ' اور ایک چلتی پھرتی جلوس 'زاہدہ' دیں۔ شاید" تبھی پاکستان کی پہلی مردم شماری ہوئی ہو گی اور اقوامِ متحدہ نے بلحاظ آبادی اسے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک مان لیا ہو گا تو شاہ جی نے بھی نفری بڑھانے کا مسلک ترک کر دیا۔

تعلیم کا اس گھر میں زیادہ رواج نہ تھا۔ کم از کم لڑکیوں کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔ انہیں بس روٹی بیلنا آ گیا یہی غنیمت تھی۔ مندر کے تھڑے پہ لگے برگد کی شاخوں سے جوانی کب سے اس گھر کے آنگن میں بھی اتر آئی تھی۔ سب سے بڑی گوری چٹی بیٹی ثریا بی بی صبح

سویرے ٹھنڈے پانی سے نہاتی۔ پھر آئینے کے سامنے کنگھی پٹی کرتی کھلی آنکھوں رنگین خواب دیکھتی۔ یوں دوپہر اور اس کے بعد شام ہو جاتی تو برگد کے قریب نصب تنور میں دو ٹبروں کے علاوہ آئے گئے کی روٹیاں لگاتے اسے اتنا سینک لگتا کہ رات کو پھر ٹھنڈے پانی سے نہائے بغیر اسے نیند نہ آتی۔ مسعودہ اور مقبول دونوں' ثریا بی بی کو دیکھ دیکھ سجنے بننے کا سبق سیکھ رہی تھیں۔ شاہ جی زنانے میں صرف عید کے چاند کی طرح نمودار ہوتے تھے اس لئے انہیں کبھی ان جغرافیائی تبدیلیوں کی خبر نہ ہوئی۔ بیویوں کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی چنانچہ وہ خود ہی ان کے کمرے میں حاضر ہو جاتیں۔ انہیں تو شاید یہ بھی پتہ نہ تھا کہ ریاض حسین نے کب میٹرک کی سند لی اور کب 'رسول' میں پڑھ کر ڈرافٹسمین بھی بن گیا۔ البتہ یہ وقت آنے پر شاہ جی نے بہت آسانی سے اسے بھی روڈ انسپکٹر لگوا دیا۔ اگلی باری تھی مہترانی کے لے پالک بیٹے شبیر شاہ کی۔ وہ بستہ بغل میں لئے گھر سے تو نکل جاتا لیکن آس پاس کنچے بنٹے کھیل کر چھٹی کے وقت پر گھر آ جاتا۔ شاہ جی کی سوچ نرالی تھی کہ اللہ نے نصیب میں لکھا ہو تو ان پڑھوں کو بھی بے حساب رزق دے دیتا ہے۔ اس لئے "وہ کیوں اپنے سر پہ ایک اور بوجھ ڈال لیں۔۔" اس وطیرے کے سبب شاید ان کی عصمت شہزادی بھی تعلیم سے نابلد رہ جاتی لیکن پھر ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ یہ غالباً" آواخر 1954 کی کسی اجلی صبح کی بات ہے۔ وہ اپنی روڈ انسپکٹری کے لئے تیار ہو کر صحن میں نکلے تھے کہ اک بے پناہ خوش الحان قرأت نے ان کے قدم جکڑ لئے۔ انہیں شک تو گذرا لیکن اس پر یقین نہ آیا۔ اس آواز کو جاننے کے اضطرب نے انہیں زنانے میں کھینچ لیا۔ اور پھر جو کچھ انہوں نے دیکھا اس پہ وہ مبہوت رہ گئے۔ ان کی عصمت شہزادی سامنے رحل پہ سیپارہ بچھائے' تخت پوش پہ جھول جھول سورہ نسأ کی تلاوت کر رہی تھی۔ انہوں نے تو اس کے لئے کسی قاری کا بندوبست کیا تھا نہ ابھی تک اسے سکول میں ڈالا تھا۔ پھر کہاں سے پڑھ کر آئی تھی وہ؟ آواز اس قدر رسیلی اور پر تاثیر تھی کہ شاہ جی وجد میں آ گئے۔ اپنی سفید کلف لگی طرے دار پگڑی اتار کر بیٹھنے کی جگہ دیکھی۔

کوئی کرسی نہ تھی۔ بستر پہ بیٹھتے تو کلام اللہ سے اونچے ہو جاتے۔ اپنی شہزادی کے پاس بیٹھنے سے اس کا انہماک ٹوٹ جاتا۔ چنانچہ پگڑی بستر پہ ڈالی اور فرش پہ بچھی چٹائی پر دوزانو ہو گئے۔ وہ اپنے آپے میں نہ تھی۔ جانے کون سی دنیا میں تھی کہ ایک بار بھی اس نے نگاہ اٹھا کر انہیں نہیں دیکھا۔ وہ بس چپ چاپ یک ٹک اسے دیکھتے رہے۔ اس کے چہرے پہ انہیں روشنی کا ویسا ہی ہالہ نظر آرہا تھا جیسا وہ تصویروں میں حضرت عیسیٰؑ یا حضرت بی بی مریم کے سر کے پیچھے دیکھا کرتے تھے۔ پتہ نہیں کلام پاک' یا اس ہالے کے احترام میں خود بخود ہی ان کا سر جھک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اپنی منزل پہ شہزادی نے سیپارہ بند کیا اور آنکھیں بند کئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی کہ شاہ جی نے اٹھ کر فرطِ جذبات سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آج تم نے اس مندر کو مسلمان کر دیا ہے اور مجھ گنہگار کو بھی عاقبت سنوارنے کا موقع دے دیا ہے۔۔" ان کی آواز نجانے کس بوجھ سے رندھی ہوئی تھی۔

"چلو۔ تیار ہو جاؤ۔ آج سے تم سکول میں پڑھو گی۔۔۔"

اور یوں عصمت شہزادی کا نام سکول کے رجسٹر میں درج ہو گیا۔ بیلدار سائیں جی کی ڈیوٹی لگ گئی کہ گوگی بی بی کا بستہ اٹھا کر روزانہ اسے ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف شہر میں سکول چھوڑنا اور دوپہر گھر لانا ہے۔ اس پہلے روز شاہ جی انہیں سکول کے دروازے پر ہی بٹھا آئے۔ خود بازار میں بشیرے حلوائی کی دوکان پر گئے' مٹھائی کی دو ٹوکریاں بنوائیں۔ راستے میں حمید کلاتھ مرچنٹ سے دو زنانہ سوٹ خریدے اور تانگے پہ اپنی بسائی مہاجر بستی میں خالہ پٹھانی کے دروازے پہ آن اترے۔ گجرات سے گوجرانوالہ اور ادھر سیالکوٹ تک ان کی سخاوت کا چرچا تھا۔ اب انہیں پتہ چل گیا تھا کہ ان کی شہزادی کو درس قرآن اور تعلیم اسی نیک خاتون نے دی تھی تو ان کی وضع داری اس احسان کا بوجھ کیسے لیتی؟ چنانچہ ایک ٹوکری مع دونوں سوٹ خالہ پٹھانی کو دیئے اور دوسری ٹوکری اسی دروازے پر بچوں میں بانٹ دی۔ مٹھاس میں ڈوبی

ان ننھی منی زبانوں نے چند منٹوں میں مہاجر بستی ہی نہیں' پوری ریلوے کالونی میں یہ خوشبو پھیلا دی کہ گوگی بی بی سکول میں داخل ہو گئی ہے۔

دوپہر کے بعد وہ سائیں جی کے ساتھ لوٹی تو باہر بچوں کا اور دروازے کے اندر گھر والوں کا ہجوم تھا۔ لیکن اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک ٹیچر نے کپڑے سے اس کے ہونٹ اور گال اچھی طرح رگڑے تھے کہ اس نے لپ اسٹک اور سرخی لگا رکھی ہے۔ ایسا کوئی ثبوت تو نہیں ملا لیکن اب اس کا چہرہ بری طرح جل رہا تھا۔ شاہ جی اس روز گھر پر ہی تھے۔ انہیں غصہ آگیا۔ اور ایسے میں اگلے روز کا انتظار کرنا ان کر سرشت میں نہ تھا۔ اس وقت سکول بے شک بند ہو چکا تھا لیکن انہوں نے تانگہ کروایا اور اپنی شہزادی کو ہیڈ مسٹرس کے گھر لے گئے۔

"اسے۔۔۔ اسے سرخی پاؤڈر کی ضرورت ہے کیا؟" انہوں نے بہت غصے سے پوچھا۔" خدا نے اسے بنایا ہی ایسا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور۔۔۔؟ رنگ دار شربت پیتی ہے تو اس کے گلے میں سے گذرتا ہوا نظر آتا ہے۔۔۔" ان کے سینے میں مدت سے ایک بہت بڑے راز کی گانٹھ لگی ہوئی تھی۔ کئی بار انہوں نے اسے اگلنا چاہا تھا لیکن کوئی مناسب موقع ہی نہ بنتا تھا۔ آج وہ علم کی درسگاہ میں کھڑے تھے اور اس سے بہتر مقام کون سا ہو سکتا تھا کہ تاریخ کے ایک اہم موڑ کی نقاب کشائی کر دی جائے۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے۔

"آپ کو پتہ ہے قرار دادِ پاکستان 23 مارچ کو پیش ہوئی تھی اور میری بیٹی کا جنم دن بھی 23 مارچ ہے۔ آپ دیکھ لینا اس دن سارے پاکستان میں چھٹی ہوا کرے گی۔۔۔" برسوں بعد ان کی یہ بات سچ ہو گئی تو وہ بہت فخریہ کہا کرتے۔" 23 مارچ کو پاکستان بھر میں در اصل میری شہزادی کے جنم دن کی چھٹی ہوتی ہے۔۔۔۔"

حالات کی نزاکت اور اپنے آپ کو اتنے بڑے مورخ کے سامنے پاکر' ہیڈ مسٹرس نے ملازمہ بھیجی اور متعلقہ ٹیچر کو اپنے گھر پہ بلالیا۔ لیکن ساتھ ہی خفیہ پیغام بھی دے دیا کہ ٹیچر آتے ہی معذرت کر لے تا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھ جائے۔ وہ ان سے بھی بڑھ کر کایاں نکلی۔ آتے ہی اس نے بچی کو گلے سے لگایا اور یوں صدقے واری ہوئی کہ شاہ جی عمر رفتہ کو آواز دیتے رہ گئے۔ لٹ جانے کے ڈر سے انہوں نے از خود ہی اسے معاف کر دیا اور آئیندہ اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر لوٹ آئے۔ وہ ٹیچر مزید دو تین سال اس سکول میں رہی اور کئی بار اس نے شاہ جی کے بارے میں پوچھا' سلام بھی بھیجا لیکن وہ پھر سکول نہیں گئے۔ البتہ رپورٹیں بہت تفاخر سے وصول کرتے رہے کہ وہ مقابلہ قرأت میں اول آئی ہے۔ اس کی آواز اتنی سر میں ہے کہ صبح وہی سب بچوں سے "لب پہ آتی ہے دعا۔۔۔" کہلواتی ہے۔ پڑھائی میں بھی اچھے نمبر لئے ہیں۔ چاٹی ریس میں اول اور فلاں فلاں کھیل میں دوم اور سوم آئی ہے۔ سکول سے ایک اور بہت بڑی خبر بھی آئی تھی کہ شہزادی کی کہی بہت سی باتیں درست ثابت ہو جاتی ہیں۔ وہ غور سے چہرہ پڑھ کر بہت سی باتیں پیش از وقت بتا دیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن خدا جانے شاہ جی نے اسے کیوں توجہ کے قابل نہیں سمجھا؟ بلاشبہ اس کی باتوں میں بہت بھولپن اور معصومیت تھی لیکن وہ اللہ لوگ' سائیں لوگ نہیں تھی۔ شاید انہوں نے اس بات کو ریلوے اسٹیشن کے دوسری پار بیٹھے نجومی کا "طوطا قسمت کا حال بتائے گا" والا کھیل تماشہ سمجھا' یا دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے بچوں کا' ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اپنا جعلی عکس بنانا سمجھا' اور نظر انداز کر دیا۔ وہ کان میں جاتی بڑوں کی بات ہاتھ سے اُڑا دیا کرتے تھے اس پہ کیا دھیان دیتے؟

لیکن ایک روز سکول سے بارش میں بھیگی آئی عصمت شہزادی شاہ جی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گھر میں داخلی سیڑھیوں سے ملحقہ "پھورے والے کمرے" میں لے گئی اور چھوٹی سی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ " اسے بند کروا دیں ورنہ اس میں سے پانی اندر آئے گا"۔ ایسی

بارشیں تو نہیں ہو رہی تھیں کہ سیلاب کا گمان ہو۔ اور یوں بھی کمرہ مندر کی لگ بھگ بارہ پندرہ سیڑھیاں اونچی چوکی پر واقع تھا اس لئے شاہ جی کو یہ ڈر بالکل بلاوجہ محسوس ہوا۔ چنانچہ اس بار وہ اپنی شہزادی پر ہنس دیئے۔ لیکن چند ہی دن بعد پیچھے کشمیر میں زبردست بارشوں سے ایک ایسا سیلاب آیا۔ جو خس و خاشاک کی طرح چناب اور پلکھو میں سے کئی گاؤں بہاتا گزر گیا۔ پھر جب پانی آدھی رات اسی کھڑکی سے نقب لگا کر سچ مچ صحن میں ابلنے لگا تو ان کے گلے میں اپنی ہی بے یقینی کی پھانس لگ گئی۔ اس بار انہوں نے سوچ لیا کہ وہ آئندہ ایسی باتوں پہ زیادہ توجہ دیں گے۔

شاہ جی کو سمبڑیال سے آگے ایک گاؤں ڈھوڈھووال کے پیر گھرانے سے ثریا بی بی کا رشتہ آیا اور اگرچہ وہ کافی دور اندیشی سے اپنے فیصلے کرتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بھی عام آدمی ثابت ہوئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ نمبرداروں' زمینداروں کی طرح گاؤں گاؤں پھیلی یہ جونکیں سادہ لوح مجبور غریبوں کے خون اور رزق پر پلتی ہیں۔ اور ان کا ہاتھ بھکاریوں کی طرح ہمیشہ پھیلا رہتا ہے۔ بیچ برادری ہاں کر چکے تھے اور " جان جائے پر وچن نہ جائے " کی مثل وہ اپنے وعدے کے دھنی تھے۔ پیروں سے رشتہ جڑنے کا فخریہ پیرائے میں ذکر کرتے جب کہ منہ کی کڑواہٹ دور کرنے کے لئے بعد میں کلی کرتے۔ اس کا احساس انہیں تب ہوا تھا جب دولہے میاں دس دس پندرہ پندرہ چیلوں مریدوں کے ساتھ ' عین کھانے کے وقت ' ہر دوسرے تیسرے روز چکر لگانے لگے۔ شاہ جی نے گھر سے کوئی ایک فرلانگ فاصلے پر بسوں 'لاریوں' ٹرکوں کے لئے ایک ڈھابہ بھی کھول رکھا تھا۔ چٹے بٹوں کے منہ کو لگ چکی تھی وہ آتے اور اس دن کا سارا کھانا چٹم کر کے اینڈتے ہوئے لوٹ جاتے۔ شاہ جی نے ہاتھی پال لیا تھا اب دروازہ تو اونچا کرنا ہی تھا۔

بہر حال " سریا " بی بی کی شادی کا دن خیر سے آ ہی گیا۔ اور تب دوسرے گاؤں' شہروں سے آئے رشتہ داروں اور دوست احباب نے بھی دیکھا کہ سات آٹھ سال کی ایک بچی نے مندر

کے سامنے عورتوں والی تنبو قنات ہٹانے پر اصرار کیا۔" اس میں آگ لگ جائے گی۔" یہ گوگی بی بی تھی۔ شاہ جی کھانا پکانے والوں کو ہدایات دیتے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ اس وقت سب کچھ اکھیڑ کر دوسری جگہ نصب کروانا مشکل تھا۔ پھر بھی ایک نامعلوم خوف سے انہوں نے دوسرے خیمے میں مردوں کے بعد عورتوں کے کھانے کا حکم جاری کر دیا۔ اور پھر ہونی بھی ہو گئی۔ مندر کی دہلیز پر دیگیں پک رہی تھیں۔ ایک لکڑی ایسی چٹخی جیسے اس میں بارود بھرا ہو۔ جلتے ہوئے کولتار کی طرح چند شعلے خالی خیمے کے سائبان پر گرے اور اس میں آگ لگ گئی۔ اسے فوری بجھا لینے کی کوشش بھگدڑ کی وجہ سے رائیگاں گئی۔ بعد میں ہر کسی کی سوچ تھی کہ بچی کی بات نہ مانی ہوتی اور خیمہ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ پھر اسی شام گوگی بی بی نے ایک ماموں کو سانگلہ واپس جانے سے روک دیا کہ اس بس سے نہیں اگلی سے جانا۔ وہ اس اعتماد پہ سچ مچ رک گیا کہ بعض بچے اللہ کا اوتار ہوتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد خبر آگئی کہ آگے جانے والی بس تیز رفتاری کی وجہ سے درخت میں جا ٹکرائی اور اب زخمیوں کو لوگ ہسپتال لے جا رہے ہیں۔

کتنے ہی ایسے واقعات ہو گئے۔ اب جو " وزیر آباد کی گوگی" کے نام کی خوشبو اڑی تو اڑوس پڑوس' قریہ قریہ' گاؤں گاؤں پھیل گئی۔ ہولے ہولے دور سے بھی سواریاں مرادیں لینے' دعا کروانے کے لئے آنے لگیں۔ اب کوئی اسے صرف " گوگی" نہیں کہتا تھا۔ اپنے بیگانے ہر کسی نے اسے " گوگی بی بی" کی سند دے دی تھی۔ اس نے ایک بار جس کو چھو لیا وہ اسی کا ہو گیا۔ مٹی کے گھگھو گھوڑے بیچنے والا آتا تو اسے مفت میں کھلونے دے جاتا۔ گجرات کے شاہ دولہ شاہ ولی سے چوہے یا دوسری فقیرنیاں آتیں تو اپنی کمائی خیرات الٹی اسی کو دے جاتیں۔ جانے اس کے ہاتھ میں مسیحائی کہاں سے آگئی کہ بخار میں تپتے بدن کو چھو لیا تو اندر کے الاؤ کو مدھر تا میں بدل ڈالا۔ کسی کو گڑ دیا' کسی کو شکر۔ کہتے ہیں کہ باری کے بخار سے لے کر ہیضے تک سب شفا پا گئے۔ جوڑوں کے درد کے لئے وہ صرف پھونک مار دیتی یا لعاب دہن

لگادیتی تو بڑی بوڑھیاں بھی تن کر واپس جاتیں۔ جس کو ہاتھ لگادیا وہ تندرست ہو گیا۔ جس کو دعا دی وہ پوری ہو گئی۔ اگر کسی کو مراد نہیں ملی اور وہ شکوہ لے کر پھر آیا تو اس نے اللہ میاں سے بھی ہیٹی لگالی کہ اس کی بات کیوں نہیں سنی۔ شاید ساتھ کھیلنے والے فرشتے سفارشی بن جاتے تھے۔ کہ جلد ہی اس کی ضد کی قبولیت کا پروانہ آجاتا۔ اسی کھیل کھیل میں کتنے ہی پت جھڑ آئے اور خاموشی سے اس کی دہلیز کو چوم کر گزر گئے۔ مسعودہ کی شادی لاہور میں پھوپھی زاد سے ہو گئی اور مقبول بی بی کو سوتیلے چچا نے زبان دے کر سیالکوٹ کے ساتھ ایک گاؤں کوٹلی امیر علی میں نمبرداروں کے گھر بیاہ دیا۔ ریاض حسین کے لئے ماں نے اپنی بڑی بہن کے آگے پلو پھیلا دیا۔ شاہ جی بھی بہت خوش تھے کہ گھر ہی کی ایک فرمانبردار' محنت شعار بیٹی آجائے گی۔ لیکن ریاض حسین کو شاید انوکھے کام کرنے کا شوق تھا اس کا دل کسی ماہر دم درود' تعویز دھاگہ اور عملیات کرنے والی میں اٹکا ہوا تھا۔ ماں باپ کی خوشی کے لئے کسی بھی احتجاج کے بغیر خالہ زاد سے نکاح تو پڑھوا لیا لیکن منہ دیکھنے سے پہلے ہی اسے طلاق بھی دے دی۔ شاہ جی نے ایسی قطع تعلقی کی کہ کئی برس بعد دنیا سے کوچ کیا تو ریاض حسین لاکھ کوشش کے باوجود بھی جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔ اسی سبب انہیں گھر کی دیوار کے ساتھ ' مندر کے تھڑے پر امانتا" دفن کر دیا گیا۔ سیلاب نے ریاض حسین کے سارے راستے چاٹ لئے تھے۔ وہ خود بھی نہ رہے تو اگلی نسل نے شاہ جی کی قبر کے اوپر بالائی منزل کا پرنالہ چھوڑ دیا۔

کالیداس بھیا کے کارنامے بھی کچھ ایسی ہی داستان تھے۔ اس کا احساس کمتری مٹانے کے لئے ابا میاں نے اسے ایک دونالی بندوق لے دی۔ چنانچہ ہر کچھ دن بعد وہ تیتر کے شکار پر نکل جاتا۔ اس دوران خدا جانے کہاں اسے "ہیلن آف ٹرائے" کے شہزادہ پاریس والی دیویاں ملیں؟ اور حسن والی دیوی نے اسے عشق کا کوئی منتر ٹوٹکا پڑھا سکھا دیا کہ دودھ سے نہائی لڑکیاں اس کے جال میں پھنسنے لگیں۔ گلی کی رجو رضیہ بی سے شروع ہوئے تو جہلم' چونڈہ'

گوجرانوالہ تک معرکوں کے قصے سنائی دینے لگے۔ شاہ جی نے اسے لاہور پنڈی کے لئے ٹرانسپورٹ بس بنا کر دی۔ چند ہی دنوں بعد چناب میں زبردست سیلاب کناروں سے باہر پھلانگ آیا اور سڑکوں کو کھا گیا۔ کالی بھیالالہ موسی میں ایک سہیلی کے ساتھ شب بسری کرنے رک گئے اور تنخواہ دار ڈرائیور نے پانی میں ڈوبی سڑک تلاش کرتے نئی بس دریا برد کر دی۔ آوارگی' مارا ماری نے اس کا سامنا چونڈہ والے ماموں کی بیٹی سے کروا دیا جو 1965 کی جنگ میں اجڑ کر آئے تھے۔ تب سے پھنسا وہ پھر آزاد نہیں ہو پایا۔ سننے میں ہے کہ میاں بیوی میں سے کسی نے اب کوئی جن بھی قابو کر لیا ہے چنانچہ اس غائب شاہ کو لئے کراچی تک پیری مریدی کے وارے نیارے کرتے رہتے ہیں۔ پاکستانی قوم ویسے بھی بہت پیر نواز ہے۔ یہاں 'ڈبہ پیر' اور 'نالا پیر' بھی بہت نام کما چکے ہیں۔ جناتی پیر تو اور بھی بڑا ہوتا ہے۔ بہر کیف' شاہ جی کا اعتقاد سچا نکلا کہ اللہ نے نصیب میں لکھا ہو تو ان پڑھوں کو دال روٹی کیا' بے حساب نان' کباب اور چرغا بھی مل جاتا ہے۔ اور پوٹھوہار کے لوگ تبھی تو کہتے ہیں۔ "او شاہ جی! پڑھیاں لکھیاں وی مرو نجھنا' تے ان پڑھاں وی مرونجھنا' فیر کیہہ فیدہ اے پڑھنے لکھنے دا۔۔۔؟؟؟" باقی ساری دنیا کے کسی تعلیمی نصاب میں ایسا بیش قیمت مشورہ نہیں ملتا۔

وقت کے پنکھ اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ انسانی آنکھ اس کا احاطہ ہی نہیں کر پاتی۔ اور کچھ ایسا ہی گوگی بی بی کے ساتھ بھی ہوا۔ گھر میں شاہ جی کو' بڑی اماں' چھوٹی اماں' کسی کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ کب اس کے بچپن کی شورش میں ایک پر تمکنت ٹھہراؤ آ گیا۔ چاند کی نرم کرنوں نے اس کی آنکھوں میں دیئوں کی ایسی جوت جگائی کہ جہاں دیکھے وہیں چراغاں کر دے۔ سوہنی کے چناب سے چلی ہواؤں اور پلکھو کے پانیوں نے تراش خراش کر اس کے نقوش ایسے ابھارے کہ اس کی بس ایک نگاہ' اور آدمی کو زہد اور تقوی کا عرفان حاصل ہو جائے۔ اسے بنانے والے نے دوپٹے تلے اس کی پلکوں پر کچھ ایسے خواب سجا کر انہیں اتنا بوجھل کر دیا تھا کہ اسے اپنی ذات سے باہر نکلنے کا ہوش ہی نہ تھا۔ سانگلہ والے ماموں کی ایک

بیٹی صابرہ مجذوب تھی۔ لوگ باگ' ہر کوئی اسے اللہ لوگ کہتا تھا اور وہ بہت دنوں سے ان کے گھر مہمان تھی۔ جانے دونوں کے بیچ کیسے تار جڑے تھے کہ گوگی بی بی دل کی بات صرف اسے ہی بتاتی تھی۔ ایک سحر اس نے بہت عجیب سا خواب دیکھا۔ آنکھ کھلی تو جی کی تال ہی الگ تھی۔ بار بار پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ساتھ ہی سینے میں اس خواب کے ادھورا رہ جانے کی کسک بھی تھی۔ کتنی دیر وہ مطلب پوچھنے کے لئے اللہ لوگ کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر اسے جھنجھوڑ جگا کر باہر پلکھو کنارے کھینچ لے گئی۔ خواب سنایا اور تعبیر پوچھی۔

" میں کسی نامعلوم گھر میں موتیئے کی کیاری سے پھول چن رہی تھی۔ وہاں کوئی آیا اور اس نے میرے سر پر دوپٹہ ڈال دیا۔۔۔" اس کی آواز کپکپا گئی۔ " میں اسے دیکھ بھی نہیں پائی۔۔۔"

اللہ لوگ دھیرے دھیرے پھوٹتی اس اجلی صبح کی روشنی میں بہت غور سے اس کا چہرہ پڑھتی رہی۔ پھر نگاہ اٹھا کر اک بار صبح کے ستارے کو دیکھا۔ آنکھیں بند کیں اور جیسے یخ بستہ ہوا اوس سی' کہیں پہاڑوں کی چوٹیوں اوپر سے سرسرائی۔

"تمہاری روح بک چکی ہے۔ لیکن تمہیں بہت انتظار کرنا ہو گا۔ البتہ۔۔۔" کچھ پل خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔ "وہ بہت جلد تمہیں دیکھنے آئے گا۔۔۔"

XXX

2

میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم ایس سی زوالوجی کے آخری سال میں تھا۔ تحریری پرچے ہو چکے تھے اور صرف ریسرچ کی جانچ باقی تھی کہ بغیر اعلان 1965 کی پاکستان بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ میں اس صبح کھانے کا سودا سلف لینے جا رہا تھا۔ راہ میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور میرے حواس کے ساتھ ساتھ گلی میں زمین و مکان سبھی لرز گئے۔ پھر ساعتوں میں ہی ادھر اُدھر سے آوازیں' خبریں سفر کرنے لگیں کہ " انڈیا نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔۔۔" سودا لانے کی بجائے میں وہیں سے گھر کی جانب پلٹ پڑا۔ پورا واپسی راستہ میں نے اپنے بدن میں خون کے جسیموں کو زبردست ہیجان کے ساتھ آپس میں ٹکراتے محسوس کیا۔ گھر پہ ماں جی دھماکے سے پریشان کچن میں مصروف تھیں۔ میں نے انہیں خبر سنائی۔ اپنے کمرے میں آیا اور ریڈیو لگا دیا۔ اناؤنسر اعلان کر رہا تھا کہ صدرِ پاکستان قوم سے خطاب کریں گے۔ چند ہی لحظوں بعد ایوب خان کی بہت سنجیدہ آواز ابھری۔ مجھے وہ لہجہ' وہ مختصر سی تقریر' وہ پیغام اور اس کے پیچھے وہ اعتماد بے حد اچھے لگے۔ ساری دنیا کو ہم نے بتا دیا تھا کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں جس کی قیادت جاگ رہی ہے' رکھوالے جاگ رہے ہیں' شاعر و مغنی جاگ رہے ہیں' نور جہاں کی خون میں طوفان جگاتی آواز جاگ رہی ہے۔ ساری قوم یوں جاگ رہی ہے کہ جس رات گولہ باری کی آواز نہیں آتی' صبح فضا میں بارود کی بو رچی محسوس نہیں ہوتی تو لوگ خاموشی کا سبب معلوم کرنے بارڈر کا رخ کرتے ہیں۔ انارکلی کے بانو بازار میں تسبیح بکنے لگی۔ لپ اسٹک' کاجل غازے کا بائیکاٹ ہو گیا اور گلے میں بٹی رسیوں کی بجائے عورتوں کے سروں پہ چادریں آ گئیں۔ ہر جگہ " باجی " کی اصطلاح عام ہوئی تو میں نے دیکھا ہر چہرے پہ آپ ہی آپ نور آ گیا تھا۔ ہماری کلاس میں پہلے ہی روز جوش آ گیا۔ سات لڑکے

اور ایک لڑکی نکہت ظفر تھی۔ اسے بتائے بغیر ہی ہم ساتوں والٹن کے فوجی سنٹر میں بھرتی ہونے چلے گئے جہاں ہمیں ہوش دلایا گیا کہ فوج کو دلیل و جواز ڈھونڈنے والے سقراط' بقراط اور افلاطون نہیں سر فروشوں کی ضرورت ہے جو گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی مورچوں کو سرد کر دینے کا جنون و جذبہ رکھتے ہوں۔

" آپ لوگ سول ڈیفنس وغیرہ میں رفاعی کام کر کے بھی ملک و قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔۔۔" ہمیں سمجھایا گیا۔" عوام کو بتائیں کہ ہوائی حملے کے وقت انہیں کیا کرنا ہے۔ زخمیوں کی مدد کریں۔۔۔"وغیرہ وغیرہ۔ "اپنے وطن کی حفاظت کے لئے' ہم ہیں نا۔۔۔"

ماں جی واپس کیمبلپور اپنے ٹبر میں جا چکی تھیں کیونکہ اباجی کی پولیس تعیناتی ان دنوں وہاں تھی۔ میں تعلیم کے سلسلہ میں لاہور اکیلا ہی رہتا تھا۔ سکول' کالج یونیورسٹی سب بند ہو گئے تو اب میں کیا کرتا؟ جلے دل سے میجر صاحب کا کہا مان لیا۔ سول ڈیفنس کی وردی پہن لی تو راتوں کو تاریک گلیوں میں گشت کرتے مزا آنے لگا۔ سائیرن بجتا تو اور بھی مزا آتا۔ اعصاب کس جاتے اور ہم ہنگامی حالات سے نبٹنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ صبح چوبرجی چوک میں کھڑے ہو کر ہم قصور' واہگہ اٹاری' اور چونڈہ کی جانب رواں دواں فوجی قافلوں کا والہانہ استقبال کرتے ' انہیں قوم کے عطیات پیش کرتے۔ پتہ نہیں کیوں' مجھے وہ جنگ بہت اچھی لگی۔ پاکستانی قوم کا ہر فرد مجھے زندہ لگا۔ نسیم حجازی کے ناولوں سے ابھر کر کتنے ہی شاہین اڑ رہے تھے۔ چونڈہ میں کتنے ہی جنرل رومیل بھارت کے ٹینکوں کو کھلونوں کی طرح دھنک رہے تھے اور ہر روز آخری معرکوں کی نت نئی کہانیاں خون گرما رہی تھیں۔ اسی دوران ایک دوپہر میرا چھوٹا بھائی افتخار کیمبلپور سے آ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنا بالغ کیسے ہو گیا تھا اور جنگ کے اس ماحول میں اسے اکیلے سفر کی اجازت کیسے ملی؟

"اباجی اور امی بھی آئے ہیں۔۔۔"اس نے ایک معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

وہ وزیر آباد میں رک گئے ہیں۔ اور آپ کو بلایا ہے۔۔"

" کیا مطلب؟ ایسی کیا ایمر جنسی آ گئی ہے۔" میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔

" آپ کے لئے ایک لڑکی دیکھی ہے۔۔۔" اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ " پکھو والے ماموں کی بیٹی گوگی۔۔۔"

دراصل وہ ہماری نہیں رشتے میں ہماری ماں کے ماموں کی بیٹی تھی۔ میرے ننہال سیالکوٹ اور ددھیال وزیر آباد سے تھے۔ میں خود بھی وزیر آباد میں پیدا ہوا اور بچپن وہیں گذارا تھا اس لئے انہیں جانتا تھا۔ ماں کی طرح اباجی اور ہم سب بچے بھی انہیں ماموں ہی کہتے تھے۔ البتہ لوگ انہیں "شاہ جی" کہتے تھے۔ اونچا لمبا قد' اونچے طرے والی سفید پگڑی پہنی ہوتی تو خوفناک حد تک بارعب لگتے تھے۔ لاہور منتقل ہو جانے کے بعد کبھی سکول کی چھٹیاں گذارنے وزیر آباد جاتے تو میں انہیں دیکھ کر دور ہی سے اپنا راستہ بدل لیا کرتا تھا۔ ان کی لال لال بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا تھا کیونکہ وہ یک ٹک سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھے جاتے تھے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر انہوں نے مگدر کندھے پر رکھ کر تصویر اتروائی ہوتی تو گاماں پہلوان کی بھی ایسی تیسی کر دیتے۔ بچپن میں ایک بار میں ان کی بڑی بیٹی ثریا کی شادی میں ان کے گھر گیا تھا۔ وہاں بہت ساری گھر والی' باہر والی چھوٹی بڑی لڑکیاں تھیں۔ اب ان میں سے کون سی گڑیا" گوگی" تھی مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

"یار تم لوگوں کو ذرا ڈر نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔" کہ دو قومیں' دو ملک حالتِ جنگ میں ہیں اور تم لوگوں کو رشتے ' شادی کی سوجھی ہے۔۔؟"

"جنگ اور دفاع کے لئے فوج موجود ہے نا؟" وہ بے نیازی سے بولا۔" امی کو لڑکی بہت پسند ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ آپ بھی آ کر اسے دیکھ لیں پھر وہ بات آگے چلائیں گی۔۔۔" اس نے بتایا۔

میں اس پیغام کی تہہ میں چھپے حکم نامے سے بخوبی واقف تھا۔ اور حالانکہ میں بہت عرصے سے کہہ چکا تھا کہ میں خاندان سے باہر شادی کروں گا۔ "پوجا صرف ان دیکھے خدا کی ہوتی ہے۔ ورنہ انسان اس میں بھی عیب نکال کر محبت کا رشتہ توڑ دے۔" میری دلیل تھی کہ شادی والے دونوں گھرانے ایک دوسرے سے انجان ہوں تو زندگی آپسی طعنوں کے بغیر بہت سکون سے گذرتی ہے۔ رہی محبت کی بات تو "کسی کے ہو جاؤ اور اسے اپنا بنالو۔" لیکن یہ میرے نظریات یا دلیلوں کا موقع نہ تھا۔ میرے ماں باپ ان کے گھر آئے بیٹھے تھے اور بذریعہ بیلف میری طلبی کی تھی اس لئے مجھے جانا ہی پڑا۔ یہ اس دن کی بات ہے جس سے ایک روز پہلے وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر بم گرایا گیا تھا اور اور وہاں ارد گرد رہنے والے لوگوں پر انسانی خون اور ان کے چیتھڑے برسے تھے۔ لاہور سے وہاں تک' جی ٹی روڈ کے پہلو میں بسے ہر قصبے' ہر شہر کے " عزیز ہم وطنو" کا بے مثال جوش و جذبہ دیکھتے منزل پہ پہنچے تو پتہ چلا میرا برخوردار بھائی مجھے چکمہ دے کر لے آیا تھا۔ وہاں تو صرف میری سگی خالہ براجمان تھیں ورنہ وہ تو ماں اور باپ کو کیمبلپور کی بس پر واپس روانہ کرنے کے بعد میرے پاس آیا تھا۔ اب مجھے تلملاتے پا کر اس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

"دراصل جیسے جیسے آپ کی تعلیم مکمل ہو رہی ہے اور آپ کماؤ پتر ہونے کے قریب ہیں آپ کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔۔۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو بہت اچھی طرح پتہ ہے کہ خالہ بھی اپنی بیٹی کے لئے آپ میں دلچسپی رکھتی ہیں اور آپ اس کے ذکر سے ہی بدکتے ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کے معاملے میں گڑبڑ کرنے آئی ہیں۔ انہیں ہمارے یہاں آنے کی خبر لاہور مسعودہ کے سسرال سے ملی اور شاید موسم کے نشیلے ہونے کا بھی کچھ اندازہ ہو گیا ہو۔ چنانچہ آتے ہی انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے زاہدہ کا رشتہ مانگ کر شطرنج کی بساط بچھا دی ہے۔ مقصد یہ کہ انہیں "ہاں" ہو جائے تو آپ پر سب سے پہلے اپنا حق جتا کر یہاں

آپ کا راستہ کاٹ دیں۔ ہم آپ کی رضامندی جانے بغیر بات آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔۔۔" چند لمحے وہ میرا چہرہ پڑھتا رہا اور شاید کوئی تاثر نہ پا کر بولا۔ " اس لئے یہی فیصلہ کیا کہ بدمزگی سے بچنے کے لئے امی اور اباجی واپس لوٹ جائیں۔ میں آپ کو لڑکی دکھا کر آپ کی مرضی جان لوں۔ اب اگر آپ نے رشتہ رد کرنا ہے تو آپ واپس لاہور لوٹ جانا۔ میں کیمبلپور جا کر انہیں آپ کا فیصلہ سنا دوں گا۔۔۔"

وہ پہلا لمحہ تھا جب میں نے بڑی سخاوت سے سوچا۔ " چلو۔ لڑکی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔۔۔" اور تبھی اس نے ڈھیر سارا جذباتی مصالحہ بیچ میں انڈیل دیا۔ "ویسے امی کو، اباجی کو اور مجھے بھی، گوگی پسند بہت آئی ہے۔۔۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ اٹھ گیا۔ " وہی سب کو چائے پانی پوچھتی ہے۔ کمال ہے' آپ کا جان کر بھی اب تک نہیں آئی؟ شاید خالہ نے اپنا الٹا چرخہ چلا دیا ہو۔ میں دیکھتا ہوں۔۔۔"

وہ ابھی دو قدم نہ گیا تھا کہ دروازے میں ایک بت آن ایستادہ ہوا۔ پلٹ کر بھائی نے اپنے ہونٹوں کی بے آواز جنبش سے اس کا نام بتایا۔ یہ "گوگی" تھی۔ کھلے سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرنے والی ہرنی کی مانند کسا ہوا جسم۔ چہرے کے نقوش میں شاید خود گجرات کی سوہنی نے رنگ بھرے تھے۔ مجھے لگا وہ کالج سے ابھی ابھی آئی ہے۔ اس کی آسمانی رنگ کی قمیض اور سفید شلوار مجھے یونیفارم ہی لگی۔ سر پہ دوپٹہ ایسے لپیٹا ہوا جیسے چائے دانی پہ " ٹی کوزی" چڑھائی ہو۔ گال دہکتے ہوئے اور رنگ اتنا گورا کہ دیکھتے ہی مجھے " ناپسند " ہو گئی۔ مجھے تو ہمیشہ سے سانولہ سلونا پسند تھا۔ یہ کیا ہوا کہ کبھی اڈتے پیار میں ذرا بے لگام ہوئے تو " چن کیویں گذاری آرات وے۔۔۔" کے مصداق چہرہ نشر و اشاعت کا چلتا پھرتا اشتہار بن جائے؟ ہاں البتہ مجھے اس کا قد بہت پسند آیا۔ میرے پانچ فٹ چھ انچ قد جتنا' یا شاید کچھ آدھا

انچ کم۔ آنکھوں کے مدھ بھرے کٹوروں میں جھانک کر اپنے لئے پیار پڑھنے رکوع میں نہیں جانا پڑتا۔ سامنے کھڑے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ بھر لو تو نگاہوں سے دل کی دھڑکنیں گن لو۔ سب کچھ اچھا تھا لیکن مجھے وہ بے حد گورا رنگ نہیں بھا رہا تھا۔

"آپ چائے تو نہیں پیئں گے۔۔۔" سنگ مرمر کے اس مجسمے نے مجھے بہت بیباک انہماک سے اپنا خلاصہ پڑھتے دیکھا تو یکدم ایک بھاری بھر کم پہاڑ جیسا سوال میرے اوپر اچھال دیا۔

"یہ کیا سوال ہوا۔۔۔؟" میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔ کل کو مجھے لیکچرار بننا تھا اور اپنے سٹوڈنٹس کی غلطیوں کی تصحیح کرنی تھی اس لئے ایسے موقعوں کے لئے میں تیار رہتا تھا۔ " میرے منہ میں انکار کا لقمہ ڈال کر مجھ ہی سے پوچھا جا رہا ہے کہ میں چائے پیئوں گا یا نہیں۔۔۔؟" یکدم مجھے شرارت سوجھ گئی۔ آرام کرسی پہ ذرا سا آگے کھسکا اور اپنا چہرا اوپر اٹھا کر اسے گھورا۔ "مجھے بہت بھوک لگی ہے اور کھانے کے ساتھ ہی چائے بھی لوں گا۔ ویسے۔۔۔ آج کھانے میں کیا بنایا ہے۔۔۔؟؟؟" میں نے آنکھوں کی جنبش سے سوال میں شوخ مصالحہ ڈال دیا۔

وہ بری طرح جھینپ گئی۔ گالوں میں لہو جھپکے مار کے لجا سے سارا چہرہ گلال کر گیا اور ساتھ ہی وہ دہلیز سے پسپا ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ مجھے اور بھی "ناپسند" ہو گئی۔ حیا سے چہرے پہ گلاب کھلنے اور غصے سے لال بھبھوکا ہونے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے؟

"کیسی ہے؟۔۔۔" بھائی بہت پر امید نگاہوں سے مسکرا رہا تھا۔

"ایکدم ناپسند۔۔۔" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔ " کہیں پیار میں ہی میری انگلی لگ گئی تو تھانے میں نیل دکھا کر مجھے جیل کروا سکتی ہے۔ میرے ایک دوست کی بیوی اسے بلیک میل کرتی رہتی ہے کہ فلاں چیز لے کر دو ورنہ نیل دکھا کر

اپنے مائیکے میں شور مچادے گی کہ وہ اکثر اسے مارتا رہتا ہے۔۔۔" پھر میں نے اسے اپنی دلیل دی۔ "یار تمہیں اچھی طرح پتہ ہے مجھے چہرے پہ ہلکا سا نمک پسند ہے۔۔۔"

اس کے بعد ہمارے بیچ جیسے ایک خاموش معاہدہ قرار پاگیا کہ پھر اس نے گوگی کا نام تک نہ لیا اور میں نے ذہن سے جھٹک دیا کہ ہم کوئی لڑکی وڑکی دیکھنے آئے تھے۔ وہ کھانا لائی' ہم نے کھالیا۔ شام ہمیں اندرون شہر اپنے دوسرے عزیز و اقارب سے ملنے جانا تھا۔ گوگی نے میرے کپڑے بھی استری کر دیئے۔ تیار ہو کر نکلنے لگے تو خالہ سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ انہیں میرے وہاں آنے کے مقصد کی بہت کرید تھی۔ میں نے یہ کہہ کر کچھ گرم مصالحہ ڈال دیا کہ " لڑکی اچھی ہے اگر بات بن جائے تو ہیر رانجھا' سوہنی مہینوال کی جوڑی بن جائے گی۔ ان کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ اور وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔ مجھے یقین تھا اب وہ بی بی گوگی کے سر پہ سوار ہو کر اسے میرے خلاف بھڑکائیں گی۔ لیکن وہ ڈرامہ دیکھنا میرے لئے ممکن نہ تھا اس لئے ہم اپنی راہ چل دیئے۔ تاخیر سے لوٹے تو میرا بستر مندر کے تھڑے پر لگا ہوا تھا۔ پتہ چلا بھائی اندر صحن میں سوئے گا اور مجھے وزیر آباد کے خاندانی مچھروں سے راگ سوہنی سننا ہے۔ کمبختوں نے کوئی کمبل وغیرہ بھی نہ دیا کہ پلکھو کے پانیوں میں بسی سرد ہواؤں سے ہی پناہ مل جاتی۔ ساری رات جاگتا رہا۔ کبھی بستر پہ لیٹتا' کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ بس ایک ہی سوچ۔ ماں میری روح میں بسی تھی اور "اسے گوگی پسند تھی تو اب میں کیا کروں؟ " جی تو بہت تھا کہ میرا کسی چندے ماہتاب پٹاخہ قسم کی لڑکی سے عشق' محبت کا کوئی چکر ہوتا اور میں اس کا نام بتا دیتا لیکن وہ الو کی پٹھی خدا جانے کہاں رہ گئی تھی؟ تھڑے پہ کھلی پورے چاند کی چاندنی' مندروں کے آنگن اور راجہ اِندر کے دربار سے جڑے حسن اور رقص و کلا کے رومانی تصور نے مجھے اور بھی بے کل کر ڈالا۔ میں نے سوچا۔ "کیا تھا ان لمحوں وہ بھی چھنن چھنن آجاتی تو تسلی سے اسے دیکھ لیتا۔ کچھ باتیں ہوتیں اور ممکن ہے میں اسے پسند کر ہی لیتا۔ تبھی میرے تحت

لاشعور نے یکبارگی اس کا ہیولا میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ دو فرلانگ دور ریلوے اسٹیشن پر بوگیاں جوڑنے کے لئے کچھ شنٹنگ ہوئی اور ساتھ ہی جی ٹی روڈ کے سٹاپ پر کسی بس نے بھونپو بجایا لیکن مجھے لگا مندر کے اندر طبلے کی تال پر کسی ہاتھ نے رباب و وینا کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ پھر میں گورے رنگ کو "نہ' نہ" کا الاپ دیتا رہا اور وہ نرتکی کی طرح لہراتی' بل کھاتی' دھیرے دھیرے میرے دل کے خالی فریم میں سرکتی گئی۔ یوں صبح ہوتے ہوتے میرے منہ سے "ہاں" نکل ہی گیا۔ ماں جیت گئی' بے خبر گوگی بھی جیت گئی۔ اس کے اَن رچائے سوئمبر کا ہار خود ہی اپنے گلے میں ڈال کر میں اس کا مفتوح ہو گیا تھا۔

افسانے' کہانیاں میں تب بھی لکھتا تھا۔ میرے دو افسانے " اپیا" (جسے میں نے اپنی چھوٹی بہن کے نام سے شائع کروایا) اور " زرد کلی" پاکستان کے بین الکالج مقابلے جیت چکے تھے اور ناقدین نے اخباروں میں تخیل اور مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ استعاروں ' تشبیہات کی تعریف کر کے میرے ہر سو اک خوشبو پھیلا دی تھی۔ اب خود عشق کی درس گاہ میں پہلا سبق پڑھنے لگا تو میرے اندر کے قلم کار نے تیشۂ فرہاد تھما کر مجھے ایک سنگتراش بنا دیا۔ چنانچہ اگلی صبح وہ جتنی بار سامنے آئی میرے مشاہدے نے کھرچ کھرچ کر تخیل کے اَن گِنت پرتوں میں اس کے نقش و ادا گوندھ ڈالے۔ استعارے میرے ارد گرد رقصاں ہو گئے۔ تشبیہات اس کا نام گنگنانے لگیں۔ میں نے ایک ہی دن میں اپنی آنکھوں میں اسے یوں سمیٹا کہ زمین و آسمان کے بیچ جہاں چاہتا اس کا عکس وہیں ساکت و جامد ہو جاتا۔ بس آگے مغلِ اعظم کی اس انار کلی کے چہرے سے مجھے چلمن سرکانا تھا۔ وہ انجان' دشمن جان' میری جان ہو گئی تو میں نے بھائی کو خوشخبری سنا دی کہ۔

"ماں کی پسند مجھے قبول ہے۔۔۔"

دیوانِ عالی میں اپنی عرضداشت داخل کرنے کے لئے ہم نے اگلی صبح کیمبلپور کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چلنے سے کوئی گھنٹہ پہلے اس کی دوسری ماں کے بیٹے منظور شاہ سے میں نے گوگی کی

کوئی کتاب لانے کے لئے کہا۔ اپنچ تھی کہ جاتے جاتے اک شمع جلا جاؤں۔ وہ ایک کاپی اٹھا لایا۔ میں نے اس کی تحریر دیکھنے کے لئے درمیان سے کھولی۔ سامنے صرف ایک سطر لکھی تھی۔۔ " آپ بن جیا بہت اداس ہے۔۔" دل نے کہا کہ وہ پیغام میرے لئے نہ تھا کیونکہ اس کے آگے پیچھے صفحات پہ خطوط لکھے تھے۔ اردو کی کاپی تھی اور تحریر ایک صاف ستھرے ذاتی کردار کی عکاسی کرتی تھی۔ میں نے پہلے صفحے سے کھولا۔ اس کا نام لکھا تھا۔ " عصمت شہزادی۔ جماعت نویں اے۔ اسلامیہ گرلز ہائی سکول۔ وزیر آباد " ۔ ذہن میں ایک بے چین لہر مچلی لیکن میں اس کی کوئی توجیہہ نہ کر سکا۔ میں نے سمجھا وہ کوئی بہت پرانی کاپی لے آیا ہے۔ اس لئے پوچھ بیٹھا۔

"کونسے کالج میں پڑھتی ہے گوگی۔۔۔؟"

"لو۔۔۔" منظور شاہ نے بے ساختہ ہنستے ہوئے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ پھر بولا۔ " سکول میں پڑھتی ہے جی۔ ناویں میں۔ کتنے سال تو پڑھائی بند رکھی۔ اس کی فیسیں کون دیتا؟ سکول میں داخل بھی دیر سے ہوئی تھی۔ ویسے ہے بڑی لائق۔ ریاض بھائی کے بعد سارے گھر میں وہی زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ باقی سب 'نلائق' ہیں۔ وہ تو کھیلوں میں بھی بہت تیز ہے۔ ہر بار 'فسٹ' 'سیکنڈ' انعام لاتی ہے۔۔۔"

وہ پتہ نہیں کیا کچھ بکواس کرتا رہا۔ لیکن میرے عشق کے بھوت پر یکبارگی ہمالائی اولے پڑ گئے۔ مجھے تو دیوانگی کی حد تک تعلیم سے لگاؤ تھا۔ میں نے بھی اپنی ہمسفر کے بارے میں ذہنی ہم آہنگی کے کچھ تو خواب دیکھے تھے۔ اب اس "ناویں جماعت" میں پڑھنے والی کا میں کیا کروں؟ اور بھائی کا کیا کروں؟ اب پھر سے "ہاں' نہ" کا چکر شروع کر دوں؟ کیمبلپور تک سارا راستہ میں انہی بھول بھلیوں میں سرگرداں اپنا راستہ تلاش کرتا رہا۔ گھر پہنچا تو خبر سن کر ماں کے چہرے پر خوشی کی جو لہریں اٹڈیں انہوں نے میری واپسی کے رہے سہے دریچوں میں

پتھروں سے چنائی کر ڈالی۔ رات کھلے آسمان تلے چھت پہ بستر میں لیٹتا تو جگمگ تاروں کی دھنک بیچ سے' ان سے بھی کہیں زیادہ روشن و تاباں اک چہرہ میرے اوپر جھک آیا۔ اس کے اجلے لمس نے میرے دل' میری سوچ اور میری روح کو یوں چھوا کہ میں ہی کندن' پارس ہو گیا۔ میری کہانی کو اک نیا عنوان' نیا راستہ' نئی منزل مل گئی تھی۔

"لیکچرار تو بننا ہی ہے۔۔۔" میں نے سوچا۔ "سمجھو پہلی طالبہ بھی مل گئی ہے۔ چیلنج قبول کر لے۔ خود ہی اسے پڑھا لینا۔۔۔"

پھر یوں ہوا کہ دن کو میں اودے' سفید بادلوں سے اس کے کتنے ہی روپ بناتا اور رات تاروں کی چھاؤں میں میرا احساس اس کی سوچوں سے مہکنے لگتا۔ وہ سر پہ دوپٹے کی ٹی کوزی چڑھائے چھم سے میرے پاس چلی آتی۔ میں یک ٹک اسے دیکھے جاتا۔ اپنے آپ سے میری ایسی بیگانگی پر پہلے پہل تو اس کی پلکوں کی جھالر بوجھل ہو کر جھک جاتی اور لہو جھپٹے مارتا اس کے لب و عارض گلال کر دیتا لیکن پھر ہولے ہولے وہ چٹکنے لگی۔ اس کے نینوں کی جوت سے میرے ارد گرد اَن گِنت دیپ جل اٹھتے' ہر سو چراغاں ہو جاتا۔ راستے ستاروں تک روشن ہو جاتے اور میں ان کی دھنک اس کے دوپٹے پر سجائے جاتا۔ چاندنی کے ہنڈولے میں ہلکورے لیتی وہ مجھے اپنی آنکھوں میں لال ڈوروں کی کہانیاں سناتی اور میں گم سم اسے بس تکے جاتا۔ میرا تصور اس کا ہاتھ تھام کے کہکشاں کی پگڈنڈیوں پہ جو چلا تو "ہوتے ہوتے ہوتے" مجھے اس سے پیار ہو گیا۔ ماں باپ رشتہ مانگنے وزیر آباد چلے۔ اباجی نے دو روز بعد مجھے کمشنر آفس راولپنڈی میں ملنے کے لئے کہا تھا۔ میں بیتاب خوشخبری سننے ان کی میٹنگ سے پہلے ہی جا پہنچا۔ مجبوراً" ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر وہ دوپہر کے کھانے کے لئے مجھے ہوٹل لے گئے اور وہاں کریلے گوشت کی پلیٹ میں انہوں نے ایٹمی دھماکہ کر دیا۔

"مجھے ان کے گھر کا ماحول پسند نہیں آیا۔ اس لئے ہم نے رشتے کی بات ہی نہیں کی۔۔۔" انہوں نے کھانے سے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تک نہیں کہ میں

وہاں ہوں بھی یا ایٹمی توانائی کے غبار میں تحلیل ہو چکا ہوں۔" پڑھا لکھا کر ہم تمہیں گنواروں میں تو نہیں دھکیل سکتے؟ مجھے تمہارے لئے وہ رشتہ پسند نہیں۔۔۔" پولیس افسرانہ لہجے میں انہوں نے تیسرا سب سے زبردست دھماکہ کر دیا۔

پرانی رشتہ داریں نبھاتے انہیں کبھی اس گھر کا ماحول نہ کھٹکا ہو گا۔ اب نیا تعلق بنانے نکلے تو یکبارگی انہیں وہاں تعلیم کی کمی نظر آ گئی۔ وہ سخت گیر قطعی نہ تھے۔ بس ہماری بھلائی سوچتے ان کا نکتہ نگاہ ہم سے فرق ہو جاتا تھا۔ میں ان سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ آپ لوگوں نے مجھے بند دروازے کے پیچھے اس شجرِ ممنوعہ کا راستہ ہی کیوں دکھایا تھا؟ جانے انجانے میں اپنا آپ ان کی چوکھٹ پہ چھوڑ آیا ہوں تو آپ نے فرمان جاری کر دیا ہے کہ۔" آپ کو میرے لئے وہ رشتہ پسند نہیں؟" بحیثیت باپ ان کا مقام میرے لئے تمام زندگی ایسا رہا کہ وہ شعلوں میں لپٹے کسی جہاز کے عرشے پر مجھے کھڑے کر دیتے تو میں "کیسا بلانکا" (Casablanca) کی طرح غرق ہو جاتا انہیں سوال کرنے کی مجھے کبھی جسارت نہ ہوتی۔ میری ماں صحیح معنوں میں خاوند کو مجازی خدا سمجھتی تھیں وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کو تیار نہ تھیں۔ بے بسی سے میں نے سب سے بڑے دیالو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اپنا آپ جانماز پہ بچھا دیا۔ میرے لئے یہ شادی کے شوق یا بیقراری سے زیادہ اپنی پہلی محبت' چاہت کو کھو دینے یا پا لینے کا مسئلہ تھا۔ میں نے تو ساری زندگی کسی بچے کا بھی منہ نہ چوما تھا کہ میرے "اَن چھوئے" لبوں کا پہلا پیار اس لڑکی کی امانت ہے جو کبھی میری زندگی کی ساتھی بنے گی۔ سینہ چاک یہ عرضیاں دکھاتا' آدھی آدھی رات رو رو آسمان کے ناقوس بجاتا رہا لیکن وہاں سے کوئی ابر رحمت تو کیا ایک بوند بھی نہ برسی۔ اللہ میاں ان دنوں میری بہت سی باتیں مان لیا کرتا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ اس معاملے میں اس نے بھی میری ایک نہ سنی۔

بھارت پاکستان جنگ ختم ہو چکی تھی۔ میرے ریسرچ وائیوا(Research Viva) کے لئے طلبی ہو گئی تو مایوس میں اپنی صلیب کندھے پہ اٹھائے لاہور چلا آیا۔ امتحان ہو گیا۔ قوی یقین تھا کہ پاس بھی ہو جاؤں گا لیکن اس دوران دل کے ہزار نہیں تو پچاس ساٹھ ٹکڑے ضرور ہو چکے تھے اور جی اتنا اچٹ گیا تھا کہ میں نے سوچا سب کچھ چھوڑ چھاڑ اتنی دور چلا جاؤں جو سب کو میری قدر و قیمت کا احساس ہو جائے۔ پڑھا لکھا نہ ہوتا تو جوگیا کپڑے پہن کر شاید ہمالے کی کسی گپھا کا رخ کرتا۔ لیکن عقل و خرد نے میرے دل کے وہ ٹکڑے یورپ' امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی یونیورسٹیوں کو بھیج دیئے وہ بہت قدردان لوگ ہیں۔ ٹوٹی ہوئی ٹھیکری کو بھی ہلاکو خان کے حقے کی چلم مان کر خرید لے جاتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے جرمنی نے مجھے قبول کر لیا۔ پڑھائی لکھائی انہی کی زبان میں کرنی تھی اسے سیکھنے مزنگ اڈہ لاہور کے پاس جرمن کلچر سنٹر میں داخلہ لے لیا۔ پتہ چلا پہلے پشتو سیکھی ہوتی تو بہت آسانی رہتی کیونکہ دونوں زبانیں دور کی بہنیں ہیں۔ ابھی شاید دو ہی ماہ میں ٹوٹا پھوٹا " شلے واثر اِس تھیف۔۔۔ساکن پانی گہرا ہوتا ہے۔۔۔" اور " دانکے شوئن۔۔۔بہت شکریہ۔۔۔" وغیرہ کہنا شروع کیا تھا کہ کینیڈا مونٹریال کی میکگل یونیورسٹی نے مجھے پی ایچ ڈی بائیو کیمسٹری کے لئے نہ صرف داخلہ بلکہ پارٹ ٹائم ملازمت بھی دے دی۔ فل برائٹ ہیز (Fulbright Hays) سکالرشپ کے لئے میری سفارشات بہت مضبوط تھیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر چوہدری سلطان احمد (ہیڈ آف باٹنی ڈیپارٹمنٹ) ' ڈاکٹر احسن الاسلام (ہیڈ آف زوالوجی ڈیپارٹمنٹ) اور ڈاکٹر عظیم (ہیڈ آف کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ) کے دستِ شفقت میرے سر پہ تھے۔

میری پرواز کا رخ بدل گیا۔ جرمنی تو بیچ اکھاڑے میں تھا۔ کبھی بھی' کوئی رشتہ دار ہی ارد گرد سے خیر خیریت جاننے وارد ہو سکتا تھا۔ کینیڈا دنیا کے آخری کونے پر برف میں دھنسا ہوا تھا۔ بیچ میں بحر اوقیانوس کا تصور ہی کرو تو تھکن ہونے لگتی ہے۔ وہاں کون آئے گا؟ بیٹھ کے میری

صورت دیکھنے کو ترسا کریں۔ داخلے کی خبر سن کر ماں کو ہول پڑنے لگے۔ ابا جان کا چہرہ بھی کچھ اتر سا گیا لیکن مجال ہے جو زبان سے دل ڈولنے کا کبھی اعتراف کریں۔ آنکھوں پہ کالے شیشوں کی عینک چڑھا کر اسی شام مجھے انار کلی بازار لے گئے اور سات آٹھ گرم سوٹ لے کر سلنے کے لئے دے دیئے۔ قمیضیں' گرم جرابیں' دستانے' ٹوپیاں وغیرہ بھی لے دیں۔ میں زیادہ خرچا بچانے کے لئے کہیں کنی کترانے کی کوشش کرتا تو وہ اپنی سوجھ بوجھ کے حساب سے لے لیتے۔ ماں ساتھ تو تھی لیکن ہپناٹائزڈ سی۔ انہیں خاموشی سے میرا چہرہ پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ان تیاریوں میں چند ہی روز گذرے تھے کہ صادق پبلک سکول بہاولپور میں میرے ایک لیکچرار دوست ذکا اللہ کا بلاتو صبح ارجنٹ بلاوا آیا۔ آدھی رات وہاں پہنچا تو پتہ چلا اسے پاکستان ایر فورس میں ملازمت مل گئی تھی اور چونکہ اس کی کیمبرج کلاسز کے امتحانات قریب تھے۔ اس لئے ایک اچھے متبادل ٹیچر کا بندوبست کئے بغیر وہ یہاں سے 'ریلیز' نہ ہو سکتا تھا۔ اسے یہ علم تھا کہ میں فارغ ہوں چنانچہ مجھے بلالیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں تو خود تین چار ماہ تک کینیڈا جانے کی تیاریوں میں ہوں۔ اب الجھن بن گئی کہ دوست تھا اس کی مدد کرنی بھی ضروری تھی ساتھ ہی ڈر بھی لگ رہا تھا کہ اس کی جگہ میں ہی نہ پھنسا رہ جاؤں؟ یوں صبح ہو گئی۔ دن کے اجالے میں سکول دیکھا۔ خوبصورت لان' کھیلوں کے میدان اور اجلی فضا' گوشے گوشے سے پھوٹتی علم کی خوشبو اور بے مثال نظم و ضبط سے اپنے چھوٹے چھوٹے سینوں کو سیراب کرتے وہ طالب علم۔ میری نگاہ و دلیل میں پاکستان کا کوئی دوسرا اسکول اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ یہاں سر صادق محمد خان کی نوابی شان و تمکنت اور مخدوم زادہ سید حسن محمود کے خوابوں کا امتزاج وقت کے سینے پہ ٹھہرے ملے۔ اس سارے ماحول میں زندگی کی دھڑکن جگانے والے پرنسپل خان انور سکندر خان' وائس پرنسپل ابو ظفر حنیف اور برسر جناب جیوانندم سے چھوٹی سی ملاقات ہوئی۔ علم بانٹنے والے درجنوں چہرے دیکھے' کچھ سے تعارف بھی ہوا۔ انٹرویو کے لئے بلایا گیا تو معلوم ہوا کہ ذکا اللہ کی ذکاوت نے اکیلے مجھے ہی

نہیں دو مزید حضرات کو بھی اسی آسامی کے لئے بلا رکھا ہے۔ بہت غصہ آیا کہ پہلے بتا دیتا تو میں اپنا یہاں تک آنا محض 'سیر سپاٹا' سمجھ کر خود ہی کنی کھا جاتا۔ لیکن یہ مقابلہ بازی کروا کے تو اس نے میری عزت داؤ پہ لگوا دی۔ ایسے مواقع کے لئے ہی میں نے "چڑھ جا بیٹا سولی پہ رام بھلی کرے گا" کا محاورہ سیکھا تھا۔ چنانچہ انٹرویو ہوا اور اچھا ہو گیا۔ حتمی فیصلہ چونکہ بچوں نے کرنا تھا اس لئے ہمیں بلا تیاری کیمبرج کلاس میں لیکچر دینے کے لئے کہا گیا۔ دوسرے دونوں حضرات سٹپٹائے لیکن میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے آخری سال بی ایس سی (B.Sc.) پریکٹیکل کلاسز کو لیکچر دینے کی ٹریننگ پوری کر چکا تھا اور کسی بھی قیمت پر اپنے اُس علمی گہوارے کو گہن نہ لگا سکتا تھا۔ لہٰذا بہت اعتماد کے ساتھ لیکچر دیا۔ کچھ انتظار کے بعد شگوفہ پھوٹا کہ میں سچ مچ سیلیکٹ ہو گیا ہوں۔ آنے جانے کا کرایہ مع طعام دے کر مجھے دو دن میں ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا پروانہ تھما دیا گیا۔ ذکا اللہ ایسا کھسکا کہ پھر کبھی اس سے ملنا نہیں ہوا۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنا "اپائنٹمنٹ لیٹر" ابا جان کو دکھایا۔ ابھی چند لمحے پہلے تک تو وہ کچھ بوڑھے بوڑھے نظر آ رہے تھے۔ اب ان کا کالے شیشوں والا چشمہ اتر گیا اور یوں لگا جیسے چہرے کی لکیروں کو پل بھر میں کسی بہار آفریں امرت دھارے نے دھو ڈالا ہو۔ میری بینائی چھ بٹا چھ تھی اور میں ان کالے شیشوں کے اندر سے بھی ان کی آنکھوں میں کہرے کی گہرائی ناپ لیتا تھا۔ اب ان شفاف دمکتی آنکھوں میں مجھے ایک گچھا مچھا سا گونگا سوال نظر آ گیا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں۔ "تو پھر اب کینیڈا کا پروگرام کینسل ہے نا۔۔۔؟؟" ان سے اپنے دل کی لگی پوچھ سکنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اور اپنے منہ سے کچھ کہتے ان کی آن بان اور شان میں کسر ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے چار سو بیسی کھیلی اور اپنی آنکھوں میں سوالیہ پلیٹ چڑھا دی۔۔۔ "پھر وزیر آباد والی گوگی کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔؟؟" لیکن شاید ان میں جوانی کے اشارے کنائے پڑھنے والی صلاحیت موقوف ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے میرا منہ

تکتے رہے۔ ہار کر خود میں نے ہی کہہ دیا۔ "روزگار مل گیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں فی الحال کینیڈا جانا درست ہو گا یا نہیں۔۔۔"

میں کیمبلپور سے لاہور آیا تو وہ راولپنڈی عدالت سے فارغ ہو کر پیچھے آن پہنچے کہ "سوچا تمہیں ٹرین پہ رخصت کر آتا ہوں۔۔۔" ایک بس سے آئے اور مجھے الوداع کہہ کر دوسری بس سے واپس کیمبلپور لوٹ گئے۔ باپ کی اس عظمت کو سلام۔ میں ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ پہلے ہی روز مجھے میرے رخصت ہونے والے محسن کا فلیٹ اور اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر کا عہدہ مل گیا۔ میں نے ابا جان کو تفصیل لکھی تو خط کے جواب میں وہ خود چلے آئے۔ خان صاحب سے ان کی چند منٹ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے پڑھانے کی کچھ تعریف کر دی اور ابا جی نے فلیٹ میں آکر سکول اور ملازمت کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے کہ ایسا موقع تو بہت قسمت والوں کو ملتا ہے۔ میں بین السطور انکی اصل بات کو سمجھ رہا تھا چنانچہ ایک روز سوچ سوچ کر میں نے بھی یہ باور کر لیا کہ ذکااللہ کی غیر متوقع ٹیلیگرام' بلا سوچے سمجھے میرا یہاں چلے آنا اور پھر کسی بھی بہانے میر اسلیکٹ ہو جانا شاید قدرت کا اشارہ ہیں کہ مجھے فی الحال یہیں رک جانا چاہیئے۔ ابا جی نے کوئی تذکرہ' کوئی وعدہ وعید نہیں کیا بس میری ہی یادِ رفتگاں میں اک دھندلی سی لو کپکپائی۔ میں نے سوچا۔ "کیا خبر یہی پگڈنڈی گھوم پھر کر وزیر آباد کی گوگی تک جاتی ہو۔۔۔؟ محلِ معجزہ نہ سہی پھر بھی اک موہوم سا چانس لینے میں کیا حرج ہے؟۔۔۔" چنانچہ اگلے روز میں نے میکگل یونیورسٹی کینیڈا میں اپنی مجبوریوں سے لبریز عرضداشت بھیج دی۔

"چند نامساعد حالات کے سبب اس سال میں اپنی تعلیم کے لئے نہیں پہنچ سکتا۔ اگر اس کی تجدید اگلے برس کے لئے کر دی جائے تو میں بہت مشکور ہوں گا۔۔۔" وہ بھی کیا کمال علم دوست لوگ ہیں کہ انہوں نے سچ مچ اگلے برس کے لئے میرے داخلے کی تجدید کر دی تھی۔

زندگی نے جلد ہی نئی روشوں پہ چلنا' دوڑنا سیکھ لیا۔ صبح کیمبرج کلاسیں پڑھانا، شام کو کھیل کے میدان میں بچوں کے کردار کی تعمیر کرنا اور رات کو اپنے اگلے لیکچرز کی تیاری کرنا۔ نئے دوستوں' ساتھی اساتذہ کے ساتھ وقت گذاری ہوتی تو مجھے مشرقی اقوام کی کم مائیگی کا بہت احساس ہوتا۔ مغرب میں لڑکے جوان ہوتے ہیں تو درختوں سے سیب مالٹے گرنے پر غور کرتے کرتے نیوٹن (Newton) یا ایٹمی توانائی کا فارمولا بتانے والے البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) بن جاتے ہیں لیکن مشرقی جوانی آنکھ کھولتے ہی دل میں گھونسلا اور پوجا پاٹھ کے لئے اس میں ایک صنم بٹھا لیتی ہے۔ اس لئے ہماری دنیا میں صرف سوہنی ماہیوال' ہیر رانجھے اور وارث شاہ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اُدھر وہ لوگ سمندروں کو کھنگالتے اور ہمارے ہی ملکوں میں سر بہ فلک چوٹیوں کو ایورسٹ کا نام دے جاتے ہیں۔ اِدھر ہم بے تیغ لڑنے والے عاشق مزاج پروانے صرف دنیا کی آبادی بڑھائے جاتے ہیں۔ میرا خمیر بھی مشرقی تھا۔ لہٰذا میرے سینے میں شادیانے بجے نہ مندر سجا' البتہ موہنجوڈارو کا اک صنم خانہ ضرور آباد ہو گیا تھا۔ رات سونے لگتا تو میرے اندر کا محکمہ آثارِ قدیمہ چھوٹی چھوٹی قندیلیں مشعلیں جلا دیتا۔ ایک لڑکی ٹی کوزی کی طرح دوپٹہ سر پہ چڑھائے کسی نہ کسی روزن میں آن بیٹھتی۔ اور میرے اندر اک کسک جگا دیتی۔ بالکل انہی دنوں چھوٹی بہن نرجس نے انٹر کالجیٹ مقابلے کے لئے پھر افسانہ مانگا۔ میرا احساس ابھی تک جھلسا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے فرضی کرداروں کی بجائے خود اپنی اور عصمت شہزادی کی کہانی لکھ ڈالی۔ کچھ سچے' کچھ مفروضہ واقعات کے تانے بانے میں پرو کر میں نے اپنی تمام چاہتیں پوری صداقتوں کے ساتھ گوندھ ڈالیں۔ میرے ایسے افسانے متعدد بار سچ کی پیشگوئی بن کر میرے سامنے آتے رہے ہیں۔ اس لئے میں نے اس "چنبے کی کلی" کو اپنا نوشتۂ تقدیر بنا لیا۔ اس افسانے نے بھی مقابلہ مار لیا۔ تعریفیں ہوئیں' تبصرے لکھے گئے لیکن گھر میں میرے دل کی لگی جان کر بھی کسی نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ یوں جیسے سب نے میرے خلاف سازشی محاذ قائم کر لیا

ہو۔ کسی نے بھی دوبارہ گوگی کا نام لیا نہ میری شادی خانہ آبادی کا۔ اس بار میں پورا پورا ہی مایوس ہو گیا۔ دھیرے دھیرے گذرتے لمحوں کی قدغن بھی اس تصویر پہ جمنے لگی۔ میں روز بروز اپنی تدریسی مصروفیات میں بھی دھنستا جا رہا تھا۔ ان جوار بھاٹوں سے باہر نکلنے کا اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا۔ " حصولِ تعلیم کے لئے کوئی سکول' کوئی فرد تیرا راستہ نہیں روکے گا۔ ہوش کر بندے! اپنی زندگی بنا۔ نیاگرا فالز کی راہ لگ۔ وہاں بھی تو میپل(Maple) کے سبز و کتھئی رنگ پتوں سے جھانکتی کوئی شبنمی ایما' جیول یا نتالیا تیری راہ تک رہی ہو گی۔۔۔" سوچوں کی مہکار پھوٹی۔ شوقِ آوارگی نے بام پہ انگڑائی لی تو میں نے پھر سے اپنے بھاگنے والے جوتوں کے تسمے کسنے شروع کر دیئے۔

گھر سے خط آتے جاتے رہتے تھے۔ وہاں بھولے بسرے اور کچھ نئے رشتہ داروں کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ ہمارے متوسط گھروں کی روایت ہے کہ جیسے ہی کوئی لڑکا پڑھ لکھ کر ملازمت پہ لگا اس پر حق شفہ کی عرضیاں لگنے لگتی ہیں۔ ان دعویداروں کی اکثریت کو میک اپ کرنا' فیشن کرنا' اڑوس پڑوس کی جاسوسی کرنا' سینکڑوں ہزاروں گانوں کی منوں بھاری لغت یا بھارتی فلمی ستاروں کی زندگی سے متعلق وہ باتیں بھی جو کبھی کسی اخبار' رسالے میں شائع نہیں ہوئیں' ازبر ہوں گی۔ لیکن چائے' انڈا بنانے کا طریقہ معلوم نہیں۔ اپنے ملک کے صدر' وزیر اعظم کا نام معلوم نہیں۔ خود سوئی میں دھاگہ ڈالنا نہیں آتا لیکن ساٹھ سالہ ڈیزائنر درزی کو ڈیزائننگ (Designing) سکھاتی ہیں۔ ان قبضہ گروپوں میں خصوصا" صدقے واری ہونے والی ماؤں سے میری جان جاتی تھی چنانچہ چھٹیوں میں بھی سمر کیمپ" کا بہانہ کر کے میں ان کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ بلکہ خاندان میں شادی سے کلیتہ" انکار کر دیا۔ مرغا جوان ہو جائے تو دیوار پہ چڑھ کر بانگ دینے لگتا ہے۔ یوں اڑوس پڑوس کی مرغیوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ تاڑ لگایا کوئی شکاری ہاتھ اُسے دیوار سے یوں اچک لے جاتا ہے کہ خود اسے بھی خبر نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

مجھے گجرات کی اک " میمی " کی نظر کھا گئی۔ دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر وہ دھیرے دھیرے انگلیاں کھولتی۔ پھر ان کی چلمن سے اس کی شوخ شربتی آنکھیں جھلملاتیں اور وہ احتجاج کرتی۔ "ہائے ایسے نہیں دیکھیں نا۔۔۔!!!" اور میرا جی چاہتا چاند تارے' کہکشاں سب اس کی "ہائے" پر وار دوں۔ مجھے بھی بہت شوق تھا عشق لڑانے کا' رات بھر جاگ کر کسی کی یاد میں آہیں بھرنے کا۔ اور عاشقی کے اس سنہرے بچھو نے مجھے سچ مچ ڈس لیا۔ سوہنی نے مغلیہ شہزادے مہینوال کی عقل و دانش کی ساری بتیاں گل کر دی تھیں۔ میری مت گجرات کی اس میمی (دوبار Me Me) نے مار دی۔ بھینسیں چرانے اور کچے گھڑوں پر دریا میں سیر سپاٹے کرنے کا دور گذر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ " بہاولپور مجھے پسند نہیں۔ ادھر کہیں لاہور' اسلام آباد میں ملازمت کی کوشش کرونا۔۔!!" کہتے ہیں کہ کسی کی شامت آنی ہو تو اس کے سارے الٹے کام فٹافٹ کامیابی سے ہمکنار ہونے لگتے ہیں۔ یوں جیسے پلیٹ میں سجا کر مجھے اسلام آباد میں نئی ملازمت مل گئی۔ بزرگوار حافظ شیرازی نے رخِ یار کے تِل پر سمرقند و بخارا وار دیئے تھے۔ میں نے اپنے عشق کی خاطر اس شہر خلوص و احترام بہاولپور اور اس کے بہت پیارے لوگوں کو تیاگ دیا۔ اب پی ایچ ڈی کے لئے کینیڈا جانے کا بتایا۔ تو بولی۔ "قطب شمالی پہ کوئی یونیورسٹی نہیں تھی کیا؟ آپ کو پڑھائی کے لئے دین دنیا سے باہر یہی جگہ ملی تھی؟۔ ہائے مجھے تو لندن پسند ہے۔ بھائی جان وہیں ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو مجھے آفر بھی کی ہے کہ آپ جائیداد میں سے اپنا حصہ بیچیں۔ وہ اس سے ہمارے لئے ویزے خرید لیں گے اور ہم ان کے پاس چلے آئیں۔۔۔" یعنی مدعی سست گواہ چست۔ اک میں ہی تھا جسے ان کے منصوبوں کی خبر نہ تھی ورنہ وہ تو میرے قتلے' پکوڑے بنا کر ہضم بھی کر چکے تھے۔ وہ بھائی صاحب اپنی کار میں کپڑوں کے تھان بھر کر لندن کے قصبات میں پھیری لگایا کرتے تھے۔ میں ان کے نقش قدم پر چلتا تو پی ڈبلیو ڈی (پھیری والا ڈاکٹر) ضرور بن جاتا۔ لیکن یہ مجھے قبول نہ تھا اور پھریوں جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے میرے اور اس کے بیچ سارے تانے بانوں میں

گنجل ڈال دیئے۔ حالات کو سنبھالتے سنبھالتے کینیڈا کا پروگرام پھر غارت ہو گیا۔ ہمارے بیچ لگ بھگ دو سو میل کا فاصلہ تھا۔ کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی بات بگڑ جاتی۔ اس لئے میں اسلام آباد کی ملازمت چھوڑ چھاڑ لاہور چلا آیا۔ اس دوران گجرات کی اس سوہنی نے ایک نیا مرغا دبوچ لیا تھا۔ اور اب اسے فرائی کرنے کی تیاری میں تھی۔ میں ہی تھکا ہارا' بے حال' نچے پروں سے اپنا آپ سمیٹتا رہ گیا۔ اکثر سنا کرتے تھے کہ اپنے اعزہ سائے میں لے جا کر مارتے ہیں اب یہ بھی جان لیا کہ غیر دھوپ میں سولی چڑھاتے ہیں اور پانی بھی نہیں پوچھتے۔ رہی سہی جو باقی تھی اس عاشقی میں وہ عزتِ سادات بھی چلی گئی۔

فرہاد بن کر گھر آن بیٹھا تو ماں دروازے کے پردے پیچھے سے میری حالت دیکھ دیکھ رونے لگی۔ زندگی بلا مقصد رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا اس ملک سے ہی دفعان ہو جاؤ۔ میکگل یونیورسٹی مونٹریال کینیڈا کو التوا کے لئے دوبارہ لکھنا مناسب نہیں تھا۔ خیال تھا کہ وہاں پہنچ کر اپنے کاغذاتِ داخلہ پیش کروں تو سامنے پا کر شاید وہ مجھ پر مہربان ہو ہی جائیں۔ میرا شوقِ دشت پیمائی بہت تھا اور بیچ میں چار پانچ ماہ رہتے تھے۔ چنانچہ سارے گھر والوں کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر آبدیدہ چھوڑ کر پشاور آیا۔ سحری بس پہ بیٹھا اور براستہ تورخم و جلال آباد سے پہر کابل پہنچا۔ ایک بار پہلے بھی میں افغانستان میں گھوم پھر چکا تھا۔ افغان حکومت کی پالیسی چاہے جیسی بھی ہو لوگوں کی اکثریت بہت سادہ لوح' بہت مخلص اور بہت انسان دوست ہے۔ میں نے ایک رات دریائے کابل کنارے 'گذشتہ بار والے ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلی سحری پھر بس پکڑی اور قندھار سے ہرات اور پھر یوسف آباد و طیباد کے راستہ ایران میں داخل ہو گیا۔ وہیں سے ایک ماہ کا ویزا لگ گیا۔ ایران کا معاملہ بالکل الٹ ہے۔ ان کی حکومت مشکل وقتوں میں ہمیشہ پاکستان کے ساتھ رہی ہے لیکن عوامی اکثریت پاکستانیوں کے لئے دوستانہ' برادرانہ احساس نہیں رکھتی۔ دراصل ان دونوں قوموں میں صرف خالی پیٹ اور بھرے پیٹ کا فرق ہے۔ دولت کی فراوانی قوموں کے مزاج میں ہمیشہ رعونت کا بیج لگاتی

ہے۔ مشہد میں آستانۂ عالی پہ حاضری دی۔ تہران سے مجھے ترکی کا راستہ لینا تھا۔ میری بہت خواہش تھی کہ ہوائی جہاز چڑھنے سے پہلے یونان' روم اور سپین کی سیاحت کرلوں۔ لیکن آسمانوں کے نیلے گنبد سے اوپر جو سب سے بڑا کارساز ہے اس کی ترنگ ہی الگ ہے۔ جب' جہاں چاہے گاڑیوں کے کانٹے بدل دیتا ہے۔ تہران میں میری دوسری شام تھی۔ سڑکوں کی پیمائش کر کے سرائے لوٹا تو آنگن میں بہت زور و شور سے محفلِ موسیقی چل رہی تھی۔ بھارت سے لگ بھگ بیس پچیس لڑکے وارد ہوئے تھے۔ میں بھی دیوار سے لگے پاکستانی بھائیوں میں کھڑا ہو گیا۔ محفل برخاست ہوئی تو ایک دوسرے سے تعارف کرتے معلوم ہوا کہ میرے علاوہ وہاں ہر کوئی دوبئی۔ ابو دوبئی اور الشارقہ کا مسافر تھا۔ دوبئی کا نام میں نے بارہ سے خریدے ٹرانزسٹر کے غلاف پر پڑھا تھا لیکن باقی دو سے انجان تھا۔ اور یہ تو مجھے بالکل بھی پتہ نہ تھا کہ الف لیلہ ہزار داستان کی طرح یہاں درختوں سے نوٹ جھڑتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہاں پہ اور کیا چیز دیکھنے والی ہے؟ الشارقہ کے تین سناروں نے بتایا۔ "وہاں محمد بن قاسم کا قلعہ ہے۔ وہ اسی راستے انڈیا گیا تھا۔۔۔" نسیم حجازی کی کہانیوں نے مجھے محمد بن قاسم' موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کا عاشق بنا دیا تھا۔ پہلو میں جو کمپاس لگی تھی اس کی سوئی مڑی اور مغرب کی بجائے جنوب کی طرف تھرتھرانے لگی۔ پوچھا 'وہاں کا ویزا کدھر سے ملے گا؟' وہ بولے۔ "ہم میں سے کسی کے پاس بھی ویزا نہیں ہے۔ بندر عباس سے لانچیں جاتی آتی رہتی ہیں۔ ہم تو چھٹی گذار کر ہمیشہ اسی راستے واپس جاتے ہیں۔۔۔" یہ تو ایسے ہی تھا جیسے دفتر لاٹ صاحب سے بس پہ بیٹھے۔ شاہدرہ کی ٹکٹ کٹائی اور مقبرہ جہانگیر ہو آئے۔ اُدھر سے مجھے گھوڑوں کی سرپٹ ٹاپیں اور ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں چنانچہ میں انہی کے ساتھ ترکی' یونان' اٹلی اور سپین سب کو "بائی پاس" کرتا کرمان کے راستہ بندر گاہ عباس پہنچا۔ ٹکٹ لے کر ہم دو دن وہیں سرائے میں پڑے رہے کہ مسافر ابھی پورے نہ تھے۔ تیسری سہ پہر سائرن بجا کر ہمیں کوچ کے لئے سوار ہونے کی خبر دی گئی۔ مناسب جگہ کا

سوال تھا اس لئے سامان اٹھا کر بھاگم بھاگ پہنچے۔ لانچ کا اگلا نوک دار حصہ صرف ماہر ملاحوں اور یا پھر "بنجی جمپ" کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ ہم جیسے ہلکے پیٹ لوگوں کے لئے پیچھے چوڑے ٹب کا ایک کونا صحیح رہتا ہے۔ چنانچہ جگہ پکڑ کر چپ چاپ مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ لگ بھگ سبھی پاکستانی اور بھارتی تھے۔ ڈھیروں پڑھے لکھے اور بحیثیت بھی لگتے تھے۔ لانچ بھرتے بھرتے دن ڈھل گیا۔ تب کہیں سائرن بجا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے سرکتے' ایران کے اس ساحل سے دور ہٹتے' ہم کھلے سمندر میں آ گئے۔ سحری کے قریب شور مچا تو میں نے اٹھ کر دیکھا۔ دور ٹمٹماتی روشنیاں دوڑ رہی تھیں۔ ساروں میں سے ایک نے بتایا کہ ریاست راس الخیمہ کے ساحل پر گاڑیاں جمع ہو رہی ہیں۔ اگلا بھید اس نے نہیں بتایا۔ وہ میں نے کچھ دیر بعد ساحل پہ قدم رکھتے ہی جان لیا۔ کوئی دو درجن سے زیادہ قد آور' جسم اور قوی ہیکل عربوں نے ہمارا سواگت کیا۔ ہمیں گاڑیوں میں ٹھونسا اور دور کسی اجاڑ بیاباں جگہ لے گئے۔ وہاں جنہوں نے انہیں نذرانہ پیش کیا انہیں واپس گاڑیوں میں بٹھا کر وہ نکلتے گئے۔ میں نے بھی خلعت پائی اور تین ساروں والی گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے ڈرائیور نے ہمیں پہنچانا تو شارجہ تھا لیکن عجمان'شارجہ کے سرحدی چوک میں لا حکم دیا کہ اترو ورنہ واپس راس الخیمہ لے جائے گا۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ سامان اٹھایا اور گلی گلی شرطہ' شرطی (Police) سے چھپتے چھپاتے سونا بازار کے قریب ان کے گھر پہنچے۔ مکین بھائی بندوں نے کھانا کھلایا۔ اس روٹی کا خمار ایسا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا لیکن کب میری دیا بتی گل ہو گئی مجھے اس کی خبر ہی نہ رہی۔

شام آنکھ کھلی تو میرے علاوہ باقی پنچھی اڑ چکے تھے۔ ساروں سے پوچھا "یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں اپنی پڑھائی لکھائی بیچ سکوں؟" جواب ملا " ابھی تک تو یہاں کے بازاروں میں اس کھوٹے سکے کی مانگ نہیں ہے لیکن دوبئی بہتر ہے۔ شاید وہاں کسی سکول میں چل جائے۔۔۔" میں نے چھوٹے سنار سے کہا۔ "بس مجھے وہیں چھوڑ آؤ۔ اکیلا گیا تو کہیں پکڑا نہ جاؤں۔۔۔"

پولیس سے آنکھ مچولی کا میرا بالکل موڈ نہ تھا۔ کچھ چلے تھے کہ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔"وہ محمد بن قاسم کا قلعہ ہے۔۔" کوئی آٹھ فٹ اونچی دیوار میں گھرا ایک احاطہ اور دو چھوٹی برجیاں۔ میرا جی چاہا رک کر اپنے آپ پر ہذیانی قہقہے لگاؤں۔سنار واقعی چاندی پہ پانی چڑھا کر اسے سونا بنادیتے ہیں۔ میں کن کے کہنے پر یہاں چلا آیا تھا؟اب تو واپس بھی نہ جاسکتا تھا کہ "جیب میں نہیں دھیلہ اور میاں دیکھنے چلے میلہ" کا معاملہ تھا۔ سوچا "دوبئی میں سفر خرچ کما کر واپس استنبول کی راہ لوں گا۔۔۔"

چھوٹے سنار مجھے 'ڈیرہ' لائے۔ پھر 'ابرا' پار کروایا۔ یہ سارے نام مجھے عجیب لگ رہے تھے لیکن اس وقت ان سے بھی بڑا فکر یہ تھا کہ دن ڈھل رہا تھا اور مجھے ابھی وہ ہاتھ ڈھونڈنا تھا جو میرا ہاتھ تھام لے۔ رفاہ دوبئی میں آج جہاں ہاورڈ جانسن ہوٹل ہے یہیں ایک سِل پہ بٹھا کر میرا وہ راہبر بھی واپس لوٹ گیا۔

XXX

3

اگلے چند روز میں' میں نے دوبئی دریافت کر لیا۔ ریگستان کے سینے پر سجدے میں گرا ہوا۔ شاید تیل نکل آنے پر عالمِ تشکر میں۔ تب اس کے نام کے آگے "ٹروشئیل سٹیٹس"(Trucial States) بھی لکھا جاتا تھا۔ مقامی لوگ بہت سادہ' حکمران انسانیت پرست' قوانین سخت اور سڑکیں معدودہ تھیں۔ سمندر کی ایک شاخ نے نیلگوں پانی کی خوبصورت نہر' دریااور جھیل بن کر اسے دو حصوں " ڈیرہ دوبئی" اور "بر دوبئی" میں بانٹ رکھا تھا۔ " ڈیرہ " محنت کش خارجی لوگوں کی گہما گہمی سے بسا تھا جبکہ " بر دوبئی " کا مختصر سا سینہ کسی "ہل اسٹیشن" کی طرح بے حد پر سکون تھا۔ صاف' شفاف فضا میں آدمی کو ضابطوں کا پابند کرتا یہ چھوٹا سا خوبصورت شہر تب بھی "ٹروشئیل سٹیٹس" کا "جیول اِن دی کراؤن" تھا جہاں دنیا کے مشہور بینک اور بڑی بڑی کمپنیاں اپنا کاروبار پھیلا رہی تھیں۔ صرف ایک ریال میں کلینک یا ہسپتال سے دوائیوں سمیت طبی سہولتیں میسر تھیں اور اتنے میں ہی غریب آدمی پیٹ بھر کھانا بھی کھا سکتا تھا۔ چند اچھے سکول اور درجنوں ٹیوشن ماسٹر بھی موجود تھے۔ مزدور چھ ریال روزانہ لیتا تھا اور کلرک تقریباً" دس بارہ ریال سے شروع ہوتا تھا۔" دریا" کے دونوں پار "آنہ ابرا" اسٹیشن کے بیچ سارا دن لانچوں کے ذریعہ کام کاج پہ جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ عوامی اُڑان کے لئے ایر پورٹ تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی اور بندر گاہ "شیخ راشد پورٹ" کے لئے " کاسٹین " کمپنی کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ لوگ کراچی بمبئی کا بحری سفر کرتے تھے۔ بحری جہاز ساحل سے میلوں دور سمندر میں لنگر انداز ہوتے تھے اور لانچوں کے ذریعے ان تک پہنچا جاتا تھا۔ عمارات پستہ اور آدمی کا قد اتنا بڑا ہوتا تھا کہ بیمار ہو جائے تو شہر بھر میں پھیلے دوست احباب کام کاج سے فارغ ہوتے

ہی خبر گیری کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ پڑھے لکھے آدمی کی تب یہاں کوئی قدر نہ تھی۔ میں" بر دبئی" میں رہتا تھا۔ ایک شام دو جاننے والوں کے ساتھ "برٹش ایمبیسی" کے سامنے سے چلا آرہا تھا کہ ایک "لینڈ روور" پاس آن رکی۔ کھڑکی میں سے مقامی عربی نے پوچھا کہ ہم میں کوئی "میسن' کارپینٹر' پلمبر یا الیکٹریشن" ہے۔ میرا ایک ہمراہی کارپینٹر تھا اور دوسرا الیکٹریشن۔ وہ دونوں کو بٹھا کر لے گیا۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا " اے پڑھائی تیری دُہائی ہے۔۔۔" اور اباجی کو یاد کیا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ " پڑھوگے' لکھوگے' بنو گے نواب" لیکن یہاں معاملہ الٹا تھا" پڑھوگے' لکھوگے' تو ہوگے خراب" ۔

کینیڈا کا رخ کرنے کے لئے مجھے اپنا سفر خرچ کمانا تھا۔ اور میں جتنے بھی دستی کام جانتا تھا ان میں سے کوئی بھی یہاں میرے کام نہ آسکا۔ میں کمرشل فوٹو گرافی کے ہر شعبے کا تجربہ رکھتا تھا لیکن کسی نے مجھے گھاس نہ ڈالا۔ سنیما بینرز اور مجسمہ سازی جانتا تھا لیکن یہاں ان فنون کا تب رواج تھا اور نہ اب ہے۔ ستار بجانی جانتا تھا۔ یہاں اس کے قدردان ندارد۔ اردو انگریزی افسانے کہانیاں شائع کرنے والے رسالے تو کیا' یہاں پر مقامی اخبار تک نہ تھا۔ چنانچہ اپنے یہ تمام شوق وہنر تہہ کر کے میں نے سوٹ کیس میں رکھے۔ صبح بینکوں اور دفتروں میں اپنی عرضیاں بانٹتا۔ دو ٹیوشنز ملی تھیں دوپہر انہیں پڑھاتا۔ اور شام فراغت میں گھر سے چند قدم دور "رفاہ' شندغا" ساحل پہ گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ پرانی یادوں سے روح کے تار ابھی تک جڑے تھے انہیں چھوٹی چھوٹی سیپوں' گھونگوں اور کنکریوں میں پرو کر سمندر کی گود میں پھینکتا رہتا۔ غوطانی میں آدمی کی مٹی کا خمیر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پیوند کی تلاش اسے دشت و دریا' کوہسار و صحرا نورد بنا دیتی ہے۔ لیکن میرے قدم دوبئی کے ریگزاروں نے جکڑ لئے تھے۔ گھر پہ اپنا احوال بتاتا تو اگلے روز ہی میرے پاؤں تلے "سکیٹس" فٹ کروا دیتے۔ لیکن اپنے آپ سے ناراضگی کے باوجود میں خود اعتمادی سے جینا چاہتا تھا۔ پانچ ماہ گذر گئے۔ تب گجرات کے ایک ڈسپنسر سلطان صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر دوبئی واٹر سپلائی کمپنی میں سیالکوٹ کے منیجر

شفقت صاحب کے پاس لے گئے اور دس ریال روزانہ پر مجھے تپتی ریتلی گلیوں میں اپنی تعلیم روندنے کا کام مل گیا۔ یوں چینی ضرب المثل۔

A million miles journey also starts with a first step.

کے مصداق میرا سفر شروع ہو گیا۔ دس بارہ روز بعد پھر طلبی ہوئی اور مجھے ٹائم کیپر کا آفس سونپ دیا گیا۔ میری اپنی لائین نہ تھی لیکن میں نے سوچا" میں نے کون سا یہاں مستقل بسیرا کرنا ہے۔ بس اتنا ہی کہ زادِ راہ تو کسی طور کما پائے مچھندر"۔ اسی دوران کرسمس کی مبارکباد دینے اسٹیٹ وریذڈینٹ انجینئر مسٹر ٹلک کے بنگلے گیا تو پتہ چلا کہ کمپنی کی "واٹر ٹیسٹنگ لیبارٹری" بھی ہے۔ جس میں کوئی اکلوتی لبنانی مادام کام کرتی تھی۔ میں بنیادی طور پر ان سارے امور کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس لئے اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔ انہوں نے حامی بھر لی۔ میرا تجربہ ہے کہ انگریز صرف ملک ہڑپ کرنے کے لئے معاہدوں سے منحرف ہوتا ہے لیکن اپنی عملداری میں صرف بہلانے والا وعدہ نہیں کرتا۔

زندگی اک ڈگر پہ لگی تھی کہ انڈیا پاکستان 1971 کی جنگ لگ گئی۔ پاکستان میں مشرق و مغرب دونوں طرف کے گدھ سیاست دانوں نے ذاتی طاقت کے حصول کی خاطر ملک کو تباہی کے منہ میں دھکیل دیا۔ بڑے جرنیل اپنے قحبہ خانوں میں موج مستی کرتے رہے اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ اس کے باوجود بچے کھچے پاکستان کے ہر گلی کوچے میں نیرو کی بانسری پر " ہے جمالو" کا سیاسی دھمال" میک می اے کنگ' میک می اے کنگ۔۔۔" جاری رہا۔ قوم و ملک اک عجب دورِ ابتلا میں مبتلا تھے۔ جان' مال' آبرو کچھ بھی محفوظ نہ رہا۔ مہنگائی اور بے روزگاری قوم کے نوجوانوں کو جرائم کی طرف دھکیل رہی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی افتخار کو بھی گھارو پیپر ملز کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ میں نے اپنے فرائضِ منصبی پہچانتے ہوئے اسے دوبئی کا ویزا بھیج دیا۔ ایسے میں میرے گھر والوں کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ اس کی شادی رچادی۔ میں نے سوچا شاید حضرت کو زنجیر ڈالنی ضروری سمجھی ہو گی۔ بہر کیف میں سب سے

بڑا بیٹا تھا اس لئے مجھے بھی جانا پڑا۔ تقریباً" ڈیڑھ سال بعد ماں کی شکل دیکھی۔ ڈری ڈری سی' سہمی ہوئی' یوں جیسے ذرا ہاتھ لگایا تو ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ پتہ چلا میرا دکھ اس نے اپنے دل میں ایسے بسایا کہ چھپ چھپ' رو رو کر اپنی بائیں آنکھ کی بینائی کھو ڈالی۔ ان حالات میں ابا جی کو ان پہ خوشیوں کی برسات کرنے کا خیال آیا۔ میں دور تھا اور افتخار ان کی مٹھی میں۔ کسی کو پوچھے بتائے بغیر خالہ کے گھر رشتہ پکا کر آئے حالانکہ بھائی اور ماں کی پسند کوئی اور تھی۔ پرانے زمانوں کے مرد زبان کے بڑے پکے ہوتے تھے اس لئے کوئی ان کی راہ میں روڑہ اٹکانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ اور خود پولیس بہادر کے گھروں میں نافرمانی ہونے لگی تو باہر وہ عوام کے ریوڑ کیسے باندھیں گے؟ چنانچہ دھوم دھڑکے سے " وِیر" میرا گھوڑی چڑھ گیا۔ پھر دعوتوں رونق' ہنگاموں کا سلسلہ چار دن ہی چلا تھا کہ آٹھ' سات' چھ کے حساب سے واپسی کے دن گنے جانے لگے۔ ماں مجھ سے اور میں ماں سے منہ چھپانے لگا۔ کیا کرتا' میرا نصیب ہی ایسا تھا۔ پہلے میں اپنی جدائی کا درد دے آیا تھا۔ اب اس کا دوسرا بیٹا بھی چھین لایا۔ اسے دوبئی ایر پورٹ پر کار گو آفیسر ملازم کروا دیا۔ چند ماہ میں اپنی مثالی محنت سے وہ شفٹ انچارج ہو گیا۔ اتنے میں ٹیلیگرام آئی۔ " ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ آکر آخری بار ماں کی زیارت کر لو۔۔۔" میرے سینے میں دل پھڑکا کہ ماں ہمارے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ بھاگ دوڑ کی اور اسی شام پہنچ گئے۔ پنجاب کے سب سے بڑے نیورو فزیشن گھر سے نکل کر جا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے معجزے کے لئے دعائیں مانگنے کا کہا۔ ڈیوڑھی سے اندر گذرتے ابا جان نے میرا راستہ روک لیا۔

"تمہاری ماں ٹوٹا پھوٹا بولتی ہے جس کی شاید تمہیں سمجھ نہ آئے لیکن تم سر ہلاتے رہنا جیسے سب سمجھ رہے ہو۔" ان کا یہ پولیس آرڈر خود سسک رہا تھا۔

"اور تم شادی کر دیا نہیں لیکن وہ تمہیں اس کے لئے کہے تو بس انکار نہ کرنا۔"

بھائی موقع پا کر مجھ سے پہلے ماں کا پیار لینے کھسک گیا تھا۔ میں اباجی کو تسلی دے کر کمرے میں داخل ہوا توماں کی نظریں دروازے پہ لگی تھیں اور چہرے پر زلزلوں کے آثار تھے۔ میں نے بستر پہ ان کا لرزاں ہاتھ اٹھا کر خود ہی اپنے سر پہ رکھ لیا۔ تب بے حد ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور شکستہ لہجے میں وہ بولیں۔

"میں نے تماری سادی اُدر کنی ہے۔ اُدر زیر اباد میں گوگی کے ساتھ۔۔۔"

ماں کا ہاتھ سر پہ ہی تھامے میں جھکا اور چارپائی کے نیچے سے ان کی چپل نکال کر پہننے کے لئے رکھ دی۔ "چلیں۔۔۔" میں نے کہا۔

"کہاں۔۔۔" وہ کچھ سمجھ نہ پائیں۔

"گوگی کے پاس۔۔۔" میں نے بہت سکون سے کہا۔ "اسے' ابھی لے کر آتے ہیں۔"

اور پھر معجزہ ہو گیا۔ ماں یوں بے ساختہ ہنسی کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ پھر روز بروز چہرے پہ جینے کی امنگ کھلنے لگی۔ لگ بھگ ایک ہفتہ بعد وہ سہارے سے اٹھنے بیٹھنے لگیں۔ ایک شام اتفاقاً" گورنمنٹ کوارٹروں میں بیاہی گوگی بی بی کی بڑی بہن مسعودہ اور اس کا خاوند ساجد تیمار داری کے لئے آ گئے۔ پتہ چلا کہ ماموں بھی سخت بیمار ہیں اور وہ اگلی شام ان کا پتہ لینے وزیر آباد جا رہے ہیں۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ اباجی نے گورنر راج چھوڑ کر فٹافٹ ایک خط لکھا۔ ان میاں بیوی کو پڑھ کر بھی سنایا اور انہیں وکیل بھی مقرر کر دیا کہ میرے لئے گوگی بی بی کا رشتہ مانگیں۔ انہوں نے بھی کمال دیانتداری سے میرے ماں باپ کا زبانی و تحریری پیغام پہنچایا لیکن ساتھ ہی ساتھ ساجد میاں نے ایک اور کمال کر دکھایا کہ اپنے والدین کی طرف سے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے بھی رشتہ مانگ لیا۔ یعنی ایک انار' دو طلبگار۔ وہ شاید ایف اے' بی اے تھا اور کسی سکول کی بغل میں چھوٹی سی سٹیشنری چلاتا تھا۔ واپسی پہ ساجد اباجی کے لئے پیغام لایا کہ ماموں نے انہیں بلایا ہے۔ وہ صبح وزیر آباد گئے اور شام کو لوٹے تو

بس اتنا بتایا کہ ماموں نے مجھے دوبئ لوٹنے سے پہلے ملنے کی تاکید کی ہے۔ اور یہ کہ مسعودہ بی بی اپنے سسرال میں اس کا رشتہ کروانے کے لئے دھرنا دیئے بیٹھی ہے۔ میں تلملایا۔ کن چکروں میں پھنس گیا تھا میں؟ میری واپسی میں صرف ایک ہفتہ رہتا تھا اور اس گم گشتہ سوئمبر نے ایک بار پھر مجھے لپیٹ لیا تھا۔ جی تو چاہا کہ پرتھوی راج کی طرح چھلانگ مار کر گھوڑے پہ چڑھوں' تلوار نکال سب کو للکار تا سنجوگتا کو پنڈال سے اٹھالاؤں اور ماں کے سپرد کر دوں کہ میرے اگلی بار چھٹی آنے تک اس کو ہانڈی روٹی سکھادو۔ دیس پردیس میں یہ فن بہت کام آتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہو گئی کہ تب گھوڑے تانگوں سے بھی غائب ہونے لگے تھے۔ چنانچہ اگلی صبح بذریعہ بس گیا۔ اپنا بستہ اور چھوٹی بہن نرجس کو ساتھ لے لیا۔ مسعودہ بی بی کو میں نے گھر کے داخلی دروازے پر دھرنا مارے' سر پہ دوہتڑ مارتے اور بین کرتے دیکھا۔

"ہائے!۔۔۔ ساجد مجھے گھر سے نکال دے گا۔ میری ساس (اس کی پھوپھی) نے مجھے کہہ دیا تھا کہ رشتے کی "ہاں" کے بغیر میں ان کے گھر میں قدم نہ رکھوں۔ میرا گھر اجڑ گیا تو تم سب لوگ ذمہ وار ہو گے۔۔۔ ظالمو! کچھ تو شرم کرو۔ حیا کرو۔ اپنی بیٹی کو تباہ کرو گے۔ کسی کا گھر اجاڑنے والے کو اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اللہ سے ڈرو۔۔۔"

وہ 360 ڈگری گھوم کر فائر کرنے والی توپ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ گھوم گیا اور مشین گن کے رِم جھِم کوسنے مجھ پر برسنے لگے۔ چِٹی ان پڑھ' جاہل عورت ایسی ڈرامہ بازی کے علاوہ اور کر کیا سکتی تھی؟ اس کا جادوئی اکسیر نسخہ میرے پاس تھا۔ میں نے رک کر اپنی پٹاری میں سے افسانہ "جنبے کی کلی" نکال چھوٹی بہن کو دیا۔

"یہ گوگی کو دے کر تاکید کرنا کہ جتنی جلد ہو اسے پڑھ لے۔۔۔"

وہ کہانی برسوں پہلے اسی راہ گذر پہ' اسی گھر میں ٹی کوزی کی طرح دوپٹہ اوڑھنے والی "عصمی" کے ساتھ میری چاہتوں کی کہانی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ اگر میرے ان جذبوں سے انجان

تھی تو بھی ایک بار انہیں پڑھ جان لینے کے بعد کوئی اسے زنجیریں بیڑیاں نہ ڈال سکتا تھا۔ ماموں کی طبعیت ذرا سنبھلی تو وہ سہارے سے زنان خانے میں گئے۔ مجھے یقین تھا اس بھولی بسری داستان نے تب تک اُدھر ہر سو دھڑکتے' لگتے تاروں کی دھنک سجادی ہو گی' چاہتوں کا سحر جگادیا ہو گا۔ کچھ دیر بعد اندر سے ماموں کے گرجنے' کڑکنے کی آوازیں سنائی دیں پھر قدرے اکھڑے سانس کے ساتھ واپس لوٹے تو بتایا۔

"میں نے مسعودہ کو کہہ دیا ہے وہ تمہیں گھر سے نکالتے ہیں تو نکال دیں۔ ساجد طلاق دیتا ہے تو کل کی بجائے آج دے دے۔۔۔" وہ ریٹائر ہو چکے تھے لیکن شیر شاہ سوری روڈ کے جرنیل کے لہجے میں شعلے کی لپک اب تک باقی تھی۔ آئی ڈونٹ کیئر۔۔۔" انگریزی زبان کے انہیں تقریباً" درجن بھر الفاظ ہی آتے تھے لیکن ان کا استعمال وہ بہت موثر طریقے سے کرتے تھے۔" نیور مائینڈ۔۔۔" وہ غصے میں لرزتے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ "پرسوں 24 اگست جمعہ ہے۔ باپ سے کہو نکاح خواں اور بس لے کر آ جاؤ اور میری زندگی کے رہتے گوگی کو لے جاؤ۔ وہ گریجویٹ ہے اسے بھی دوبئی کے کسی سکول میں لگوا دینا۔۔۔"

آدھ گھنٹے بعد ہم واپس لاہور کو چلے تو دروازے پر سے طلاقوں والی دوکان اٹھ چکی تھی۔ رُک کر میں نے چند لمحے اس گھر کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی تھڑا اور وہی برگد کا پیڑ۔ البتہ اس پہ حقہ گڑگڑاتے بابا نورا آٹھ سال سے کچھ زیادہ ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ دوبئی میں بذریعہ خطوط مجھے اس رشتے کی تجدید کے لئے بارہا کہا پوچھا گیا لیکن میں کچھ یوں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ پلٹ کر ادھر دیکھا بھی نہیں۔ اس دوران گوگی بی بی کے حسن و کمالات کے چرچے سن کر بہت سے ہاتھ درمالائیں لئے آئے اور مایوس چلے گئے ہوں گے۔ لیکن خدا جانے کیوں' اور کیسے' وہ بلکھو مندر کے سنگھاسن پر پوری لگن سے استغراق میں ڈوبی رہی۔ شاید

اسے اعتماد و یقین تھا کہ آٹھ برس پہلے میں جو ادھورے خواب یہاں بکھیر گیا تھا انہیں چننے مجھے پھر آنا ہی ہو گا۔ شاید اس کی لوح پہ لکھا کوئی فیصلہ میرے خمیر میں بھی گندھ گیا تھا کہ دیومالائی کہانیوں کی طرح دور دیش سے ایک روز پھر مجھے اس بھولی بسری' گم گشتہ راہ گذر پہ لوٹنا ہے۔ اور "سنو وائٹ" کی طرح اس شہزادی کو خود میری ہی کہانی "چنبے کی کلی" سے جگا کر دھڑکتے وجود کے ساتھ لے جانا ہے۔

گھر پہنچ کر میں نے رپورٹ کہہ سنائی۔ ابا جی نے دو گھنٹے میں اس صبح کے سارے انتظامات مکمل کر لئے۔ میں تمام وقت ماں کی کیفیات پڑھتا رہا۔ اک عجب سی خوشی اور اطمینان ان کے چہرے پہ نور بن کے چھا گئی تھی۔ اس کی ٹھنڈک دھیرے سے میرے دل میں بھی اتری اور پلو پھیلا کر مجھ سے اپنا حق مانگنے لگی۔ تبھی اس رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور عصمی کے علاوہ ایک ایک کر کے اپنے بیتے کل میں کھلنے والی تمام یادوں اور سوچ کے سبھی روزن' سبھی جھروکے بند کر دیئے۔ اس کہانی کا منطقی انجام بالآخر یہی تھا۔ میں خود ہی اپنا دشمن بنا اپنے زخم کھرچتا رہا تھا۔

اگلی رات گھر کے سارے افراد سو چکے تھے صرف میں جاگ رہا تھا۔ میرے کمرے کے گلی میں کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھولا تو سامنے ثریا بی بی' منظور شاہ اور ایک ٹرک ڈرائیور نما چار پانچ فٹ پھیر والا آدمی تھا۔ ثریا بی بی کو میں تقریباً" چودہ پندرہ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ اپنی شادی پہ وہ اجلی صبح کا ایسا سورج تھی جسے دیکھ کر نیند سے مخمور ذہنوں کو بھی دنیا بہت حسین لگنے لگتی ہے۔ سنا تھا اس نے پیا ملن کے نو سالوں میں چار بیٹے چار بیٹیاں پیدا کیں۔ پھر بیوہ ہو گئی اور اب اجڑی ہوئی' تھکی تھکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ابا جی سے ملنے کے لئے کہا۔ لگ بھگ کوئی ایک ڈیڑھ کا وقت ہو گا۔ انہیں یوں بے وقت جگانے کی کبھی کسی نے کوشش نہ کی تھی۔ ان لوگوں کے چہروں پہ جمی پریشانی دیکھ کر میں نے سوچا

ماموں کافی بیمار تھے کوئی افتاد ہی نہ آ گئی ہو؟" اس لئے ہمت کر کے انہیں جگا لایا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد آنے کا قصد پوچھا تو ڈھوڈووال کی پیرنی نے کہا۔

"بھائی جی! اباجی کا دماغ چل گیا ہے۔ انہوں نے کل آپ کو شادی کے لئے بلایا ہے۔ لیکن بہتر ہو گا آپ نہ آئیں۔۔۔"

"تم ماموں کو بتا پوچھ کر آئے ہو یا اپنی ہی مرضی آ گئے ہو۔۔؟" اباجی نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ کتنے ہی اضلاع میں تفتیشی افسر بھی رہ چکے تھے۔

"نہیں۔ ہم خود ہی آئے ہیں۔۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔" اباجی نے کہا۔ "یہ برادری کی باتیں ہیں اور ان پہ رشتہ داریاں رہتی یا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ میرے بھی بڑے ہیں اس لئے مجھے تو آنا ہے۔" ان کا لہجہ بہت پر سکون تھا۔ "تم لوگ جا کر انہیں منا لو کہ کل خالی ہاتھ مجھے واپس کر دیں۔ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"دیکھ لیں پہا جی! یہ اچھا نہیں ہو گا۔۔" ٹرک ڈرائیور نما پہلوان کا منہ کھلا۔ شبیر شاہ نے بھی 'سنیاہ' بھیجا ہے کہ آپ نہ آئیں تو ہی اچھا ہے۔۔"

میں خود ان دنوں بہت اتھرہ ہوا کرتا تھا۔ اباجی کے اندر کا پولیس آفیسر تو بڑے تحمل سے رشتہ داری نبھا رہا تھا لیکن میرا خون یکبارگی کھول اٹھا۔ جی چاہا مولا جٹ کی طرح اسے گریبان سے گھسیٹتا دروازے سے باہر پھینک دوں۔ بس غلطی ہو گئی کہ پوچھ بیٹھا۔ "تم کون ہو؟" پتہ چلا وہ گوگی بی بی کا سگا' سب سے چھوٹا بھائی "افتخار" عرف "کھارا" ہے۔

"لو۔ ہمیں تو یہ پتہ ہی نہ تھا کہ چھوٹے سالاجی کی بھی مسیں بھیگ آئی ہیں۔" میں نے دل ہی دل اپنے آپ سے کہا۔ میرے اعصاب کی تلملاہٹ کچھ دھیمی تو ہوئی لیکن زبان سے ان کی اینٹ کا جواب نکلا۔" جواب تم نے سن لیا ہے نا' کہ ہم ضرور آ رہے ہیں۔ اس لئے تم لوگ مزید وقت ضائع کئے بغیر فورا"

واپس جاؤ۔ اپنی توپوں کو تیل ویل لگا کے صفائی کرو اور صبح کے لئے تیار رکھو۔
اب وہیں ملاقات ہو گی۔۔"

وہ چلے گئے۔ نیند مجھ سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی کیونکہ دماغ تپا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے اک طرح سے دھمکی دے کر گیا تھا۔ کسی طرح صبح ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ گھر سے صرف چار افراد جائیں گے۔ اباجی' میں' میری بڑی بہن اور بہنوئی۔ خالہ خالو کو ساتھ چلنے کی درخواست کی وہ بھی آ گئے۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ دھمکی کے مطابق ماموں کا بستر ٹرک میں ڈال کر علاج کے بہانے سیالکوٹ لے گئے ہوں یا پھر دلہن کو ہی غائب کر دیا ہو کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لہٰذا جگ ہنسائی سے بچنا بھی لازم تھا۔ پہلے وزیر آباد اڈے پر ویگن روک کر مخبر سے حالات کا پتہ کروایا پھر اپنے آبائی محلے گئے۔ جلدی جلدی برادری کے پانچ چھ بندے اور نکاح خوان ویگن میں بٹھائے اور گوگی بی بی کی یہ بارات اس شان سے اپنے پنڈ ال میں وارد ہوئی کہ دلہا کی کمر پہ گولیوں سے بھرا لائیسنسی ریوالور لٹک رہا تھا۔ اباجی کا سروس ریوالور ان کے سفری بیگ میں تھا۔ باقیوں کا پتہ نہیں کس کے پاس کیا تھا۔ دور ہی سے شبیر شاہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ پلکھو کے باندھ پر چھوٹے پرندے شکار کرنے والی دونالی بندوق لے کر گھوم رہا تھا۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ آنا تو ہمیں براستہ سڑک تھا وہ ادھر کس بحری حملے کا انتظار کر رہا تھا؟ وہاں سے تو اس کے کارتوس کے چھرے ہم سے آدھی راہ پہ دم توڑ دیتے۔ کھارا پہلوان اس اکھاڑے میں کہیں نظر نہیں آیا۔ اندر پہنچے تو ماموں کی طبعیت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اور اپنے داہئیں ہاتھ پہ چارپائی کے ساتھ بوقتِ ضرورت کام آنے کے لئے انہوں نے ایک لاٹھی بھی ٹکا رکھی تھی۔ اب پتہ چلا کہ کیوں کوئی ہنگامہ اس کچھار کے آس پاس نہیں پھٹک رہا تھا۔ البتہ حرم سرا کی سازشیں' سرگرمیاں پورے زور و شور سے جاری تھی۔ معلوم ہوا کہ گوگی بی بی کا سگا دھڑا' ماں بہنیں' شبیر شاہ اور کھارا' مسعودہ بی بی کا سسرال بچانے کی تگ و دو میں تھے تو سوتیلا دھڑا منظور شاہ سمیت میرے حق میں تھا۔ ثریا بی بی کا وفد آیا۔ اور اس نے

ایک بار پھر پیرنی بننے کی کوشش کی لیکن اباجی نے اسے سمجھادیا کہ "جو کچھ کہنا ہے جاکر اپنے باپ سے کہو۔۔۔" اور یہ بات توکوہ قاف کے جن کو قابو کرنے سے بھی زیادہ مشکل تھی کیونکہ ماموں اور ان کی لاٹھی کی 'ویٹو پاور' میرے ساتھ تھے۔ ان کے نزدیک کون جاتا؟ پھر ریاض حسین آگئے کہ۔

"اباجان نے مجھے وصیت کی ہے کہ اگر وہ مر بھی جائیں تو گوگی کی شادی مجھے آپ ہی کے گھر میں کرنی ہوگی۔ لیکن آپ ان کے صحتیاب ہونے تک چند دن انتظار کرلیں پلیز۔۔۔"

میں آدھ ہی گھنٹے میں ان کے وفود اور ایسے احمقانہ تقاضوں سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اباجی کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ واپس چلنے کے لئے کہا۔ شاید آٹھ برس پہلے بھی انہوں نے کچھ ایسے ہی طور طریقے دیکھ کر رشتہ رد کیا ہوگا۔ لیکن آج وہ گوگی بی بی کو لینے آئے تھے تو ان کے دھیرج سے میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ انہوں نے بڑے تحمل' بردباری اور کمال وضع داری کے ساتھ ریاض حسین سے کہا۔

"ابھی تمہارا باپ زندہ اور ہوش میں ہے۔ جو بات تم کہہ رہے ہو وہ ان کے منہ سے کہلوادو میں بغیر کوئی سوال کئے واپس چلا جاؤں گا۔"

یہ پینترا بھی ناکام گیا تو زنان خانے نے سوتیلے' چھوٹے ماموں کا سہارا لیا۔ وہ چہرے پہ میرے لئے ناپسندیدگی کا اشتہار جمائے' سامنے والے صوفے پر کچھ بدبدا رہے تھے۔ ان کی ساری ہمدردیاں اپنے سگے بھانجے (ساجد کے بھائی) کے ساتھ تھیں۔ بات مرحلہ وار آگے ہی آگے بڑھتی گئی تو نیا وفد آیا اور انہیں بلالے گیا۔ وہ پولیس حوالدار تھے۔ بڑے دھڑلے سے غیر قانونی کام کرتے اور جب کسی مشکل میں آجاتے تو اباجی کی سفارش ڈلوانے آجاتے۔ ان کی ملاقات اکثر وبیشتر مجھ ہی سے ہوتی تھی۔ "ذرا ابے کو تو بلادے۔۔۔" وہ گھر کے اندر ہم لوگوں کے بیچ میں بات کرتے گھبراتے تھے۔ اباجی آتے اور متعلقہ افسر کو ان پر دستِ

شفقت رکھنے کے لئے کہہ دیتے۔ آج انہوں نے میرے تو کیا' اباجی کے سلام کا بھی جواب نہیں دیا۔ گزشتہ رات چلتے چلتے منظور شاہ مجھے بتا گیا تھا کہ وہ مسعودہ بیگم کا ووٹ ہیں۔ چنانچہ مجھے پتہ تھا کہ اب وہ اندر عورتوں میں کچھ سول نافرمانی سی تحریک چلانے کا کام کریں گے۔ لیکن آگے ان سب کا واسطہ بھی 'مغل اعظم' سے پڑا تھا۔ اُدھر ذرا ہلچل ہوئی تھی کہ ماموں اپنے لٹھ کے سہارے بستر سے اٹھے اور صحن میں اتر گئے۔ دو تین بار فرش کو ٹھوکا اور پھر انگریز کے زمانے والے جی ٹی روڈ کے شیر کی دھاڑ سنائی دی۔

"جس کسی کو تکلیف ہے وہ میرے سامنے آکر بات کرے۔۔۔" ماموں کہہ رہے تھے۔ "کیا کمی ہے اس میں؟ تم سب ملا کر جتنے سال پڑھے ہو اس سے زیادہ پڑھا لکھا ہے وہ۔ باعزت کماتا ہے۔ خاندان پہ کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا۔ جب لڑکی راضی ہے۔ میں اس کا باپ خوش ہوں تو اس کی ماں کی۔۔ایسی تیسی۔۔۔ جو کوئی اعتراض کرے۔۔۔" یہ ان کی برداشت اور نرمی سے سمجھانے کی آخری حد تھی۔ اس کے بعد سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ پھر اندر لوٹے اور نکاح خوان اور رجسٹرار سے بولے۔ "آپ میرے ساتھ اندر چل کر لڑکی کی رضامندی خود پوچھ لیں اور نکاح پڑھائیں۔ میں دیکھتا ہوں اب کون بولتا ہے۔۔۔"

وہ اُدھر گئے اور چھوٹے ماموں غوطہ لگا کر بیٹھک کے ایک کونے میں آبیٹھے۔ چند منٹ بعد دوسری پارٹی نکاح فارم پر دلہن کے دستخط لے کر آگئی پھر میرے کوائف کا اندراج ہوا۔ حق مہر پر چھوٹے ماموں نے نیا مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن اباجان نے کھلی اجازت دے دی کہ لڑکی کا 'باپ' جو کہے لکھ دو۔ اس کے بعد ان کا بارود ختم ہو گیا۔ قبول و ایجاب ہوا۔ نکاح کے صیغے پڑھے گئے۔ اور یکدم سارے طوفان' سبھی تلاطم سمٹ کر معدوم ہو گئے۔ آٹھ سال پہلے اس آنگن سے "چنبے کی کلی" کی جو خوشبو پھوٹی تھی آج وہ اجالوں کے دوش پر

زمین و آسمان کے بیچ پھیل گئی تھی۔ "مبارک' مبارک" کا شور اٹھا۔ ایک جانی پہچانی بلند آواز سن کر میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ لڈوؤں کا ٹرے آرہا تھا اور سب سے پہلا لڈو اٹھا کر کھانے والا شبیر شاہ تھا۔ تبھی ایک اور آواز ابھری۔

"مولوی صاحب ایک نکاح اور پڑھیں۔۔۔" یہ چھوٹے ماموں تھے۔ وہ منظور شاہ سے چھوٹی خالدہ کے لئے کہہ رہے تھے۔ "میرے بیٹے کے لئے۔۔۔ بالعوض حقِ مہر۔۔۔" "حقِ مہر وہی رہے گا جو ہمارے لئے مقرر ہوا تھا۔' انہیں اپنی پسند کی پٹڑی چڑھنے سے پہلے ہی ابا جان نے ٹوک دیا۔

"تو ماما جی! میرا مسئلہ بھی حل کر دیں۔۔۔" میرے خالو جی نے موقع غنیمت سمجھ کر اپنے بیٹے کے لئے سب سے چھوٹی زاہدہ کو مانگ لیا۔

میں نے بہت سے لوگوں کے منہ کھلے دیکھے۔ "شاہ جی کے نصیبوں کی بات ہے۔۔۔" لوگ ایک بیٹی گھر پہ بٹھا کر برسوں رشتے کا انتظار کرتے ہیں اور یہاں چٹ منگنی پٹ بیاہ تین بیٹیاں جا رہی تھیں۔ "اور گوگی بی بی تو بہت برکتوں والی ہے کہ خود چلی تو اپنے پیچھے چڑیوں کا پورا چنبہ ہی اڑا کر آنگن سونا کر چلی۔۔۔" گھر بھی 'دیا وان' کا تھا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ نکاح ہو گئے۔ اور کسی کو کچھ یاد بھی نہ رہا کہ چند گھڑیاں پہلے یہاں جنگ و جدل کا سا سماں تھا۔

بھائی ریاض کی درخواست پر رخصتی دو روز بعد 26۔ اگست 1973 رکھی گئی۔ اس روز ارد گرد کی ساری مہاجر بستی گلی میں الٹ آئی تھی۔ اس گھر میں گوگی بی بی کی بھی کیا رونق' کیا برکتیں تھیں۔ مٹی کے کھلونے بیچنے والے' اور شاہ دولہ کے چوہے بھی اپنا کام دھندا چھوڑ کر اسی ہجوم میں کھڑے تھے۔ کچھ آبدیدہ کہ ہمیشہ ان کے دکھ سکھ کی سانجھ کرنے والی جا رہی تھی۔ قرآنِ پاک کے سائے تلے چلی' میرے پہلو سے گذری اور ویگن میں داخل ہو گئی۔ میرا اپنا دل بوجھل ہو گیا۔ ایک ساتھ اتنی ڈوریں، اتنے ناطے توڑ کر جانا کتنا مشکل ہوتا ہے؟ میں نے

پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اک لڑکی کا غیر مرئی سا ہیولا وہاں ایستادہ تھا۔ سر پہ دوپٹہ یوں لپیٹا ہوا جیسے چائے دانی پہ " ٹی کوزی " ۔ اپنے اوپر میری نظریں جمی دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"میں گوگی ہوں۔ اک یاد بن کے اس آنگن میں رہوں گی۔۔" اس کے لب بے آواز ہلے۔ " عصمی کو تمہارے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ آٹھ سال اس نے تمہارا انتظار کیا ہے۔ اسے اپنا بس پیار ہی پیار دینا۔۔۔" اس نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور پھر جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی۔

لاہور پہنچے تو ماں جو کل تک بنا سہارا اپنے پاؤں پہ کھڑی نہ ہو سکتی تھی آج دونوں ہاتھوں میں کبوتر تھامے دروازے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ انہوں نے بھی آٹھ سال اس دن کا انتظار کیا تھا۔ دلہن کے سر پر سے ان پرندوں کو آزادی دی۔ قرآنِ پاک کے سائے تلے اس کا پہلا قدم اندر لیا۔ ماتھا چوما اور اسی کے سہارے اسے اپنے کمرے میں لے گیئں۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ کب آنکھ لگ گئی پتہ نہیں۔ لگ بھگ ایک گھنٹہ بعد سرکاری حکم نامے پر مجھے کمرے سے نکال قبضہ دلہن کو سونپ دیا گیا۔ عزیز و اقارب تھے۔ اڑوس پڑوس سے کچھ عورتیں' کچھ لڑکیاں بھی اسے دیکھنے آئی تھیں۔ رسمِ دنیا بھی تھی' موقع بھی تھا' دستور بھی تھا۔ رات کا کھانا میں نے مہمانوں کے بیچ کھایا۔ ایک ایک کر کے وہ رخصت ہوئے تو مجھے اجازت ملی کہ دلہن کی عملداری میں قدم رکھ سکوں۔ اور آٹھ برس پہلے میں نے جس "چنبے کی کلی" کو اپنے افسانے میں پانے کی آرزو کی 'تھی' آج دھڑکنوں سمیت اپنے خوابوں کی اس تعبیر کو بانہوں میں سمیٹ لوں۔

شاید سحری کا وقت ہو گا جب میری آنکھ کھلی تو وہ گود میں تکیئے پر کہنیاں ٹکائے میرے پہلو میں بیٹھی مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں نے اس کے گرد بازو ڈال کر اسے اپنے سینے پر کھینچ لیا اور نیند کے نشے میں غنایا۔

"سو جاؤ۔ نیند نہیں آ رہی کیا۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"آپ سے ایک بات پوچھنی تھی جی!۔۔۔" اس نے میرے سینے سے چہرہ اٹھا کر پھر مجھے دیکھا۔ "یہ ہچر مچر کیا ہوتا ہے۔۔۔؟!"

میری نیند کافور ہو گئی۔ پلنگ کی ٹیک کے ساتھ کچھ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کر بہت پل اس کا اک اک نقش میں اپنے دل و دماغ میں کندہ کرتا رہا۔ پھر بہت دھیرج سے پوچھا۔ "یہ تم سے کس نے کہا۔۔۔؟!"

"باجی نے کہا تھا آپ بہت صدمے میں رہے ہیں اس لئے میں کوئی ہچر مچر نہ کروں۔ آپ کو کیا صدمہ ہے جی۔۔۔؟!"

میں نے اس کا ماتھا چوما' آنکھیں چومیں اور پھر بانہوں میں سمیٹ کر بولا۔

"انہیں ضرور کوئی غلطی لگی ہے۔۔۔" میں نے کہا۔ "جس کے پاس تم ہو اسے کوئی صدمہ ہو سکتا ہے کیا۔۔۔؟"

"اور وہ۔۔۔" وہ میرے سینے پہ پھر گمی۔

"باقی باتیں صبح کریں گے۔۔۔" میں نے لوری دینے کے سے انداز میں اس کا گال تھپتھپایا۔ "مجھے تھوڑا سا سو لینے دو پلیز۔۔۔"

وہ پھر نہیں بولی۔ میرے سینے پر سر رکھے سچ مچ سو گئی۔ پھر جانے کب میری دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر وہ میرے 'دہر خانے' میں اتر گئی اور وہاں اگلی محبتوں کی جو کوئی بھی نشانیاں رہ گئی تھیں' اپنے سانسوں کی مہک سے جلا کر خاکستر کر ڈالیں۔ موہنجوڈارو مندروں' صنم خانوں سمیت زمین کی پرتوں بیچ کہیں دفن ہو گیا' اجنتا ایلورا کے سارے صنم کدے دھول کی تہوں میں چھپ گئے۔ میرے پہلو میں' میری تکمیل کا ازلی و ابدی مظہر تخلیق ہو چکا تھا۔ تبھی آوارہ تخیل نے زمانوں پرے ان اولین لمحوں میں جھانکا جب آدم نے پہلی بار حوا کو دیکھا اور پیار' محبت' چاہت و عشق کی خوشبو پھوٹی تھی۔ ان لحظوں کا سحر ایسا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا' میں خود کب سو گیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں نہ تھی۔ اپنے ہوش و حواس درست کر کے صحن میں نکلا تو میرے کمرے کے بالکل سامنے چھاؤں میں ماں کا بستر لگا تھا۔ ابا جی نظر کا چشمہ لگائے صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور عصمی دوسری چارپائی پر باجی کے ساتھ پھلیوں میں سے مٹر نکالنے میں مدد کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"آٹھ سال میں نے اس دن کا انتظار کیا ہے جی!۔۔۔" بڑی ادا سے اس نے اپنی ہتھیلی میرے آگے اٹھائی اور بولی۔ "لائیں ایک ہزار روپیہ نکال دیں۔۔"

"کیا کرو گی جی۔۔۔؟" میں نے سر سے پاؤں تک بغور اس کا جائزہ لیا۔ چھریرا بدن' میرے برابر قد۔ ایک ہاتھ کمر پہ' دوسرا میرے آگے پھیلا ہوا۔

"چلیں جلدی کریں جی!۔۔۔" میری چپ نے اس کے اندازِ تفاخر میں کچھ بے چینی بھر دی۔ آنکھیں موند کر بولی۔ "آج ہم سب فلم دیکھنے جائیں گے۔۔۔"

"دیتا ہوں جی۔۔۔" میں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایسے کیوں کر رہی ہے۔ ماں کی نظروں میں پچھلے آٹھ برسوں کا ڈر ٹھٹھرا ہوا تھا۔ باجی کی نگاہ مجھ پر تھی اور ہاتھ خالی پھلیوں میں مٹر ڈھونڈ رہے تھے۔ ابا جی کے ہاتھوں سے اخبار کا چلمن نیچے ڈھل آیا تھا اور وہ اپنی آدھے شیشوں والی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ سب کو ایک ہی جواب کی تلاش تھی اور وہ اپنے الھڑ انداز میں ان پر اپنا اعتماد جتا رہی تھی کہ اس نے سچ مچ مجھے جیت لیا ہے۔ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور بولا۔

"آنکھیں نہ کھولنا جی۔۔۔"

اک غرور سے اس کی ٹھوڑی میری جانب کچھ اور اوپر اٹھ گئی۔ گالوں کی شفاف جلد تلے رقصاں لہو کے ذرے دہکنے لگے تھے۔ میں نے پہلی بار دیکھا اس کے لبوں کو لپ اسٹک اور چہرے کو میک اپ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ واقعی چناب کے اِس پار پلکھو کی سوہنی تھی۔

میرے پاس مغلوں کی جاہ و حشمت ہوتی تو شاید میں بھی راہِ عشق میں سب کچھ تیاگ کر اس کا مہینوال بن جاتا۔ دل میں جو چشمے' آبشاریں برسوں سے سوکھی پڑی تھیں یکلخت پھوٹ بہیں اور بے ساختہ میرا جی چاہا ان جوار بھاٹوں اور طوفانوں میں بہہ نکلوں۔ ان سب کے سوالوں کا اور سوہنی کے غرورِ حسن کا میرے پاس بس ایک ہی جواب تھا۔ دوبئی کی دولت بدل کر نوٹوں کا جو بنڈل ملا تھا میں نے جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھا اور تیزی سے جھکا۔

اگلے پل سب کے سامنے۔۔۔ میرے لبوں نے اس کے لبوں پر سجدہ کر دیا۔

"ہائے ڈیا۔۔۔!" لجا سے اس کا چہرہ تمتما گیا۔ لمحوں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ کمرے کی طرف بھاگی۔ سارے نوٹ فرش پہ بکھر گئے۔ میں نے دیکھا باجی کا مٹروں والا ڈبہ الٹ گیا تھا۔ ماں کی آنکھیں اب بند تھیں اور چہرے پہ اتھاہ طمانیت بھری مسکان تھی۔ اباجی کے چہرے کے آگے پھر سے اخباری چلمن تن گیا تھا۔ ہر کسی کو اس کے سوالوں کا جواب مل گیا تھا پھر بھی میں بولا۔ "آپ سب نے ٹی وی پر ایسے مناظر ضرور دیکھے ہوں گے۔ میری اس ہمت کو بھی کسی انگریزی فلم کا سین جان کر معاف کر دیں اور صرف اس کے پیچھے چھپا سچ مان لیں۔ پھر بھی آپ کو میرے منہ سے سنے بنا ذہنی سکون نہیں ملتا تو جان لیں کہ مندر کی اس داسی کے آتے ہی مجھے چمٹا بھوت ہمیشہ کے لئے رفو چکر ہو گیا ہے۔۔۔"

میں نوٹ اٹھانے کے لئے نہیں رکا۔ کمرے میں گیا تو وہ پردے کے پیچھے چھپی تھی۔ مجھے اس کے منہ سے "ہائے ڈیا" بے پناہ خوبصورت اور پیارا لگا تھا۔ شرمانے کا یہ انداز اس نے یقیناً وزیر آباد کی مہاجر بستی سے سیکھا تھا۔ میرے سینے میں اِک کچا گھڑا تھا۔ جی چاہا ایک بار پھر اس پرانے لفظوں کی تھاپ سنوں۔ مجھے اپنے مقابل پا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ

لیا۔ میں نے ہلکے سے دباؤ سے انہیں ہٹایا۔ اس کی پلکوں کی جھالر اٹھی۔ مین نے دیکھا آنکھون میں لال ڈورے شراب لنڈھانے لگے تھے۔ ان میخانوں میں ڈوبتے ابھرتے میں نے اسے پکارا۔

"اک بار پھر 'ہائے ڈیا' کہونا۔۔۔!"

اس کی آنکھیں شوخی سے دمکیں اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے بھی اتنی ہی بیباکی سے اس کے لب پھر چوم لئے تو وہ گھگی۔ "ہائے ڈیا۔۔۔!" اس بار ان نینوں سے کہکشاؤں کے ہزاروں ایسے سوتے پھوٹے جو میری ہر راہ گذر' ہر پیاہ' ہر پگڈنڈی پہ دیپ ہی دیپ جگا گئے۔ "اب کبھی اپنے گھر کا راستہ نہ بھولنا۔" مندر کی اس نرتکی نے جیسے اپنی نگاہوں سے کوئی سحر پھونکا اور میر یسوچ کے آبگینوں سے مدھر جلترنگ پھوٹ پڑا۔ لمحے ساکت ہو گئے اور میری بانہوں کا حلقہ کھولے بغیر وہ آرام سے آنگن میں پھسل گئی۔

اس رات وہ مجھے اپنی کتھا کہانی سناتی رہی۔ بچپن کی شوخیاں' شرارتیں۔ گھر اور سکول میں اپنے' دوسروں کے واقعات۔ کیسے بعض اوقات وہ جو بات کہہ دیتی تھی وہ پوری ہو جاتی تھی اور لوگوں نے اسے "گوگی بی بی" بنا دیا۔ اس نے مجھے ہمارے صحن میں ایک کھڑکی دکھائی۔

"میں نے آپ کا یہ گھر کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔۔۔" اس نے بتایا۔ "اک خواب میں' میں یہاں آئی اور اس جگہ آپ نے میرے سر پر دوپٹہ ڈالا تھا۔" اس نے کھڑکی کے سامنے موتیئے کی کیاری کا بتایا۔ "لیکن تب میں آپ کا چہرہ نہیں دیکھ پائی۔ صبح میں نے اپنے ماموں کی بیٹی صابرہ کو یہ سب سنایا۔ وہ اللہ لوگ ہے اور ان دنوں ہمارے گھر آئی ہوئی تھی۔ بہت دیر تک وہ مجھے دیکھتی' گم رہی اور پھر اس نے کہا کہ میرا اور آپ کا بندھن ہو چکا ہے۔ بس مجھے انتظار کرنا ہے۔ پھر جب آٹھ سال پہلے آپ ہمارے گھر آئے تو بھی وہ وہیں تھی اور اس نے اپنی کالی چادر کے نیچے سے دو دن پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ مجھے دیکھنے آ رہے

ہیں۔ مجھے پسند بھی کر لیں گے لیکن یہ رشتہ ابھی ہو گا نہیں۔ مجھے سالوں انتظار کرنا ہو گا۔۔۔" وہ پہلو بدل کر میرے سینے پہ سیدھی ہوتی مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں بہت سا کہرا ٹھہرا ہوا تھا۔ "لیکن آپ کو پانے کے بعد اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہو گا جی! ۔۔۔" وہ یکلخت مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ "آپ کی واپسی میں صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ آٹھ برسوں بعد مجھے تو صرف پانچ دن ہی ملے ہیں۔ آپ چھٹی کچھ بڑھا لیں نا جی۔۔۔!"

اگلی صبح میں نے مزید پندرہ دن چھٹی کے لئے ٹیلیگرام بھیج دی۔ حالانکہ ان کا بھی اسے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اگلے روز ولیمہ ہوا۔ ریاض حسین مکلاوہ لینے آ گئے۔ وزیر آباد پہنچے تو عصمی کو پھنک کر بخار چڑھا۔ اور تین دن اس کی نذر ہو گئے۔ باقی ایام میں اس کی سیالکوٹ تک پھیلی بہنوں، رشتہ داروں کو سلام کرنے گئے۔ لاہور میں میرے اپنے بھی تھے۔ شام دعوتیں ہوتیں دن کا وقت شالامار' مقبرہ جہانگیر اور شاہی قلعہ وغیرہ میں تصویریں اتارتے یا انارکلی بازار میں بسر ہو جاتا۔ کبھی تھکن زیادہ ہو گئی تو میری ماں کے ساتھ بستر میں دبک جاتی۔ وہ دارلامان کی لاڈلی تھی وہ ڈھال بن جاتیں۔ یوں وہ ہر کسی کو چھوٹے چھوٹے پل اور ان میں سانس لیتی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹتی گئی۔ ہجر ہجر کا مفہوم وہ جان گئی اور پھر ایسی گھٹا بن کر مجھ پہ برسی کہ میری نیندیں بھی ملہار کا الاپ گنگنانے لگیں۔

پھر وہ رات آ گئی جس کی صبح مجھے واپس دوبئی روانہ ہونا تھا۔ اس رات اس نے مجھے سونے نہ دیا۔ میں پلنگ کی ٹیک سے کمر لگائے بیٹھا رہا اور وہ میرے کندھے پہ سر رکھے گٹھڑی بنی مجھ سے چپکی رہی۔ مجھے اور اسے دونوں کو پتہ تھا کہ اس کے پاسپورٹ ویزا کا بندوبست ہوتے ہی وہ بھی دوبئی آ جائے گی لیکن پندرہ بیس روزہ دلہن کی پہلی جدائی تھی چنانچہ وہ بار بار روتی' کبھی باتیں کرتی میرے کندھے پہ سر ٹکائے بیچ بیچ سو بھی جاتی۔ اس کے بوجھل سانسوں کی لے تال پر نیند مجھے بھی تھپکی دینے آتی لیکن اسے جانے کیسے خبر ہو جاتی کہ وہ جھٹکا کھاتی اور

گریبان کس کر مجھے خبردار کر دیتی۔ یوں پل پل گذرتے صبح ہو گئی۔ ایر پورٹ چلے۔ میں جہاز میں بیٹھا۔ تب تک میں اسے سنبھالتا رہا تھا اب کھڑکی سے جھانکتا اسے تلاش کرنے لگا تو خود میرے حلق میں اخروٹ پھنس گیا۔ بہت جی چاہا' چلتے چلتے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھر کر کجلائی آنکھوں سے کچھ اور چاہتیں چن لوں' ایک جملہ اس سے کہہ جاؤں۔

"عصمی! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔۔۔!!"

لیکن تیزی سے دوڑتے ہوئے جہاز میں سے بہت دور پھیلے بے پہچان نقطوں میں سے اس کا چہرہ ڈھونڈتا کیسے ؟ تصور میں اک چہرہ کندہ تھا۔ جہاز کی کھڑکی سے دوسری طرف اسے ہی دیکھتا' ہاتھ ہلاتا میں فضاؤں میں بلند ہو گیا۔۔۔!!

ꟾꟾꟾ

4

اِدھر گوگی بی بی کے نصیب ورزق مجھ سے جڑے اور اُدھر ڈیوٹی پہ لوٹتے ہی میرے لیباریٹری میں ٹرانسفر ہونے کا حکمنامہ جاری ہوگیا۔ یوں جیسے قدرت صرف منتظر تھی کہ ہماری پٹڑیاں مل کر ایک ہوں تو وہ ہم پہ اپنی نعمتیں برسائے۔ میری تنخواہ دوگنی سے زیادہ ہوگئی۔ اوور ٹائم الگ۔ اب ہولے ہولے مجھے بھی یقین آنے لگا تھا کہ دوبئی کی ریت میرے پاؤں کے نیچے دلدل میں بدلنے لگی ہے۔ تبھی ماں جی کا سندیسہ آگیا۔ چھوٹے بھائی صاحب افتخار اور ان کی بیگم کو دور دور رہتے تقریباً" دو سال ہو چلے تھے۔ اب تو ان کا ایک بیٹا بھی تھا جو باپ کی شفقت سے محروم تھا۔ ماں جی نے خواہش کی تھی کہ ان کے ساتھ رہنے کے لئے کچھ کروں۔ رفاہ دوبئی میں دو کمرے کا ایک چھوٹا سا گھر میرے پاس تھا چنانچہ اس فرمان کی تعمیل میں ویزا نکلوا کر بھیج دیا۔ لگ بھگ ڈیڑھ ماہ بعد ہمارے گھر میں ان کی رونق بھی ہوگئی۔

تب دوبئی بہت سادہ مزاج اور بہت مختلف تھا۔ دہلی' لاہور' پشاور' بمبئی' کراچی' ڈھاکہ اور کیرالہ کے رشتوں میں گندھا ایک شہر۔ یہاں لوگ صرف دو ہی تھے۔ ایک وطنی اور دوسرے خارجی۔ صبحِ بنارس اپنے الگ ہی انداز میں پھوٹتی تھی۔ کجلائے شرابی نینوں اور رخِ تاباں کی بجائے درجنوں مقامات پر دستکاروں کے ہجوم ٹفن بکس ہاتھوں میں لئے Pick ups کے انتظار میں برطانیہ کے صنعتی انقلاب کی یاد دلاتے تھے۔ دن بے حد مصروف تھے کیونکہ ایک قوم کی تعمیر ہو رہی تھی۔ البتہ دوبئی میں شامِ اودھ بہت ہمہ گیر اور ہنگامہ پرور ہوتی تھی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ہی بانکوں کے انداز مچل اٹھتے۔ آدھے پازیبوں' گھنگھروؤں کی جھنکار سننے سینما گھروں پہ قبضہ جما لیتے اور باقی رسیلے کھانے کے لئے ریسٹوران' عرفِ عام 'ہوٹل' کی جانب چل پڑتے۔ الفہیدی سٹریٹ پر انڈین پاکستانی ذائقے والے دو مشہور ہوٹل

تھے۔ دوبئی ہوٹل اور الحمرا ہوٹل۔ دور ہی سے ان کی با آوازِ بلند فرمائشی گیت مالا۔۔۔
"چھلکائیں جام' آپ کی' آنکھوں کے نام، ہونٹوں کے نام۔۔۔" آدمی کے قدموں کی چاپ نشیلی کر دیتی تھی۔ الحمرا لفظ کے صوتی اثرات کچھ ایسے تھے کہ میری سوچوں میں اک مخمور انگڑائی کسمانے لگتی اس لئے میں وہیں کھانا کھاتا تھا۔ میز پہ بیٹھنے سے پہلے کاؤنٹر پہ چٹ تھما آتا اور اگلے چند پلوں میں بھجن نما بھارتی گیت۔۔۔ "رادھا نے مالا جپی شیام کی' میں نے اوڑھی چنریا تیرے نام کی۔۔۔" کا الاپ شروع ہو جاتا۔ سارے سر تال "گوگی بی بی" کے تھے۔ جیسے اسی کی چنریا سے دھڑکتے میٹھے بولوں کی یہ دھنک بکھر رہی ہو۔ اپنی کہانی تو وہ مجھ سے کہہ چکی تھی۔ اب شوخ سرگوشی بن کر وہ میری سماعت سے کھیلنے لگی۔۔۔" تیرے نام کی او پیا' تیرے نام کی۔۔۔" یوں جیسے پل پل وہ میرے ساتھ ساتھ ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ کبھی وہ میرے گالوں پہ چاہتوں کے پھول کھلا جاتی۔ یہ گیت میرے تحت الشعور سے ایسے چپک گیا کہ سوتے جاگتے ہر سو سنائی دینے لگا۔ اس کی باتوں کی خوشبو ہی ایسی تھی۔ کہ اسے پا کر بھی پا لینے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے اس کا ویزا بھیج دیا تو جواب آیا۔

" آٹھ سال اپنی ہی خموشیوں میں آپ کا انتظار کرتی بہت تھک تو گئی ہوں جی۔! لیکن جلدی نہیں آ سکتی۔ یہاں گھر پہ سب کہتے ہیں کہ آپ بہت چٹخورے ہو اور آپ کے دل کا راستہ پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ مجھے بس وہیں رہنا ہے اس لئے میں کھانا پکانا سیکھ رہی ہوں۔ جب یہاں بے بی (میری سب سے چھوٹی بہن) پاس کر دے گی تو ہی آؤں گی۔ پلاؤ آپ کو پسند ہے وہ بہت اچھا بنانے لگی ہوں۔ ویسے آپ کو اور کیا کچھ پسند ہے تا کہ میں وہ ڈشیں خاص طور پر پکانا سیکھ لوں۔۔۔؟"

اب میں اسے کیا سمجھاتا؟ وہ تو انگلی کی پور ہی چائے کی پیالی میں ڈبوتی تو میرے لئے اس میں شہد گھل جاتا۔ پتہ نہیں کیسے دن تھے وہ کہ اس کی باتوں نے ' اس کی چاہتوں نے میرے

احساس میں چبھے درد کے سارے کانٹے چن ڈالے اور نس نس میں اپنی تعمیرِ نو کی ایسی ترنگ جگا دی کہ میں الٹے پاؤں جنون سے اسی منزل کی طرف دوڑنے لگا جہاں سے میری شکست و ریخت ہوئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر اپنے آپ کو ڈھونڈنا اور جوڑنا تھا' اپنی زندگی کو آٹھ سال پیچھے لے جانا تھا کہ اس کا ہاتھ تھام کر چلوں تو ہر راہ کے ہر روزن میں اسے صرف اپنا ہی عکس نظر آئے۔ اپنے آپ کو سمیٹتے جو باقی بچا وہ فقط "آج" تھا۔ پیچھے صرف دھول' گردِ راہ تھی۔ آٹھ برس اپنی ذات میں گم رہ کر اس نے مجھے اپنا قرض دار بنا دیا تھا۔ اب نہ تو میں اسے تنہا چھوڑ کر کہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی اپنی آوارگی کا حصہ بنا سکتا تھا۔ میرے پاؤں جس زمین پر تھے اپنی اڑان بھی وہیں سے لینی تھی۔ کینیڈا جانا اور دشت و دریا نوردی کے سارے ارمان محو' خواب ہو گئے۔ اہرامِ مصر' یونان کے ڈیلفی آریکلز' روم کا تریوی فاؤنٹین اور سپین کا الحمرا' میری راہ تکتے رہے اور ایما' جیول' نتالیا بھی شاید نئے ہاتھ تھام کر کارزارِ ہستی میں گم ہو گئی ہوں گی۔ بلم پردیسی کا انتظار کرتیں تو نیاگرا فالز کے سرہانے چندھیائی آنکھوں والی ساٹھ ستر سالہ کنواری کنیا ہی بیٹھی رہ جاتیں۔

دھیرے دھیرے دن گذرتے گئے اور پھر شادی کے سات ماہ بعد وہ صبح بھی آ گئی جب عصمی نے دوبئی آنا تھا۔ تب تک لاہور سے براہِ راست کوئی فلائٹ نہ آتی تھی۔ وہ براستہ کراچی آ رہی تھی اور میں بہت فکر مند تھا کہ بذریعہ ہوائی جہاز یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ کراچی میں اندرونِ ملک سے بیرونِ ملک ٹرمینل پہ جانا تھا۔ اور ایرپورٹ کاروائیوں کا اسے مطلق تجربہ نہ تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا کرے گی؟ بہر کیف فلائٹ آن پہنچی۔ چھوٹے بھائی افتخار کی ایرپورٹ پر ڈیوٹی تھی۔ اس لئے میں تھوڑا مطمئن لیکن زیادہ بے چین تھا کہ مجھے کب خبر ملے گی وہ سچ مچ آ گئی ہے۔ تب دوبئی ایرپورٹ لگ بھگ چار پانچ سو میٹر لمبی اور بہت سادہ سی تھی۔ دائیں کونے سے روانگی ہوتی تھی اور بائیں سے آمد۔ عین وسط میں انکوائری آفس۔ آمد کے گیٹ سامنے تقریباً" پچاس ساٹھ لواحقین اپنے پیاروں کو لینے جنگلے کو گھیرے کھڑے تھے۔ مسافر

باہر آنے شروع ہو گئے تو میں پیچھے دوسری قطار میں ایڑیاں اٹھا کر وقفے وقفے سے اسے دیکھ لیتا۔ ابھی تک وہ نظر نہ آ رہی تھی۔ ادھر اس نے جہاز کی سیڑھیوں پر بھائی کو سامنے پایا تو نیچے 'ٹیرس' تک آتے آتے اپنی پارٹی بنا لیا کہ مجھے ذرا پریشان کرنا ہے۔ چنانچہ امیگریشن سے کلیئر ہونے کے بعد بھی 'اس نے تو کیا' بھائی نے بھی اپنی جھلک نہ دکھائی۔ اسی سبب میری ''سعی'' شروع ہو گئی۔ گیٹ سے انکوائری آفس کی طرف چلتا کہ پسنجرز لسٹ سے پتہ کروں۔ لیکن آدھا راستہ جا کر ہی لوٹ آتا کہ شاید وہ آ گئی ہو۔ دراصل وہ سامان لانے والی بیلٹ کے پاس اوٹ میں کھڑے مجھ پر ہنس رہے تھے۔ کوئی پانچویں چھٹی بار میں لوٹا تو وہ بھائی کو اپنے سامان کی نشاندھی کرتی نظر آ گئی۔ بس وہ اک لمحہ اور وِینا کے سارے تاروں کی طرح میرا وجود' ساری ہستی جھنجھنا گئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور بھائی سے کچھ کہہ کر میری طرف چلی۔ اِک اِک قدم میری استقامت کا امتحان تھا۔ دروازہ کھلا۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر آئی۔ جنگلے کے کونے میں راستے سے نکلی تو درجنوں چہرے اور گردنیں ساتھ ہی مڑ گئیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے۔ آنکھوں میں دھندسی تیر آئی اور پھر یکلخت میرے گلے میں بانہیں ڈال کر اس نے سب کے سامنے اتنی تیزی سے میرا گال چوم لیا کہ میں گڑبڑا گیا اور اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی۔

"کیا کر رہی ہو۔۔۔" سینکڑوں آنکھیں ہم پہ لگی تھیں۔ اس نے سچ مچ میرے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ گڑبڑا کر بولا۔ "یہاں کا قانون ایسی اجازت نہیں دیتا۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کرو۔۔۔" میری ساری ہیکڑی نکل گئی۔

"دیکھا کریں جی۔۔۔" وہ اک ناز اور سرخوشی سے بدبدائی۔ "اور ہونٹوں پہ ہونٹ نہیں رکھے صرف گال چوما ہے جی! ۔ بیوی کو یہ منع نہیں ہے جی!۔۔۔" دوبئی کی ہوا لگتے ہی وہ کچھ تیز ہو گئی تھی۔ میرے گلے کا ہار ہٹا کر اس نے

مضبوطی سے میرا بازو لپیٹ لیا۔ بھائی سامان لے آیا تو میں نے جلدی کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی۔ لیکن اس کے ساتھ چلتے ہر قدم مجھے یہی لگا جیسے قزح کے سارے رنگیرے آگے پیچھے جا رہے ہوں۔ میں نے سوچا عورت بھی اللہ تعالیٰ کی کیسی خوبصورت رحمت و نعمت ہے کہ جس بھی مرد کے ساتھ جڑتی ہے اسے تاجدار و مجازی خدا بنا دیتی ہے۔

گھر کا بڑا کمرہ میں نے افتخار کو دے رکھا تھا کہ اس کے ساتھ بیوی اور بچہ بھی تھے۔ اسی وجہ میں نے اسے اے سی بھی لگوا دیا تھا۔ میں اکیلی جان تھا ملحقہ دس فٹ' دس فٹ کمرے کی دیوار میں چھت کے قریب سوراخ کروا کے میں نے اپنے لئے ادھر سے کچھ ٹھنڈی ہوا کا بندوبست کر رکھا تھا۔ رات کو پڑوسی کمرے کو تالا لگا کر فلم دیکھنے چلے گئے۔ تب ہمارے پاس کوئی ٹی وی ریڈیو کچھ بھی نہ تھا اور اوپر سے گرمی۔ لیکن خدا کی بندی نے کوئی گلہ کیا نہ شکوہ۔ اسے بس یہ خوشی تھی کہ اس کے پاس میں تھا۔ مجھے بھی اس سنگ ہفتہ دس روز گذرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک شام بھائی سے کچھ پوچھنے کمرے میں گیا۔ اندر پیاز کیتی زبور چی تھی۔ یوں لگا جیسے منبع چارپائی کے نیچے ہو۔ بستر پہ بیٹھے میں نے یونہی جھک کر دیکھا تو نیچے گھی' آلو' پیاز' لہسن اور بہت کچھ محفل جمائے بیٹھے تھے۔ حیرت تو ہوئی لیکن کچھ میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا۔ واپس لوٹ کر میں نے عصمی سے پوچھا کہ دونوں میں کوئی ناچاقی ہوئی ہے کیا' جو اشیائے خوردنی ان کے کمرے میں پناہ گزیں ہو گئی ہیں؟

"وہ تو میرے آنے سے تیسرے روز ہی کمرے میں چلی گئی تھیں جی۔" جواب ملا۔ "اور تب سے اس کی میرے ساتھ بات چیت بھی نہیں ہے۔ اپنی مرضی ہے جی! البتہ میں کھانا بنا کر کچن میں ہی چھوڑ دیتی ہوں کہ جب' جو ضرورت ہو وہ لے لیں۔۔۔" وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر بولی۔ "کل وہ بھائی سے کہہ رہی تھی کہ اسے دوبئی پسند نہیں اور وہ پاکستان واپس جانا چاہتی ہے۔۔۔"

مجھے یہ بات بہت عجیب سی لگی۔ عصمی کے آنے سے کچھ روز پہلے وہ مجھے اور بھائی سے ذکر کر رہی تھی کہ دوبئی میں زندگی بہت اچھی ہے۔ اب وہ دو تین سال بعد ہی پاکستان جائے گی۔ لیکن اب اندازہ ہوا کہ ہمارا نئی رشتہ داریوں' قرابت داریوں اور وطیروں کا پاٹھ شروع ہوگیا ہے۔ خلوص' پیار کے وہ پرانے رشتے ختم۔ اب شریکے نبھانے ہیں۔ وہ صرف خالہ ہی کی بیٹی رہی۔ اس نے بچپن سے یہی جانا اور مانا تھا کہ میرے تمامتر جملہ حقوق پر اس کی بڑی بہن کی دسترس ہوگی۔ چنانچہ صبح شام راج سنگھاسن پر وہ گوگی بی بی کے درشن سہہ نہ پائی اور کچھ ہی دنوں میں سچ مچ چلی گئی۔ کبھی کبھار بزرگ بھی اپنی فرسودہ روایات کی خاطر اپنے بچوں کو روند ڈالتے اور نفرتوں کی ایسی آبیاری کر دیتے ہیں کہ پھر لاکھ کوشش کرلو ان کی زمین سے کوئی میٹھا پھل نہیں ملتا۔

دوبئی میں دنیا بھر کی اقوام کے مخصوص وطیرے ضرب المثل ہیں۔ پاکستانیوں کے بارے مشہور ہے کہ وارد ہوتے ہی بلوچی اور کچھی مچھلی پکڑنے کا جال لے کر سمندر کھنگالنے لگتے ہیں۔ سندھی بازار سے ٹیپ ریکارڈر خرید کر اس کا غلاف سلانے درزی کی دوکان کا رخ کرتا ہے۔ پٹھان جہاز سے اترتے ہی ٹیکسی ڈرائیونگ کے لائیسنس پیچھے بھاگتا ہے۔ کراچی حیدرآباد کے مہاجر اڑسٹھ70 سال پہلے پاکستان آئے ان لوگوں کی نسلیں بدل گئیں لیکن آج بھی انہیں اپنا تشخص "پاکستانی" ہونے سے اختلاف ہے چنانچہ وہ "ہے جمالو" کے سیاسی چوپال میں جادم لیتے ہیں۔ پنجابیوں میں سے جس کسی کو دیکھو اپنے بھائیوں کے ویزے لینے ارباب ڈھونڈتا رہتا ہے۔ مجھے گھر سے تیسرے بھائی اکبر کی شکایات موصول ہو رہی تھیں کہ وہ کچھ کام کاج نہیں کرتا۔ سارا دن سویا رہتا ہے یا پھر گھر پہ لڑائی اور باہر آوارہ گردی کرتا ہے۔ اب تک میرا احساسِ ذمہ داری کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ میرزا غالب والی بیڑیاں پاؤں میں پڑیں تو میرے قدم جیسے دوبئی کے ریگزاروں تلے پتھریلی تہوں میں جا دھنسے۔ کندھا آپ ہی آپ اباجی کے کندھے سے جاملا۔ چنانچہ میں بھی ویزا لائن میں کھڑا ہو گیا تھا۔ تیسرے بھائی اکبر کا

ویز املا تو جو تھے سب سے چھوٹے اصغر کو کویت میں پریشانیاں ہونے لگیں۔ عصمی کے آنے سے تھوڑے ہی عرصہ میں وہ دونوں بھی آن پہنچے۔ ایر کنڈیشننگ کا کام جانتے تھے لیکن نئی جگہ' راستے نامعلوم۔ انہیں اپنی چھوٹی سی موٹر سائیکل پہ بٹھا کر کمپنیوں کے چکر لگاتا رہا۔ بار بار ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے بڑے بھائی کا گورنر راج سمجھا اور چار دن ایک جگہ کام کیا پھر چھوڑ چلے آئے۔ ضرورت پڑی تو بھابی سے سفارش کروادی کہ کام پسند نہیں اور یوں پھر نئے سرے سے بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔ انہیں مرضی کی ملازمتیں ملیں تو ہی ان کی طبعیت میں ٹھہراؤ آیا۔

عصمی نے اینٹوں سے بنے اس مکان کو گھر اور سچ مچ' پیار کا مندر' بنا دیا۔ وہ صبح تاروں کی چھاؤں میں اٹھتی۔ ہمارے پاس مٹی کے تیل کا چولہا تھا جس کے استعمال میں اکثر ہاتھ تو کالے ہوتے ہی تھے' کبھی کبھی چہرے پہ جھولتی لٹیں ہٹاتے از خود ہی ماتھے' گالوں یا ٹھوڑی پہ "نظر بٹو" بھی لگ جاتے تھے۔ صبح سب سے پہلے اکبر اور اصغر نے جانا ہوتا تھا۔ ان کا ناشتہ اور ٹفن تیار ہوتے۔ ایر پورٹ والے بھیا کی شفٹ ڈیوٹی صبح' کبھی شام یارات کو ہوتی۔ ان کی تواضع ان کے حساب سے ہوتی۔ میری لیبارٹری کا وقت تاخیر سے تھا۔ وہ برتن دھو دُھلا کر فارغ ہوتی تو میری باری آجاتی۔ ہر کسی کی خدمت اس کے اپنے اوقات کے مطابق کرنی پڑتی۔ واشنگ مشین بھی نہ تھی۔ ہمارے جانے کے بعد دھلائی شروع ہو جاتی۔ جرابوں سے لے کر بستر کی چادروں تک۔ جینز' انڈرویر' قمیضیں سب کچھ ہاتھ سے دھوتی۔ اس کے بعد گذشتہ روز کے سوکھے کپڑے استری ہوتے۔ کمروں کی صفائی' دوپہر کا کھانا' رات کی تیاری۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں ایک ملازمہ بیاہ لایا تھا۔ نئی نئی آئی تھی اس لئے دائیں بائیں کہیں کوئی اس کی سہیلی' رشتہ دار بھی نہ تھی کہ وہ کچھ وقت گذاری کر لیتی۔ باپ کی شہزادی کو جیسے برتن میں ڈال دیا گیا تھا اس نے اسی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ گھریلو ملازمین عرب گھروں میں تو تھے ہمارے دیسی افسران اپنے چھوٹے ملازمین کو کمپنی کے خرچہ پر نوکروں کی

جگہ استعمال کرتے تھے اور میں ابھی اس مقام پہ نہ پہنچا تھا کہ ملازم رکھ سکوں۔ سوچیں احساس کو ڈس رہی تھیں لیکن خاموشی سے دیکھنے کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ ایک شام آفس سے لوٹا تو وہ کپڑے دھو کر صحن میں رسی پہ پھیلا رہی تھی۔ گرمی کا موسم' پسینے میں شرابور' شاعروں کی شاعری کا بیڑہ غرق کرتے چہرے سے چمٹے بکھرے بال۔ اگرچہ اسے میک اپ کی کبھی ضرورت نہ تھی لیکن خاوند دل میں ڈھیر سارا پیار لئے ڈیوٹی سے لوٹے اور گھر پہ اسے جانگلوس بھتنی ملے تو وہ کیا کرے؟ بس مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔

"ہم سب 'خارجی" یہاں آتے اور اپنی اپنی زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔۔۔" میں نے اپنے اندر کی تلملاہٹ کو دبا کہا۔ "ایسے لوگوں کی اکثریت یہاں "چھڑے" رہتی ہے۔ سب اپنے کپڑے خود دھوتے اور استری کرتے ہیں۔ میں نے بھی برسوں اپنے یہ کام کئے ہیں اور وہ میرے ہی بھائی ہیں۔۔۔" میں نے اپنے لہجے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "انہیں بھی اپنے یہ کام خود کرنے دو۔۔۔"

" میں نے تو آپ سے کام کی کوئی شکایت نہیں کی جی!۔۔۔" اس نے بے چین ہو کر جواب دیا۔ "آپ سب کے سوا میرا یہاں ہے ہی کون؟ اور وہ میرے بھی چھوٹے بھائی ہیں جی!۔ آج انہیں پیار دوں گی تو کل مجھے بھی عزت پیار ملے گا۔۔"

میرا جی جل گیا۔ واقعی چکنے گھڑے پہ پانی کی بوند نہیں ٹھہرتی۔ دراصل وہ اک چھوٹے سے شہر کے ایسے گھر کی بیٹی تھی جہاں سوتیلے بہن بھائی بھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر جیتے تھے۔ مندر میں مسجد کا تقدس لے کر پلی بڑھی تھی وہ۔ اور گھر کی چار دیواری سے باہر والے چھل کپٹ اس نے ابھی تک نہ سیکھے تھے۔ میری یہ نصیحت اس نے اپنے رشتوں میں گوندھ ڈالی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔ اور ابھی تک اس کو

جاننے کے بعد مجھے یقین تھا وہ ایسا ہی جواب دے گی۔ میں نے تہہ دل سے اس کے لئے دعا کی
کہ اسے کبھی کوئی تلخ تجربہ نہ ہو۔ بہر کیف میری طرف سے اتمام حجت ہو گیا تھا۔
اور پھر دن مرغولوں کی طرح وقت کی گود میں تحلیل ہوتے گئے۔ اس ریشم کی گرہیں کھلتی
گئیں۔ بچپن کی باتیں' معصوم گنگتی کہانیاں۔ اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تو تھی ہی۔
لیکن اس کا اندازِ بیاں بھی جداگانہ تھا۔ بہت سادگی سے بلا جھجک وہ اپنی بات کہہ جاتی تھی۔
اللہ نے اسے حسن تو ڈھیر دیا تھا لیکن اک چھوٹی سی کمی پھر بھی رہ گئی کہ اسے ناز و ادا سے
شرمانا لجانا نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی میرا اس پہ جی جل جاتا۔ بہت جی چاہتا اس کی آنکھوں میں
تارے دمکیں، گالوں میں شفق پھوٹے اور وہ ایک بار پھر "ہائے دیا" کہہ کر ہتھیلیوں میں اپنا
چہرہ ڈھانپ لے۔ لیکن اب لگتا تھا وہ پرائے دیش آتے آتے اس لجا اور نینوں میں میخانے
لنڈھانے والے لال ڈوروں کو جیسے وہیں کہیں چھوڑ آئی تھی۔ نئی نویلی دلہن یا محبوبہ کی بجائے
اس نے سیدھی سادی گھر والی کا روپ دھار لیا تھا۔ اور شاید ہر روز میں نے کسی نہ کسی بات پہ
ضرور سوچا" وہ پہلے ہی سے زندگی میں آ جاتی تو زمین سے آسمان تک میری ساری راہیں
درخشاں ہو چکی ہوتیں۔ ریشمی دھاگوں کی طرح سوچ کی گرہیں کھل بکھریں تو میں نے اس
کے ارد گرد پیار کی اتنی قندیلیں فروزاں کر دیں کہ انتظار میں کھوئے آٹھ سالوں کا دھندلکا
اسے کہیں دکھائی نہ دے۔ بس لگے وہ جنم جنم سے میرے ساتھ ساتھ تھی۔
نئے سال 1975 میں اس نے مجھے ایک بیٹی کا تحفہ دیا۔ اک اک دن ہم نے اس کا انتظار کیا
تھا۔ اس ننھی سی جان نے آتے ہی ہمارے ناموں کے ساتھ "امی" اور "ابو" کے اعزازات
لگا دئے۔ اس کی دیکھ ریکھ کرتے' توتلی باتیں کہنے' اور اس سنگ کھیلنے لگے تو وقت نے
ہمارے نقوش و کردار بدلنے شروع کر دیئے۔ میرے دل کے دروں خانوں میں آپ ہی آپ
عصمی کا شیش محل بس گیا۔ اس کا وجود میرے لئے مسیحا تو تھا ہی' لیکن بیٹی کے اوپر جھکی وہ
اس سے چہلیں کر رہی ہوتی تو ممتا کے لمس سے فضا میں ہر سو پاکیزگی ہلکورے لینے لگتی۔ پھر

کچھ تین ماہ گزرے تھے کہ میرا موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پلستر کروانے کے بعد میری نرسنگ زمہ واری بھی اس پہ آن پڑی۔ لیکن اس خدا کی بندی کے معمولات میں کچھ فرق نہیں پڑا۔ کچھ بہتر ہوا تو علاج کے لئے پاکستان گیا۔ ادھر جا کر معلوم ہوا کہ ماں کا دایاں حصہ تقریباً" ناکارہ ہو چکا تھا۔ بائیں بازو سے لپیٹ کر انہوں نے بہو اور پوتی کو سینے سے لگا لیا۔ اور مجھ سے شکوہ کیا۔

"تم میرے سبھی بیٹوں کو لے گئے ہو۔۔۔" انہوں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا۔ "وہاں اپنا گھر بسا کر یہاں مجھے اکیلی کر دیا ہے۔ اب تم ہی انہیں واپس لے کر آؤ گے۔۔۔" ان کا حکم نامہ سن کر میں مزید ایک روز اسلام آباد میں رک گیا۔ شام تک اپنے کاروبار کے لئے مناسب جگہ دیکھی اور ماں سے وعدہ کر لیا کہ اگلے سال سے پہلے ان کا سب سے چھوٹا بیٹا واپس آجائے گا" پھر دوسرا' تیسرا اور سب سے آخر میں خود میں بھی۔ بس آپ ٹھیک ہو جاؤ۔۔۔"

میں دو ماہ پاکستان رہا۔ ڈاکٹروں نے سرجری کروانے سے منع کر دیا کہ نقصان کا احتمال زیادہ ہے۔ اور پہلوانوں نے سختی سے مالش کروانے سے منع کر دیا۔ چنانچہ ٹانگ بیچاری اپنے ہی بھروسے پہ چلتی چلتی بہتر ہو گئی۔ دوبئی واپس لوٹے تو گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ صحن اور برادران کے کمرے میں ٹی وی' فریج اور بڑے بڑے میوزک سسٹم پڑے تھے۔ میرے جانے کے بعد انہیں کھل کھیلنے کا موقع ملا تھا انہوں نے۔ مجھ سے پوچھنا' مشورہ کرنا تو درکنار' پاکستان قیام کے دوران ذکر تک کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ میں ہی بیوقوف اپنے ساتھ ان کی کمائی پہ بھروسہ کر کے ماں کو تسلیاں دیتا رہا کہ ایک بیٹا اسلام آباد میں اپنا بزنس سیٹ کر لے تو سب انہیں واپس مل جائیں گے۔ میرا یہ وعدہ ایفا نہ ہو پایا اور اس کی سزا یوں ملی کہ اگلے سال جنوری 1976 میں ماں ہمیں چھوڑ گئی تب کوئی بھی بیٹا پاس موجود نہ تھا۔ دوسرے بھائیوں کی چھٹی پیچھے بھاگتے میں ان کی دعا بھی نہ لے سکا۔ ہم صرف انہیں سپردِ

خاک کرنے ہی پہنچ پائے۔ اگلی صبح عصمی اور میں میانی صاحب قبرستان گئے۔ قرآنِ پاک ہاتھ میں لئے اس نے تلاوت شروع کی تو رگ و پے میں میری روح تک وجد میں آ گئی۔ اس کے سارے ہی سر آفاقی تھے۔ چند ہی آیات کے بعد شاید وہ خود بھی اپنے آپے میں نہ رہی۔ میں نے ارد گرد کام کرنے والے گورکنوں اور چند گز دور سڑک پہ آتے جاتے راہ گیروں کو رک کر اس کی قرأت سنتے دیکھا۔ چہرے پہ اس قدر اجلاپن چھایا جیسے کہکشاں نے اس پر سایہ کر دیا ہو۔ میں نے بھی جان لیا کہ اس نے مندر کو کیسے مسلمان کیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے جب وہ تلاوت کرتی ہو گی تو وہاں سارے دیوی دیوتا اپنے چبوتروں سے اتر کر کائینات کے خالقِ حقیقی کو سجدہ کرتے ہوں گے۔ میں اس کے سامنے گنگ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ میری ہستی میں اس کے لئے جابجا پیار کے جھرنے پھوٹ رہے تھے کہ یکبارگی اک خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ اسے کھو دینے کا خوف۔ شاید جس جگہ ہم بیٹھے تھے اس کی تاثیر ہی ایسی تھی کہ پھر یہ خوف کبھی میرے وجود سے مٹا نہیں۔

کچھ ہی روز گذرے تھے کہ خود اباجی کو اک نئی سوجھی۔ ایک روز ہم چاروں بھائیوں کو ایک ساتھ طلب کر لیا۔ صوفے پر براجمان تھے۔ سامنے میز پر قرآنِ پاک اور اس کے اوپر چار تہہ بند پرچیاں رکھی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں ایک پل بھی نہ لگا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ میں نے برملا ان کی منتیں کیں کہ وہ ایسا کام نہ کریں لیکن وہ نہ مانے اور مجھے پرچی اٹھانے کے لئے کہا۔ میں نے معذرت کر لی تو انہوں نے سب سے چھوٹے اصغر کو حکم دیا اور پھر پرچی کھول کر پڑھی۔ گلی میں ساتھ ساتھ ہمارے ایک ہی جیسے تین مکان تھے۔ پہلا کونے والا اس کے نام نکل آیا۔ درمیان والا اکبر کے نام اور اس سے آگے والا افتخار کا۔ ہم سب اسی آنگن میں پیار سے پلے بڑھے تھے۔ اسی بھائی چارے' سلوک سے رہتے ہم بھی سفر آخرت پہ نکل سکتے تھے لیکن آج ان پہ تیرا میرا نام کے لیبل لگ گئے تھے اور یہ فیصلہ اللہ' رسول اور قرآنِ پاک کے نام پر ہوا تھا۔ اس لئے اسے قبول کرنا ہی تھا۔ آخری پرچی اٹھانے کی مجھے ضرورت

ہی نہ آئی۔ وہ ہمارے ساہیوال والے گھر کا ملکیت نامہ تھا۔ وہیں وسیع رقبے پہ پھیلی ہماری زرعی زمینیں اور دادا کے نام پہ آباد کوٹ خادم علی شاہ بھی تھا۔

دل بہت بجھ گیا۔ جس کی فضاؤں میں میرا بچپن' جوانی اور میرے خواب رچے تھے اس شہر نے بھی یکدم سے مجھے بیگانہ کر دیا۔ ادھر چھٹیاں بھی ختم ہونے پہ آگئی تھیں۔ عصمی مزید کچھ روز اپنے مائیکے میں رکنا چاہتی تھی۔ میں اسے وزیر آباد چھوڑنے گیا۔ صبح پلکھو کنارے شاہ جی کے ہوٹل سٹاپ پہ اترے تو دیکھتے ہی کام کرنے والے بھاگے آئے اور سامان اٹھالے چلے۔ بے حد خوش تھے وہ سب۔ ان کے دکھ سکھ کی سانجھ کرنے والی جو آئی تھی۔ گلی تک پہنچتے پہنچتے اس کی مہک پوری ریلوے کالونی میں پھیل گئی اور عصمی پھر سے "گوگی بی بی" ہو گئی۔ گھر گھر سے چھوٹے چھوٹے بچے' بچیاں' اس کے نام کا اعلان کرتے دوڑے چلے آرہے تھے۔ کچھ ہی وقت میں عورتوں لڑکیوں کے وفد بھی گھر میں آن جمع ہوئے۔ سسر جی مندر کے تھڑے پر براجمان تھے۔ میں ان کے پاس آبیٹھا۔ وزیر آباد کا شیر "شاہ جی" کافی نحیف ہو چکے تھے۔ ایک حکیم حاذق ان کے پاس بیٹھا تلقین کر رہا تھا۔

"شاہ جی! یہ دوائیاں آپ نے باقاعدگی سے کھانی ہیں۔۔۔" اور شاہ جی ایسے سن رہے تھے جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ "اور آپ نے باسی چاول سے سخت پرہیز کرنا ہے۔ اچار اور دہی وغیرہ بھی نہیں کھانا۔۔۔" وہ بس خلاء میں دیکھتے رہے۔ منہ سے کچھ نہیں بولے۔ حکیم اپنی فیس لے کر شاید گلی کے وسط تک پہنچا ہو گا کہ وہ صحن کی طرف منہ موڑ کر دھاڑے۔

"اوئے پتہ کر ورات کے چاول ہیں تو ان پر دہی اور ڈھیر سارا اچار ڈال کر لاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔۔۔"

مجھے یقین ہے اس گھر میں کسی کی ہمت نہ ہوتی لیکن چاولوں کی پلیٹ پر پڑا اچاٹی کا دہی اور اچار کا انبار سچ مچ آگیا تو میں نے پوچھ لیا۔

"ماماجی! حکیم تو آپ کو منع کر کے گیا ہے کہ یہ چیزیں نہیں کھانی۔۔۔۔"

"منع کر کے نہیں مجھے یاد دلا کر گیا ہے کہ کھانے کے لئے یہ نعمتیں بھی ہیں۔۔۔"

انہوں نے کمال بے نیازی سے میری بات کاٹ دی اور سب کچھ ملغوبہ بنا کر کے کھانے لگے۔ میں نے سوچا۔ طبعیت میں اتنی جولانی بھی نہ ہو تو آدمی زندہ ہی کب رہ جاتا ہے؟ اور یوں بھی مروجہ اخلاقی آداب ہیں کہ پھڑکتی ہوئی لو کو پھونک مار کر بجھانے کی بجائے ٹمٹمانے دیا جاتا ہے۔ مجھے شک تھا کہ پھر جو پاکستان آؤں گا تو شاید ان کی صرف کہانیاں ہی باقی رہ گئی ہوں گی وہ خود نہیں ہوں گے۔ میری واپسی کے چند ماہ بعد ایک صبح گھر والوں کے بیچ صحن میں کرسی پر بیٹھے "شاہ جی" نے آواز دی۔ "ارے کوئی پانی تو پلاؤ۔۔۔" صرف چند ہی سیکنڈ بعد پانی کا گلاس ان کے سامنے کر کے آواز دی گئی تو "شاہ جی" کی آنکھیں مندی تھیں اور وہ طلب کی منزلوں سے بہت آگے جا چکے تھے۔ سوگواروں میں پیچھے رہ گئیں آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا چھتر ڈال کر چہرے پہچاننے والی دو کمر خمیدہ سوکنیں۔ انہوں نے پہلے درگذر کی راہ اختیار کی تھی۔ اب جب انہیں اندازہ ہو چکا کہ ان کے بیچ باعثِ نزع بھی کچھ نہیں رہا۔ اور ان کا ساتھی غول رختِ سفر باندھ کر صرف اپنی اپنی باری کے انتظار میں ہے تو ان میں ایثار بھی آ گیا تھا۔ بڑی کو بخار ہو گیا تو چھوٹی رات بھر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بدلتی اور اس کا بدن دباتی رہی۔ ان دونوں کے لئے ملک الموت کی سواری البتہ کافی تاخیر سے آئی۔ پہلے چھوٹی کو اور پھر کچھ عرصہ بعد بڑی کو اچک لے گئی۔ کتنی ہی کہانیاں' بے حقیقت' خاک نشیں ہو گئیں۔ اک پورا دور ہی ختم ہو گیا۔

میرے ڈیوٹی پہ پہنچنے کے دس پندرہ روز بعد افتخار بھی آ گیا۔ اس کی بحیثیت شفٹ انچارج کارگو ایرپورٹ ترقی ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ اچانک اس نے استعفیٰ دے دیا اور پاکستان لوٹ گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمرے کی صفائی کرتے مجھے اپنے خالو جان (اس کے سسر) کا

ایک خط ملا۔ وہ محکمہ پی اینڈ آر میں خاصے اثرورسوخ والے سیکشن آفیسر تھے۔ انہوں نے لکھا تھا۔ "تم پاکستان آ جاؤ تو میں تمہیں اپنے محکمے سے فٹ پاتھ' سڑکیں اور پل بنانے کے ٹھیکے دلا سکتا ہوں۔ لاکھوں کی کمائی ہے۔ تمہیں دوبئی سے کیا ملے گا۔۔۔؟" درحقیقت یہ خالہ کے ذہن کی اپج تھی۔ شاید انہوں نے چھٹی دوران سمجھایا ہو گا کہ "یہاں بھرا پرا گھر ہے کسی دوسرے سے پہلے آ جاؤ گے تو سب کچھ تمہارا ہی ہو گا"۔ تبھی اس نے مجھ سے مشورہ تک کی زحمت نہ کی۔ بہر کیف لنکا ڈھانے کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا۔ اباجی کو سنبھالنے کے بہانے مال غنیمت پر ان کی بیٹی اور داماد کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ "گوگی بی بی" کو اپنے ہی جہیز کا کپڑا پکا اس تک تبرکا" نہ ملا کہ اپنے بچوں کو دکھا کر وہ بتا سکتی "اس کے ابا نے گجرات میں سوہنی کی دوکان سے خرید کر دیا تھا۔۔۔"

اکبر اور اصغر بھیا چھا کمانے لگے تو اباجی نے فرائض منصبی سے فارغ ہونے کی خاطر آگے پیچھے دونوں چھوٹی بہنوں کے علاوہ ان کی بھی شادیاں کر ڈالیں۔ پتوار نئی نسل نے سنبھالے تو ادب لحاظ' رشتوں کی اقدار بدل گئیں۔ بیٹے کی پیدائش کے لئے عصمی اور میں ہسپتال میں تھے واپس لوٹے تو اصغر مع بیگم اپنا سازوسامان لے کر جا چکا تھا۔ اکبر کی بیگم پاکستان سے آئی تو وہ ایرپورٹ سے سیدھی شارجہ لے گیا جہاں دونوں بھائیوں نے مل کر ولا لے رکھا تھا۔ وہ جڑواں تھے اور اب انہیں بڑوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔ یہ وہی بھائی تھے جن کے لئے میں نے ویزا دینے والوں کے بچوں کو تقریباً" دو سال بلا معاوضہ پڑھایا تھا۔ ملازمتوں کی عرض گذاری کے لئے دھکے کھائے اور لوگوں کے دفتروں یا گھروں کی گھنٹوں دربانی کی تھی۔ عصمی کو بھی "تمغۂ خدمت" مل گیا۔ بھائی مان کر اسے ان کے کپڑے دھونے' تاروں کی چھاؤں میں استری کرنے اور ٹفن تیار کر کے دینے کی عادت پڑ گئی تھی اب گھر ایکدم سے خالی ہوا تو وہ باولا گئی کہ اس کے پیار اور 'خدمت' میں کوئی کسر رہ گئی تھی کیا؟ تبھی اوپر والے کی رحمت جوش میں آ گئی۔ ہمیں بھی کرامہ میں سرکاری رہائش مل گئی۔ بچوں کے ساتھ ساتھ

وہ اپنے اس گھر کو ترتیب دینے میں مشغول تو ہو گئی لیکن برسوں اسے ان کا انتظار رہا۔ ان کی گاڑیاں صبح شام ہم نالائقوں کے موٹر سائیکل والے گھر سامنے سے گذرتی رہیں کسی نے پل بھر رک کر یہ نہیں پوچھا۔ "تم لوگ ہو یا گزر گئے۔۔۔؟؟"

زندگی بہر کیف آگے ہی بڑھتی ہے۔ اب صرف میرا اور عصمی کا ساتھ رہ گیا تو دکھ سکھ' باہمی مشورے اور رازونیاز کے ساتھ ساتھ سانسوں کی ایسی سانجھ ہو گئی کہ میں اس کے بغیر بالکل ادھورا' نامکمل ہو گیا۔ رشتہ داروں کے حقوق العباد ادا کرنا' غریبوں ناداروں کی مدد کرنا' مساجد اور ادارے' خلق سے خالق تک' سب طرف نگاہ تھی اس کی۔ ہماری مدد چند سو یا ہزار تک ہی ہوتی تھی' لاکھوں کروڑوں دان کرنے کے قابل نہ تھے لیکن اس کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی بہن بھائیوں کی لسٹ تیار ہوتی۔ عزیز و اقارب' محلے دار، ملنے ملانے والے۔ فلاں بیوہ کی بیٹیوں کی شادی ہونی ہے' فلاں بیمار کا علاج ہونا ہے۔ کئی بار وہ اپنی بساط سے بھی بڑھ جاتی۔ ہم سب اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ اباجی اور ماں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ اب مجھے موقع ملا تو انہی کی طرح میں نے بھی ثواب' جزا میں "ففٹی ففٹی" حصہ داری کے عوض اپنی کمائی پر عصمی کو پورا اختیار سونپ دیا۔ ماں اور عصمی دونوں ایک ہی خاندان سے تھیں' دونوں کا ہاتھ بھی بہت کھلا تھا۔ اور ناجائز کمائی یا رشوت خوری سے میرا دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ پھر مجھے کب' کہاں سے اور کیسے رزق ملا؟ یہ دینے والا ہی جانے۔!!

اباجی کی ایران' عراق' شام زیارات کی شدید خواہش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ ان کی تکمیل آرزو کر سکوں۔ زیارات سے لاہور واپسی پہ دوبئی سے گذرے اور ہمیں تاکید کر گئے کہ اسی سال 1978 میں' افتخار کے ساتھ دوبارہ حج کے لئے جائیں گے۔ ادھر سے ہم بھی آ جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔ میں دین مذہب کے معاملہ میں زیادہ جذباتی نہیں ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ بیت اللہ کا رخ صرف تبھی کرو جب تمہارے سینے میں ہوک جاگ جائے۔ پیسے زیادہ ہیں تو کسی مریض یا بے کس و بے آسرا بچی' بیوہ کی مدد کر دو۔ سکول کے

ابتدائی دنوں میں ہی علامہ اقبال نے سبق پڑھایا تھا کہ دین ملا اور ہے۔ لہٰذا میری اور اس کی نہیں بنتی۔ جتنا سمجھ میں آئے اور دل مانے وہی کافی ہے۔ ابا جی کو تو میں نے یونہی سرسری انداز میں "دیکھیں گے" کہہ دیا۔ لیکن دل نے سینے میں واویلا مچادیا کہ "انڈیا' پاکستان سے اکثریت لوگ ڈھیر گناہ کرنے کے بعد بوڑھے ہو کر انہیں بخشوانے حج پر جاتے ہیں اور تمہارے کندھوں پہ رکھی پٹاری تو ابھی ڈھیر خالی ہے۔ اس بخشنے والے کے سامنے شرمندہ ہونے کی بجائے اچھاہے اطراف کی کسی گلی سے نکل لو۔ لیکن ادھر ایسی تگڑی سفارش پاکر" گوگی بی بی" شیر نی ہو گئی۔ اس نے تو شادی کے بعد سب سے پہلی فرمائش ہی "حج کروادو۔" کی تھی۔ اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن گذرے شادی کئے' کپڑا مانگا نہ گہنا' اور یہ چلی ہیں 'بی حاجن' بننے۔ لیکن اب تو اسے اپنی طاقت کا اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں اور پیار سے بات منوانے کی ادا سے میں ہمیشہ ہی ہار جاتا ہوں لہٰذا ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ویزے لگ گئے' ٹکٹیں بھی لے لیں تو اک نئی افتاد آن پڑی۔ بچے سخت بیمار ہو گئے۔ نمونیا کا اندیشہ تھا۔ مصری لیڈی ڈاکٹر نے عصمی کو بہت کڑوا لیکچر پلایا کہ بچوں کی ذمہ واری حج سے پہلے ہے چنانچہ اس نے اپنا جانا منسوخ کر کے مجھے اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ میں سٹپٹا گیا کہ حج کا شوق تو اس کا تھا اور اب مجھے ایرپورٹ کے اندر دھکیل کر وہ ہاتھ ہلا ہلا الوداع کہے گی؟ یہ تو وہی سردار جی والا لطیفہ ہو گیا کہ کسی رشتہ دار کو ٹرین پہ بٹھانے گئے۔ دیر سے اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ سردار جی نے نہ صرف اسے دوڑ کر چڑھ جانے کے لئے کہا بلکہ عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ مسافر بیچارہ سامان اٹھائے اسٹیشن پہ کھڑا رہ گیا اور سردار جی دروازے میں لٹکے ہاتھ ہلاتے چلے گئے کہ لو جی بھلا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ میں نے سوا۔ "نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر جانے کا تو میں تو سوچنے کو بھی تیار نہیں۔۔" لیکن میری مردانہ حمیت اپنی ایسی بے بسی کا اظہار کرنے کی اجازت نہ دے رہی تھی۔ جھنجھلا کر میں نے کہا۔

"بھلا یہ بھی کوئی عمر ہے حاجی صاحب کہلانے کی؟ نماز' روزہ' ضمیر اور محلے دار ٹوکنے کے لئے کیا کم ہیں کہ حج کو بھی ٹوکتے رہنے کے لئے ڈنڈا تھما کر کندھے پر بٹھالو۔ "یہ اچھا نہیں' وہ بہت برا ہے۔ اور راہ چلتے کسی یلا یلی' فل فلوٹی کو دوسری بار دیکھنے لگو تو وہ کمر میں کچوکے دیتا "اسلام خطرے میں" ہونے کا فتویٰ صادر کر دے۔۔۔" میں نے سعادت حسن منٹو کی اصطلاحات استعمال کیں۔ "نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔

میں نے فیصلہ دے دیا۔ لیکن آسمان ہی میری ایسی تیسی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مکہ میں اباجی کو دونوں پاؤں پہ ایگزیما ہو گیا۔ وہاں حرم کے درجنوں دروازوں پر لاکھوں چپلیں جمع ہوتی ہیں۔ کہاں اتاری' کون لے گیا۔ کس کو معلوم؟ ربر کی گیلی چپل پہ ان کا پاؤں آیا اور پرانی الرجی تازہ ہو جاتی تھی۔ ان کے اس مرض کا علاج صرف میرے پاس تھا۔ دورانِ تعلیم کالج کی چھٹیوں میں اباجی کے دوست احباب کی فارمیسیوں میں شوقیہ کام کیا کرتا اور محلے' رشتہ داروں کا 'ڈاکٹر آن کال' ہوا کرتا تھا۔ بس اوپر والے نے میرے گلے میں رسی ڈال یوں گھسیٹ بلایا کہ میں سچ مچ بیت اللہ کے سامنے مبہوت بیٹھا کائنات کے اس خوبصورت ترین خوابِ مجسم کو دیکھے گیا۔ میرے رفیقِ کار حاجی اقبال کا کہنا تھا اس حرم میں داخل ہوتے ہی بیوی بچے' اپنا پرایا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ لیکن وہ جو میری رگ رگ میں بسی دھڑک رہی تھی یہاں مجھے اور بھی زیادہ بے چین' بے کل کر گئی۔ میں نے سوچا۔ "وہ یہاں ہوتی تو اس سحر آفریں خواب کو اپنی آنکھوں میں کیسے سمیٹتی؟" کعبہ کے گرد ہجوم کا تلاطم دیکھ کر میں نے بے چینی سے سوچا۔ وہ حجرِ اسود تک کیسے پہنچ پاتی؟ آبِ زمزم کا گھونٹ بھرا تو اس کی عقیدت یاد آئی۔ دوپٹہ سر پہ لپیٹے' دعائیں بدبداتے وہ امرت دھارا پیتی۔ اس کی باتیں' یادیں میری رگ رگ میں رچی گھلی تھیں۔ دل صنم آشنا تھا بھولتا کیسے؟ کعبہ کے گرد طواف کرتے کتنی بار لگا ارد گرد چہروں میں وہ بھی تھی۔ بچے بھی بہت یاد آئے۔ ان کا بخار اترا یا نہیں؟ تین منٹ

خیریت پوچھنے کے لئے مجھے گھنٹوں ٹیلیفون آفس میں لائن ملنے کا انتظار کرنا پڑا۔ موبائیل کی سہولت ہوتی تو روزانہ اس کا حال پوچھتا۔ پھر میں نے اپنا ہی طریقہ اپنایا۔ کعبے والے کی چوکھٹ پہ بیٹھ کر اپنے رب سے ڈھیروں باتیں کیں' اس کے لئے دعائیں کیں اور جی بھر کے اپنے پیاروں کو یاد بھی کیا۔ فطرت نے ان رشتوں کو گوندھا ہی ایسے مقناطیسی عناصر سے ہے۔ لوگ اپنا عرفان ظاہر کرنے کے لئے یونہی جھوٹ بولتے ہیں کہ کوئی یاد نہیں آتا۔

ابا جی کا علاج ہوتا رہا اور پاؤں پہ پٹیاں لپیٹ کر ارکانِ حج بھی ادا ہو گئے۔ دور سے جبلِ رحمت پہ طلب گاروں' نیاز مندوں کی یلغار دیکھی۔ جی میں آیا کاش میں بھی وہ مقام دیکھتا جہاں آدم و حوا ملے تھے۔ تبھی میری پسلیوں میں اک کچوکا لگا اور کانوں میں جیسے سرگوشی ہوئی۔

"آدم کی اولاد ہو۔ ان کی پسلی کھو گئی تھی۔ اسے ڈھونڈتے یہاں آئے تھے۔ تم تو آدھے ادھورے نہیں ہو۔ صدقِ دل سے یاد کرو اور اگلی بار اس کا ہاتھ تھامے آنا۔۔۔؟" آپ ہی آپ میری راہیں روشن ہو گئیں۔

اب مدینہ منورہ مجھے بلا رہا تھا اور میری دوبئی واپسی بھی وہیں سے طے تھی۔ جگہ جگہ پاکستانی اور کچھ بھارتی حجاج سے سنا کہ مدینہ میں چالیس نمازیں پوری کرنی ضروری ہیں۔ میں نے معلمین سے اس شرط کی فضیلت پوچھی تو مکہ اور مدینہ دونوں جگہ سے عربی اردو میں جواب ملا۔

"یہ تم پاکستانی و ہندی لوگ ہی چالیس نمازوں کا بولتے ہو۔ کون سا کتاب میں ہے ہم کو تو معلوم نہیں۔ تم کو معلوم ہو جائے تو ہم کو بھی خبر کرو۔۔۔۔"

مجھے کوئی کتاب ملی نہ میں نے تلاش کی۔ اندازہ ہو گیا کہ یہ خبر بھی کسی ملا کی اڑائی ہوئی ہے۔ ابا جی اور افتخار ایک بار پہلے بھی مدینہ منورہ سے ہو آئے تھے اور اب کچھ تاخیر سے ان کا دوبارہ جانے کا پروگرام تھا۔ میرے پاس گنے چنے دن تھے۔ چنانچہ طوافِ الوداع کے ساتھ اجازت لی۔ کانوں میں قوال بتھائے کہ آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبی سے۔ اور کیفیتِ جذب میں اپنے آپ سے بھی آگے آگے چلا۔ وہ گنبدِ خضرا دور ہی سے نظر آ گیا اور پھر احساس پہ یوں محیط ہوا

کہ سارا مدینہ او جھل ہو گیا صرف وہی مرکز رہ گیا جس کی جانب تیزی سے کھنچتے میں نے اپنے آپ کو باب السلام کے سامنے پایا۔ کتابوں میں پڑھا تھا' خطیبوں سے سنا تھا اور فلموں میں دیکھا تھا کہ حضور ﷺ جب مدینہ میں وارد ہوئے تھے تو لوگ جوق در جوق آپؐ کی زیارت کرنے امڈتے چلے آئے تھے۔ میں نے اپنے ارد گرد سے گذرتے ہجوم کو دیکھا اور جانا کہ چودہ سو سال بعد بھی مدینہ منورہ کا منظر وہی ہے۔ وہی تڑپ' وہی پیار' وہی چاہ ہے کہ ہر کوئی دیوانہ وار دیارِ رسول ﷺ پہ عقیدتوں کے پھول چڑھانے چلا آرہا ہے۔ مجھے نماز کے لئے منبرِ رسولؐ سے کوئی دو فٹ فاصلے پر جگہ مل گئی۔ میرے دامن میں جتنے بھی پھول تھے میں نے وہیں قدموں میں ڈال دیئے۔

مکہ میں اک بھاگ دوڑ اور ہیجانی کیفیت تھی جن کے بیچ اپنی سوچوں کو بہلانا' جھٹک لینا آسان تھا۔ لیکن مدینہ میں فرصت زیادہ تھی۔ زیارات ایک روز میں مکمل ہو گئیں اور پھر روضہ مبارک کے گرد منڈلاتے' نمازیں پڑھتے میرے خون میں آپ ہی آپ "پیرانہ Pirana مچھلیوں" کی فصل اُگ آئی جو تیز نوکیلے دانتوں سے میرے دل کو ریزہ ریزہ کترنے لگی۔ بچپن سے قوالوں کو مدینے کی گلیوں' خاک سے لپٹے رہنے کی آرزو کرتے سنا ہے۔ یہ عقیدت میرے دل میں بھی ایسی جڑیں پکڑ چکی تھی کہ میں اندر کی بے چینی سے اپنی ہی نظروں میں چور بن گیا۔ چوتھے روز میرے سارے آئینے تڑخ گئے کہ "جسے شوقِ سجدہ تھا اس بارگاہ میں' اس طلب آشنا کے بغیر تیری بے رنگ' بے روح نمازوں سے تجھے کیا ملے گا۔۔۔؟" خالی' کھوکھلا میں سعودی ایرلائن کے آفس گیا۔ اگلے روز کی سیٹ مل گئی۔ اجازت لی اور واپس لوٹ آیا۔

میں نے اسے اپنے آنے کی خبر نہیں دی۔ صبح کا اجالا پھوٹ رہا تھا جب میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ نیند کے خمار میں اس نے دروازہ کھولا اور پھر وقت دم لینے کو جیسے وہیں ٹھہر گیا۔ گنگ مجھے وہ دیکھتی رہی کہ کوئی خواب کا سماں ہو۔ میرے سامنے تو امڈتی گھنگھور گھٹاؤں میں

کہکشائیں جگمگ جگمگ دمک رہی تھیں' آنکھیں خیرہ اور سینے میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ میں نے جان لیا جبلِ رحمت پہ ابرِ رحمت کیسے برسا ہو گا؟ پیار تابندہ ہو تو کائنات میں وجودِ زن سے بڑھ کر خوبصورت کچھ بھی نہیں ہے۔ برسوں بعد میں اسے بچوں سمیت بذریعہ کار حج پہ لے گیا۔ اِک عالمِ عشق تھا جس نے اسے مکہ و مدینہ کے حرم میں بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ شاید وہیں کہیں کا اک لطیف سا مرغولہ تھی کہ سیڑھیوں پہ بیٹھے ترنگ آئی' ریلے میں گھل مل گئی اور جتنی بار چاہا حجرِ اسود کو بوسہ دے آئی۔ کبھی یہاں دیوارِ کعبہ سے چپکی ہے' کبھی وہاں۔ روضۂ رسول ﷺ کی جالیوں سے لگی ہے تو کسی نے ہٹایا نہیں۔ ریاض الجنہ میں سکون و اطمینان سے عبادت کی۔ میدانِ عرفات میں ہمارا چار سالہ بیٹا سمیر "بوبی" کھیلتے ہوئے کیمپ سے باہر نکل گیا۔ گھنٹہ بھر بعد بوقتِ کوچ اس کے گم ہونے کی خبر ملی۔ لاکھوں کے ہجوم میں کوئی اسے کہاں تلاش کرے۔ سڑکوں پہ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتے' رورو پکارتے پھرے۔ اور پھر اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھا کر اللہ میاں سے ٹھان لی کہ 'میرا بیٹا دیدے تبھی تجھے مانوں گی'۔ اوپر والا بھی اس وقت کسی روزن سے اپنے بندوں کی لگن دیکھ رہا تھا اسے شاید یہ ادائے بندگی پسند آ گئی۔ دینے والے کا انداز بھی ایسا فی البدیہہ' کہ اسی لمحہ یہ کسی سے ٹکرا گئی۔ آنکھیں صاف کر کے دیکھا تو سمیر کو کسی شخص نے اٹھا رکھا تھا۔ اس نے اسے سونپا اور ہجوم میں کھو گیا۔ اس نے اللہ میاں کے گھر کی چوکھٹ پہ سر رکھ کر اسے مان لیا۔ اس نے اسی ترنگ میں پھر کئی بار اسے بلایا اور ہر بار وہ لبیک کہتی اس آنگن میں طواف کرتی' اس کی ربوبیت کا اقرار کرتی رہی۔ شاید کوئی ابرِ رحمت تھا کہ اس پر سایہ فگن رہتا تھا۔ دینے والے پر کامل ایمان سے مانگتی تھی اور وہ اس کی لاج بھی رکھتا تھا۔

اوائل 1980 کی ایک صبح آفس میں مجھے افتخار کا ٹیلیگرام ملا کہ اباجی کی حالت نازک ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں۔ ایمرجنسی میں لاہور سیدھے ہسپتال پہنچے۔ اپنے سبھی اہل و عیال کو ارد گرد پا کر اباجی کئی دن بیماری سے خوب لڑے اور اسے چت کر کے ہی دم لیا۔ گھر لوٹے تو خدا جانے

کیا سوجھی ساری زمین جائیداد کے مالک کی بجائے مختارِ عام بن گئے۔پھر ہولے ہولے سرگودھا' وزیر آباد' ساھیوال میں زمین مکان بک گئے۔ صرف زرعی زمینیں رہ گئیں۔فوت ہونے سے پہلے ان کا اختیار افتخار کو سونپ دیا توسب بہن بھائی ان کی ادنی پونی نقدی کھری کر کے اپنے اپنے گھر مکان بنانے لگے۔لاہور گھر میں میرا کچھ سامان تھا اس کا نوٹس ملا کہ "اٹھاؤ ورنہ گلی مین پھینک دیا جائے گا۔۔" گھروں کی تقسیم پہ پہلے ہی میرا جی جلا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "اوپر تیل چھڑک کر آگ بھی لگا دینا کہ۔۔عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔۔۔" ہم جو اپنے آپ کو کبھی فرمانروائے کشورِ ہندوستان سمجھتے تھے اب مرزا غالب کی طرح سایۂ دیوارِ یار تلے ڈینگیں مارنے کے قابل ہی رہ گئے۔

عصمی نے ثریا آپا بجیا کے "اپنے گھر" کی تڑپ والے سارے ڈرامے دیکھ رکھے تھے اور چونکہ میرے اور اس کے سبھی بہن بھائیوں کے اپنے اپنے گھر تھے اس لئے اس کی بھی مچلتی ہوئی خواہش تھی کہ ہم بھی "اپنا" ایک خوبصورت سا گھر بنائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی سوچوں اور کمالِ نگاہ میں بسا یہ گھر بکنگھم پیلس یا وائٹ ہاؤس سے کم تو نہ ہو گا۔ لیکن میرے لئے بچوں کی تعلیم سے بڑھ کر کچھ بھی نہ تھا۔ اور انہیں امریکہ' برطانیہ میں پڑھانے کے لئے مجھے ڈھیر سرمایہ درکار تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا ترپ کا پتہ استعمال کیا۔

" تم مستقل پاکستان میں رہنے کا ارادہ کر لو' تاج محل پہ بھی ہاتھ رکھو تو خرید دوں گا۔۔"

بہر کیف پاکستان میں پڑا ہمارا سامان ذہنی عذاب بنتا جا رہا تھا کہ عصمی نے کوشش کی اور کچھ ہاتھ مدد کے لئے بڑھ آئے۔ یوں لاہور میں وہ مسعودہ بی بی' کوٹلی سیالکوٹ میں مقبول بی بی' ڈھوڈووال (قریب سمبڑیال) میں ثریا بی بی اور وزیر آباد میں کھارے سالار کی پناہ میں پہنچ گیا۔ یہ مکافاتِ عمل ہے کہ اِس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو۔ بہنیں بھائی سامان کو پناہ دینے کا احسان کرتے رہے اور یہ دان کرتی گئی۔ کالید اس شبیر شاہ' مقبول بی بی کے میاں' اور ڈھوڈووال

والے پیر گھرانے میں برکات شاہ کے ویزے بھیجے گئے تو ہمارے اور ان کے بیچ دو طرفہ کشادہ سڑک بن گئی۔ ہولے ہولے لاکھوں درہم کا سامان ڈھوڈووال' کوٹلی اور وزیر آباد پہنچ گیا۔ بیش قیمت اے سی' ریفریجریٹر' واشنگ مشین'میوزک سسٹم' ٹی وی' وی سی آر' بہترین کٹلری' ڈنر سیٹ 'سامان کچن' بڑی بڑی پیٹیاں بھر کر زنانہ' مردانہ کپڑا' کمبل' لحاف' چادریں سب کھپ گئیں۔ چاروں بچوں کے لئے ہر شے برابر' کہ جوان ہونے پر سب کو ایک ساتھ بیاہ دیا جاتا تو بھی پریشانی نہ ہوتی۔ اسی خاطر وقت کے سینے پر اپنی تحریریں لکھتا میں سات سال پاکستان نہیں گیا۔ ادھر وقت نے میرے جسم و جاں پر اپنے خدوخال نقش گہرے کر دیئے۔ مجھ سے دور رہتے عصمی کی جان جاتی تھی۔ وہ اپنے خوابوں کے کہرے میں معلق بس ان میں رنگ بھرتی رہی۔

دوبئی آنے کے بعد اس کا برقع میں نے متروک کر دیا تھا اب اردگرد زمانے کا چلن دیکھا تو اسے بھی گاڑی چلانے اور انگریزی بولنے کا شوق ہو گیا۔ گاڑی کے لئے میں نے انسٹرکٹر کا انتظام کر دیا۔ بہت جلد وہ سیکھ گئی اور لائسنس بھی مجھ سے پہلے لے لیا۔ شارجہ سے ہم نے ایک اسٹیشن ویگن خرید لی۔ بہت خوش تھی وہ' کہ ایک محتاجی تو ختم ہوئی۔ اب بچوں کے سکول معاملات' کبھی بیمار پڑنے پر ڈاکٹر' ہسپتال کے مسائل' ان کا کپڑا لتہ' گراسری سب کچھ اس نے اپنے ذمہ لے لئے۔ میں نے انگریزی پڑھانے کی پیشکش کی لیکن وہ آسمان کی وسعتوں میں پر پھیلائے بلا خوف پرواز کرنے والی روح تھی۔ غلط سلط کی پرواہ کئے بغیر وہدیسی' عربی' کالے' گورے' عورت مرد ہر کسی سے بولتی اور زمانے سے سیکھتی رہی۔ اپنی ذات پہ اس کا اعتماد ایسا تھا کہ بہت سکون سے وہ کسی کو بھی اپنا مافی الضمیر سمجھا لیتی اور کٹھن کام بھی بے حد آسانی سے ہو جاتے۔ ہر کسی کے دکھ سکھ میں سانجھ کرنے والی وزیر آباد کی گوگی اس کے جلو میں ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کسی کو ہمدردی کے دو بول' کسی کی بقدرِ استطاعت مالی امداد' وہ اپنی راہوں میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹتی' چھوٹے چھوٹے دیپ

جلائے جاتی۔ شاید اس کے سر پہ ہما کا سایہ تھا کہ کونسلیٹ' امیگریشن' ہسپتال' سکول' جا بجا
ان گنت ہاتھ اسے دعائیں دینے کے لئے اٹھتے تھے۔ قدم قدم وہ میرے ساتھ ساتھ تھی۔
اور میرا اعتماد' میرے اندر کا ایسا شعلہ بن گئی جس کا جوالا پھیلے تو راستوں سے منزلوں تک ہر
سو اجالے بکھیر دیتا ہے۔ میری زندگی میں اک دل پذیر سا ٹھہراؤ آ گیا۔ پاؤں جیسے کسی
مدھر سرگم کے سروں پر ٹھہر گئے ہوں۔

♓♓♓

5
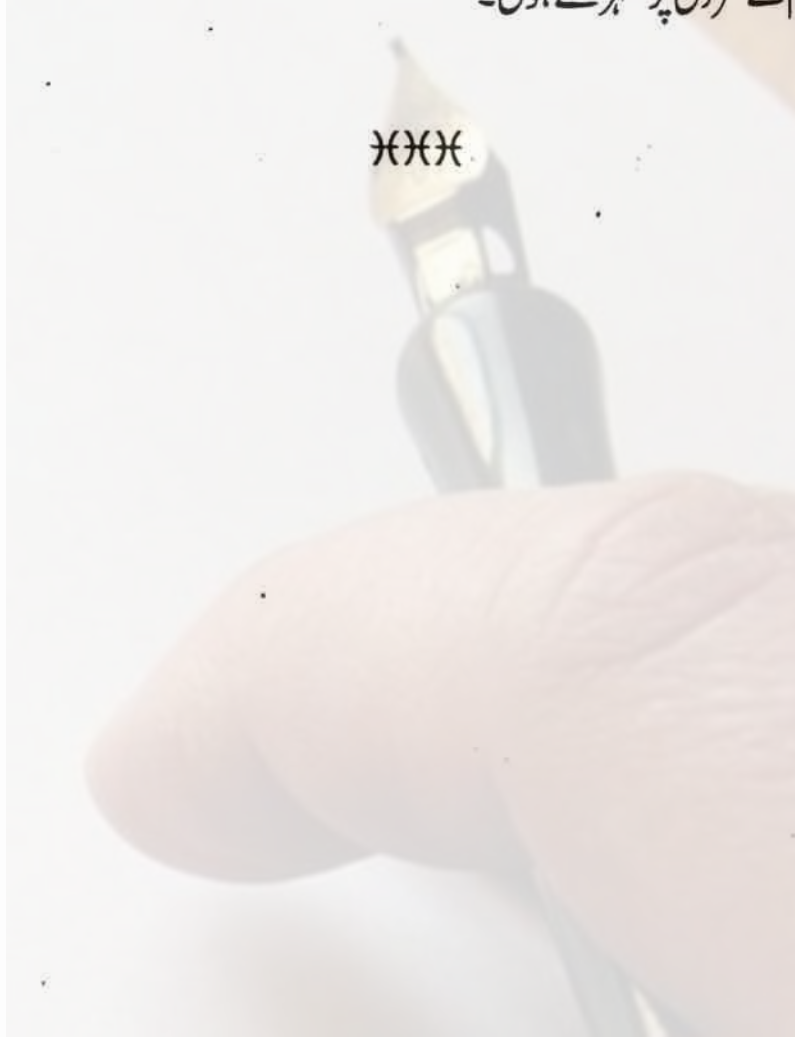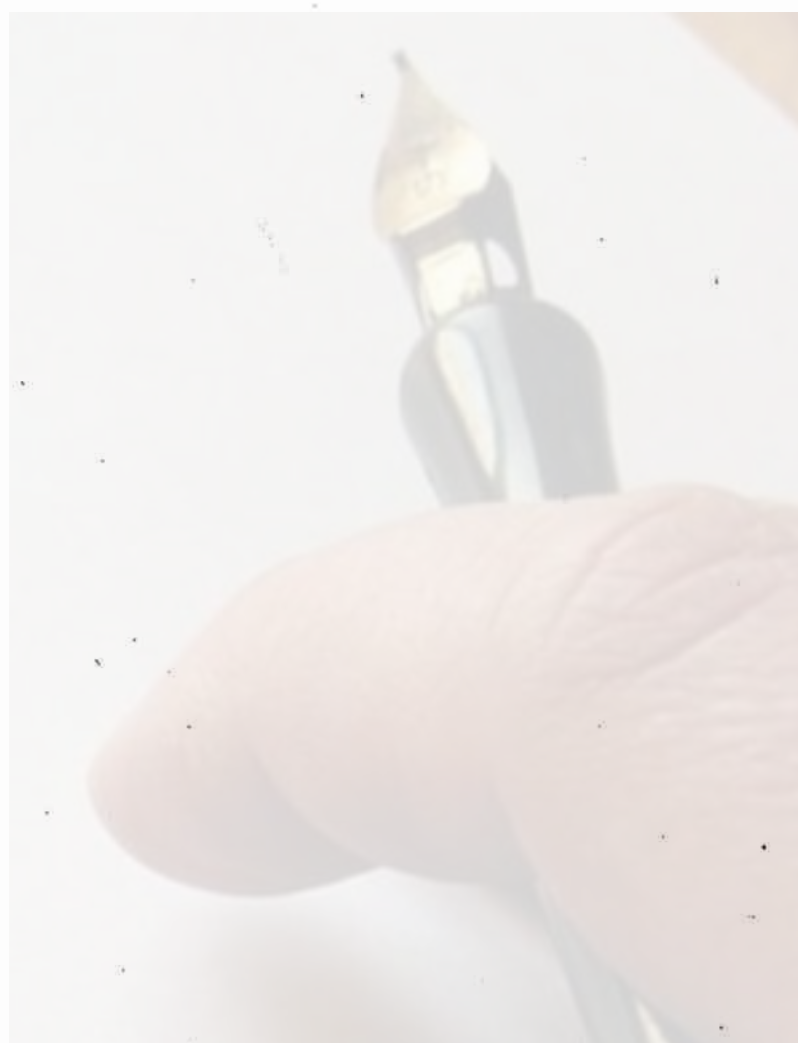
1990 میں خلیجی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ بہت سے لوگ اپنے تئیں متحدہ امارات سے محفوظ جگہوں کے لئے نکل رہے تھے۔ ہم پاکستان میں تھے اپنی چھٹی ادھوری چھوڑ کر دوبئی لوٹ آئے۔ خالی سڑکیں' کم شور' صاف ستھری فضا' شہر دلربا لگا۔ سب کا اسلحہ بارود ٹھنڈا ہو گیا لیکن کسی مزائل پٹاخے کا ادھر آنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ تب ایک روز عصمی نے موقع پا کر مجھ سے کہا۔

"آپ اکیلے کام کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں بھی آپ کا ساتھ دوں۔ مجھے لڑکیوں' عورتوں کے لئے ڈرائیونگ انسٹرکٹر کے کام کی آفر ہوئی ہے۔ چند دن وہ مجھے ٹریننگ دیں گے۔ اس طرح بچوں کی تعلیم کے لئے آسانی ہو جائے گی۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔؟؟"

اب اس نے ہر جملے کے آخر میں 'جی' لگانا چھوڑ دیا تھا اور بیوی سے زیادہ میری دوست' میری ہمدم بن گئی تھی۔ کتنے ہی پل میں اس کا چہرہ دیکھے گیا اور کتنے ہی سوال اور ان کے ساتھ الجھے اندیشے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ رزقِ حلال دینے والا کوئی بھی کام میری سرشت میں چھوٹا یا بڑا نہیں۔ کسی آفس میں بیٹھ کر کرنے والا کام ہوتا تو میں اک پل بھی نہ سوچتا۔ لیکن یہاں معاملہ تھا حادثات کا۔ اور پارکنگ سکھانے کے دوران شدید گرمی اور سردی میں کار سے باہر ٹھہرنا بہت صبر وہمت آزما مرحلہ تھا۔ مجھے تذبذب میں پا کر وہ پھر بولی۔

"مجھ سے نہ ہو سکا تو میں خود ہی یہ کام چھوڑ دوں گی۔۔" وہ میری رگ رگ کو پہچانتی تھی۔ "اور میرے لئے آسانی یہ ہے کہ آپ اور بچوں کے آنے تک میں صرف آدھا دن بھی کام کر سکتی ہوں۔۔"

شاید دو یا تین روز ٹریننگ ہوئی اور اس کے بعد وہ کارزارِ ہستی میں اتر گئی۔ آدھا دن کام کرنا صرف کہنے کی بات رہ گیا۔ صبح سے شام تک وہ پوری نیک نیتی اور دیانت داری سے کام کرتی۔ دوپہر کے وقفہ میں صرف بروز جمعہ وہ چند منٹوں کے لئے گھر آتی۔ ہمیں کھانا وغیرہ دیتی لیکن بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ اس بیچ اس کی اگلی سٹوڈنٹ کا وقت ہو جاتا اور وہ خود بھوکی ہی چلی جاتی۔ دوسرے دنوں میں وہ وقفے کے دوران کسی کو پارکنگ سکھا رہی ہوتی۔ مجھے اپنے 'فیلڈ ورک' کے دوران' کہیں نہ کہیں' وہ دھوپ یا ٹھنڈ میں کھڑی نظر آجاتی۔ صرف وہی ایک تو تھی جو اپنا دوپٹہ سر کے گرد ٹی کوزی کی طرح لپیٹتی تھی۔ گرمیوں میں اپنی سرکاری اے سی والی گاڑی کے اندر بیٹھا میں اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور چہرے پہ دہکتی لگن دیکھے جاتا۔ وہ جھلسا دینے والی دھوپ میں 'پارکنگ پولز' (Poles)' لگاتی اور گھنٹہ بھر باہر کھڑی اپنی سٹوڈنٹ کو کامیابی کا یقین دلائے جاتی۔ یہی حال موسم سرما کا تھا اور پھر وہی اس کی ہر کسی سے دکھ سکھ کی سانجھ والی فطرت۔ یوں ایک سے دوسرے' تیسرے' اس کے نام کی خوشبو پھیلی تو اوپر تلے اسے سٹوڈنٹ ملتی گئیں۔ شام کو کھانا بناتی اور اگلا پورا دن مصروف رہتی۔ بچے سکول سے لوٹتے' کھانے کے بعد کچھ آرام کرتے اور پھر اپنا ہوم ورک کر رہے ہوتے تو وہ تھکن سے چور لوٹتی۔ سولی لٹکی میری بھی جان میں جان آتی کہ وہ خیر خیریت سے گھر پہنچ گئی ہے۔ کبھی وہ ان کے کھانے پینے کے لئے کچھ لے آتی اور فارغ ہوتی تو بچوں کو پڑھانے بیٹھ جاتی۔ میں اسے دیکھ دیکھ ہمیشہ سوچتا اس کا انتظار کتنا جان لیوا تھا۔ تین حادثوں میں اس کی جان بمشکل ہی بچی تھی۔ ایک بار 'یوٹرن' پہ کھڑی اس کی گاڑی میں ایک بے لگام نے اس زور سے ٹکر ماری کہ پچھلا ایک پہیہ فٹ پاتھ سے ٹکرا کر گاڑی کے نیچے تہہ ہو گیا اور دوسرا چوٹ کھا کر فقیر کی کشکول کی طرح سڑک پہ ہی بچھ گیا۔ کتنے ہی دن اس کا لاشعور بھی تھرا تا رہا۔ دوسری بار 'ٹی جنکشن' سے ایک تیز رفتار نے اگلے پچھلے دروازے کے بیچ پہلو میں گاڑی ٹکرا دی۔ بچانے والے نے بچا لیا ورنہ کسر کوئی نہ رہی تھی۔ تیسرا حادثہ بھی ایسا ہی سنگین

تھا۔ میں نے روکا بھی لیکن اس پہ جیسے میرے کندھے کا بوجھ بانٹنے کا جنون سوار تھا۔ میرے دروں خانوں میں بسی میری کچھ خواہشوں' کچھ خوابوں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر وہ ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے نکلی تھی۔ اور یوں میرے اِک اِک سانس کو جمنوں کا مقروض کر ڈالا۔ میں نے سوچا "کس لحاظ میں اس سے برتر ہوں؟" میں روزی رزق کما کر لاتا تھا تو وہ بھی جان ہتھیلی پہ رکھ کر کما رہی تھی۔ وہ بچوں کو ساتھ مجھے بھی پال رہی تھی۔ کھانے سے بدن ڈھانپنے والے لباس تک میں' میری ہر ضرورت اس کی احسان مند تھی۔ کائنات سجانے والے کی کیسی انمول تخلیق ہے یہ صنف۔ کہ مرد کے پیچھے کھڑی ہو تو اس کے گھر کو جنت بنا دیتی ہے اور کبھی آگے چلے تو راہ میں بچھی کنکر کرچیاں چنتی اس کی دنیا گلزار کر دیتی ہے۔ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ نے اپنے لئے 'اشرف المخلوقات' کے اعزاز و عنوان سے آدم کو بنایا۔ پھر اسی کی مٹی' نمو اور عناصر سے کشید' اور اپنی ذاتِ ربی کے شایانِ شان' اک حسین ترین 'احسن التخلیقات' وجود۔ "بعنوان 'عورت' اس کی ساتھی' ہمدم عطا فرمائی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ملا اسی کے وجود سے جنم لے کر اسے اپنے سے کمتر اور گناہوں کی پوٹلی منسوب کرتا' اور خدائی فوجدار بن کر اس ریوڑ کو ساتویں کوٹھڑی میں بند کرنے کی حد جاری کرتا ہے۔

وقت کی چاپ آدمی کو سنائی نہیں دیتی۔ سامنے سے آتا اور اسے روندتا مخالف سمت میں نکل جاتا ہے۔ ہمارے ارد گرد کتنے ہی شفیق چہرے اپنی کھٹی میٹھی یادیں چھوڑ کر کہانیاں بن گئے اور کتنی ہی نئی پھلواریاں کھِل اٹھی تھیں۔ خود ہمارے بچے بھی انگلی چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے تھے کہ اک شام کھانے کے دوران مجھے دل کا شدید دورہ پڑ گیا۔ عصمی بھاگم بھاگ ایمرجنسی میں لے پہنچی۔ پتہ چلا مرکزی شریان میں خون کا لوتھڑا پھنس گیا ہے۔ پوری زندگی ہنگامہ خیزی کرنے والے کمبخت دلِ کی اصل اوقات بھی جان لی کہ اک حقیر سے لوتھڑے کے آگے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ عجیب درد [illegible] دیکھ سکتا تھا' بن اور سمجھ سکتا تھا

لیکن ہاتھ پاؤں ہلانے اور بولنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ سارا وقت میرا ہاتھ تھامے سٹریچر کے ساتھ کھڑی رہی۔ وقفے وقفے سے میرے ہاتھ پاؤں کے ناخن دیکھتی۔ کبھی مجھ سے درد کے بارے پوچھتی۔ میں جواب نہ دے پاتا تو میرا ہاتھ تھپتھپا کر تسلی دیتی کہ "کچھ نہیں ہو گا۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" غضب حوصلہ اور استقامت تھی اس میں۔ آنکھ میں آنسو یا لہجے میں قطعی لرزش نہ تھی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں سے وہ یوں دھیرج اور استقلال سے بات کر رہی تھی جیسے انہی میں سے ایک ہو۔ میرے پاس چپ چاپ اسے تکے جانے کے لئے ان گنت لمحے تھے۔ اور تبھی میں نے جانا کہاس کی چاہ میں' اس کے پیار میں' اسی کے لئے آسائشیں' راحتیں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں چنتے میں شاید اسے ہی راستے میں کہیں بھول آیا تھا۔ زندگی کے بکھیڑے سلجھاتے مجھے اس لڑکی کی طرف دیکھنا یاد ہی نہ رہا تھا کہ اس کے بالوں میں کتنی چاندی' کتنا ملگجا پن گھل آیا ہے۔ شریان میں لگی پھانس سے جینا تو پہلے ہی مشکل ہو رہا تھا اب جذبات کے دھارے پر یہ نئی ٹیس مچلی تو میرا مرنا بھی بہت مشکل ہو گیا۔ کتنی ہی یادیں تھیں ان گنت باتیں' جو میں اسے کہنی چاہتا تھا لیکن قوتِ گویائی کھو گئی تھی۔ میں اپنا خونِ جگر اپنے ہی دل کو پلاتا رہا اور وہ میرا ہاتھ تھپتھپاتی مجھے موت کے گھپ اندھیروں سے سمیٹتی زندگی کی بانہوں میں سونپتی رہی۔ "کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔۔" میری آنکھ کے گوشے سے شاید کوئی آنسو ڈھل آیا تھا۔ اس نے اپنے آنچل سے وہ صاف کر دیا۔ میں نے سوچا میری راہبر' میرا خضرِ راہ میرے ساتھ ہے۔ اسے یقین ہے کہ کچھ نہیں ہو گا تو میں فکر کیوں کروں؟ نگاہ اٹھائی' خلق کرنے والے سے پوچھا۔ "یہ جان تیری ہے یا میری۔۔۔؟" میں نے پتوار اسے سونپے' آنکھیں موند لیں اور دھول میں اٹی ان گم گشتہ منزلوں کی تلاش میں نکل پڑا جہاں کسی راہ پہ میں اسے بھول آیا تھا۔

دوبئی ہسپتال سے انجکشن راشد ہسپتال تک آتے آتے اڑھائی گھنٹے گذر گئے۔ پھر وہ آبِ حیات رگوں میں اترا ہی تھا کہ سینے میں دہکتی سلاخ کی طرح دھنسا لوتھڑا ریزہ ریزہ ہو گیا

پوری قوت سے بدن میں خون دھکیلتا دل یکلخت پھڑ پھڑایا اور ساتھ ہی اک سرد لہر میری رگ

دپے میں دوڑ گئی۔ معلوم نہیں زندگی نے بازی مار لی تھی یا موت نے ہار مان لی تھی البتہ میں

سوختہ جان ہو گیا تھا۔ جانے کب تک دھڑکنیں دستک دیتی رہیں میں ان کی لے پر بے مایہ پڑا

رہا۔ مجھے انتہائی نگہداشت وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ عصمی اور بچے مجھے تسلیاں دے دے

رخصت ہوئے تو میں نے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ تھوڑا ہی وقت گذرا ہو گا جب میں نے

محسوس کیا میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ الارم بٹن دباتے میں نے دیوار پہ لگے کلاک کی

جانب دیکھا رات کے ٹھیک ساڑھے نو بجے تھے۔ اور پھر اگلے ہی پل میں اک بند گھپ

اندھیری گلی میں ڈوب گیا۔۔۔۔۔

پھر میں بہت زور سے ڈکرایا اور میرا پورا بدن بستر سے اچھل کر گرا تھا۔ کمرے کی بجائے اب

میں ہال میں تھا اور میرے ارد گرد ڈاکٹر اور نرسوں کا اک ہجوم تھا۔ دائیں بائیں ہدایات جاری

ہو رہی تھیں۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اگلے کچھ لمحوں میں میرے بستر کے پاس ایک نرس کا

ڈیسک لگ گیا اور سٹاف آہستہ آہستہ رخصت ہو گیا۔ مجھے بہت سردی لگ رہی تھی جیسے بستر

پر کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹیاں الٹ دی ہوں۔ اور سینے پر بائیں جانب درد اور شدید جلن

تھی۔ میں نے سٹاف سے شکایت کی تو اس نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے تمہارے ساتھ کیا ہوا

تھا؟" میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔

"You Expired!"

مجھے یقین نہ آیا تو اس نے بتایا۔ "مانیٹر روم میں یکدم الارم بج اٹھا۔ تمہارے دل کی دھڑکن اور

سانس رک چکے تھے۔ سب بھاگے آئے۔ پھر بجلی کے جھٹکے دیئے۔ تم تیسرے اور آخری

جھٹکے پہ واپس آئے ہو۔۔۔"

پھر میں سویا نہیں۔ زندگی لینے دینے والا تو اللہ ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ اسے اپنی ذات پہ کسی

کا ایمان بھرم رکھنا تھا اسی لئے ترنگِ ربی سے میرے سینے میں دستک پھر سے جگا دی۔ مجھے اسی

صورت کا انتظار تھا کہ جس کے سامنے ہونے سے مجھے ہمیشہ اپنے ارد گرد اک غیر مرئی سا اجالا' اور ان میں قوسِ قزح کے رنگ گھلے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ آئی' میں نے رات کا ہنگامہ بیان کیا۔ اس نے میرے سینے پر ابھرے سیاہ چٹاخ پر ہاتھ پھیرا اور بہت اطمینان سے بولی۔ "میں نے کہا تھا نا! آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔!!" خدا جانے یہ اک ہمدم' اک دمساز کے ساتھ ہونے کا اعجاز تھا یا اس کی ہستی میں واقعی کسی عطیہ الوہی کی مسیحائی' کہ مجھے لگا وہ میرے سینے کے چٹاخ میں سے ساری جلن' سارا درد سمیٹ لے گئی ہو۔ اس کا یہ یقین و اطمینان اس بائیسویں روز بھی قائم رہا جب میرے ڈسچارج پیپرز بن رہے تھے اور مجھے دوسری بار ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ ایک بار پھر مجھے انتہائی نگہداشت وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ ماسک و مانیٹر پھر سے لگ گئے۔ لیکن اس بار میں مرا نہیں کیونکہ میرے کانوں میں' دماغ میں اور دل کی ٹوٹی ہوئی نسوں میں بھی ایک ہی الاپ جاری تھا۔ "آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔" اس کا اعتماد بھرم پھر جیت گیا۔ میرے دل کی اعصابی طاقت صرف ۳۰ فیصد رہ گئی تھی وہ کچھ عرصہ پھڑ پھڑاتا رہا۔ پھر میں اسے اور وہ مجھے جھیلنے لگا اور یوں میں بھی جیت گیا۔ میں نے پھر سے کارزارِ ہستی میں قدم رکھ دیا تو اک روز عصمی میرے پاس آئی اور بولی۔

"مجھ سے اب کام نہیں ہوتا۔۔۔"

بہت سے لمحے' پل' گھڑیاں دم سادھے ہمارے پاس سے گذر گئے۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ حلق میں اک گانٹھ سی لگ گئی۔ جی چاہا اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو لوں لیکن سوگ کس کا مناتا؟ وہ تو میری زندگی اور موت کی جنگ میں اپنے آپ کو یکجا رکھتے رکھتے کرچی کرچی خود ہی چیخ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ میری کن عبادتوں' کیسی بندگی کا صلہ یا انعام تھی۔ میں نے اس کے بھرم کو اپنی متاع بنا لیا۔ اس نے کام چھوڑ دیا۔

زندگی اپنی اس نئی ڈگر پہ چل نکلی تو عصمی نے اپنی توجہ بچوں کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ وہ اب بڑی کلاسوں میں تھے اور یہی وہ مرحلہ تھا کہ ہماری ذرا سی غفلت ہدف سے منزلوں دور لے جاتی۔ سکولوں' کالجوں میں جانا' ٹیچرز سے ان کی پراگریس رپورٹ لینا' ہر میٹنگ ہر فنکشن میں شریک ہونا' ان کی سہیلیوں دوستوں سے وسعتِ نگاہ کے ساتھ ملنا' یہ سب کچھ ایسے امور تھے جنہوں نے بچوں کو نہ صرف حصولِ تعلیم سے باندھے رکھا بلکہ ان کے کردار بھی تعمیر کئے۔ اس زمانے میں یہاں اکثر کہا جاتا تھا کہ دوبئی کی کمائی پاکستانی والدین کو راس نہیں آتی۔ اپنے بچوں کو کھلا پیسہ اور آسائشیں دے دے وہ انہیں بگاڑ دیتے ہیں۔ اور یہ بات بہت حد تک صحیح بھی تھی۔ میں برسوں پاکستان اسلامیہ سکول میں پنجاب بورڈ کی طرف سے میٹرک سائنس پریکٹیکل کا ممتحن رہا تھا اور میں نے ڈھیروں خوبصورت ذہنوں کو تباہ ہوتے دیکھا تھا۔ مجھ پر یہ اللہ ہی کی رحمتوں کا سایہ تھا جو ایسی شریکِ حیات مجھے دی کہ بچوں کے لئے خواب تو میں دیکھتا تھا لیکن ان میں سارے دلآویز رنگ وہی بھرتی رہی۔

منجھلے بیٹے بوبی کو پڑھائی لکھائی سے لگاؤ زیادہ تھا۔ اس نے 'اے لیول' کر لیا تو ہنگری کی ایجوکیشن منسٹری کا وفد میڈیکل تعلیم کے لئے طلبا کا انتخاب کرنے آیا ہوا تھا۔ وہ بھی ٹیسٹ میں بیٹھا۔ رزلٹ کے بعد مجھے بلا کر مبارکباد دی گئی کہ وہ 91 فیصد نمبروں کے ساتھ اول آیا ہے تو میں نے انہیں اپنا ڈر کہہ بتایا کہ ان کی لازمی شرط "عمر اٹھارہ سال" کی بجائے وہ سترہ برس کا تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ یہ ان کا مسئلہ ہے وہ بوڈاپسٹ (Budepest) سے اس کی منظوری لے لیں گے۔ اب تیاری ہونے لگی۔ میں اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ ویزے لگ گئے' کاغذات مکمل ہو گئے' سیگڈ (Szeged) یونیورسٹی سے نئے تعلیمی سال میں شرکت کا بلاوا بھی مل گیا۔ کچھ تین ہفتے باقی تھے کہ مجھے تیسرا' زبردست ہارٹ اٹیک آ گیا۔ اس وقت میری ساری امیدوں کا مرکز وہی تھا اور مجھے ہر چیلنج کے باوجود اس کے ساتھ جانا تھا۔ چنانچہ حیلے بہانے ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر بیسویں روز میں جہاز میں اس کے پرواز کر رہا تھا۔ کچھ

دعائیں تھیں کہ میری ڈھال بن گئیں اور اوپر والے نے مسکرا کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ پراگ سے فلائٹ بدلی۔ سیگڈ تک سامان' وزن اٹھانے اور بھاگ دوڑ کے ہر ٹیسٹ سے گذر گیا وہ پھڑکنے والا دل دوبارہ بے تال نہیں ہوا۔ بوڈاپسٹ ایرپورٹ سے ریلوے اسٹیشن کے لئے ویگن میں بیٹھے تو ایک ادھیڑ عمر برطانوی عورت نے بوبی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میڈیکل تعلیم کے لئے سیگڈ جارہا ہے تو وہ مسکرائی اور بولی۔

"Beware of the Szeged Witches: they steal your heart..."

مستنصر حسین تارڑ نے پھولوں اور ان کی مہکار کا وہ شہر دیکھا ہوتا' دریائے سین(Seine) کی بجائے دریائے تِسا(Tisza) کے کنارے بیٹھ کر اس کی لہروں کی قدرت سے سرگوشیاں سنی ہوتیں' اور یا انگور کے رس میں گندھی مٹی میں مشرقی پیمانوں کے آداب دیکھے ہوتے تو پیرس کی بجائے یقیناً" سیگڈ کو' پیار کا پہلا شہر' قرار دیتا۔ کہنے کو تو ملکۂ حسن کے تاج بھارتی ناریاں پہنتی ہیں لیکن میں نے ایسا حسن کہیں نہیں دیکھا کہ راہ چلتے قدم پتھریلے ہو جائیں اور احساس میں چلمنیں سرسرانے لگیں۔ اس شہر میں تو خزاں بھی نت رنگ سے آتی ہے۔ لگ بھگ چالیس سال پہلے پیار کی اس منزل کو میں نے "ریڈرز ڈائجسٹ" کے اوراق میں دیکھا تھا اور میرے دل میں چاہ جاگی تھی کہ کاش میں بھی کبھی اس شہر کو دیکھوں۔ آج اس ارمان کی تعبیر میرے سامنے تھی۔ جگہ جگہ ایستادہ مجسموں کے روپ لکھی اس شہر کی صدیوں پہ پھیلی تاریخ' ہر سو بکھری پھلواریاں' جیسے فضا میں ٹھہر کر پریوں نے رنگ برسائے ہوں۔ فضا اتنی مہکی مہکی کہ آدمی کا جی چاہے کسی کا ساتھ ہو اور وہ اس کا ہاتھ تھامے بس چلتا جائے' چلتا جائے۔ ریلوے اسٹیشن سے چلی بس کا آخری سٹی سٹاپ' پوسٹ آفس تھا۔ وہاں اترے۔ میں نے ہوٹل جانے کی بجائے بوبی کو سامان کے پاس بٹھایا اور پبلک بوتھ سے عصمی کو ٹیلیفون کیا۔

" صبح ابو ظہبی میں ہنگری کے سفارت خانہ سے ویزا لگوا کر پہلی فلائٹ سے

آ جاؤ۔۔"

اسے بہت حیرت ہوئی۔ اس نے کہا۔

" ابھی آدھ گھنٹہ پہلے تو آپ نے ٹیلیفون کیا تھا کہ آپ کو جگہ پسند نہیں آئی اور

کل آپ دونوں واپس آ رہے ہیں۔ اب کیا ہوا۔۔۔۔؟"

" تب میں نے سنسان ریلوے اسٹیشن کے بوتھ سے ٹیلیفون کیا تھا۔ اس جنت

نظیر' خوابوں کے شہر میں جھانکا نہیں تھا۔۔۔" میں نے جواب دیا۔ " یہاں ہر

سو تمہاری خوشبو پھیلی ہے۔ بس اب سوال نہ کرو اور آ جاؤ۔۔۔"

وہ ایسی ہنگامی سیاحت سے ہمیشہ محظوظ ہوتی تھی۔ دنیا گھومنے کا اسے اتنا شوق تھا کہ لندن سے دوبئی پہنچتے ہی اسے اگلی فلائٹ سے روم یا فرینکفرٹ جانے کے لئے کہہ دو تو وہ ایک پل بھی توقف نہ کرتی۔ چنانچہ چوتھے ہی روز وہ ہمارے پاس تھی۔ اِس حالت میں کہ چلنے کے لئے ہاتھ میں "واکنگ سٹک" تھی۔ کولہے اور گھٹنے میں درد تھا لیکن شکوہ شکایت کی بجائے گھومنے پھرنے کا جنون تھا۔ شہر کی بیشتر سڑکیں' پارک' بازار اس نے پیدل ہی گھوم ڈالے۔ بوبی کو سال بھر کے لئے فلیٹ لے دیا تھا یونیورسٹی فیس ادا کرنے گئے تو عصمی کے گرد پاکستانی کم' اور بھارتی بھانجے' بھتیجیوں کی اک بڑی فصل اگ آئی۔ شاپنگ مال ہو یا واکنگ سٹریٹ' برگر کنگ ہو یا میکڈانلڈ' ہر جگہ اس کے گرد محفل سج جاتی۔ اس کی پنجابی' گلابی انگلش اور ان سب کے امتزاج سے بنی 'اردو' سنتے سنتے وہ بچے اسے اپنے دلوں کی لگی بھی سنا جاتے تھے۔ سبھی اس کے گرویدہ۔ بوبی صبح جلدی چلا جاتا۔ ہم اس سے گھنٹہ ڈیڑھ بعد گھر سے نکلتے۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھتی تو ڈرائیور مسکرا کر خود ہی' پچاس فیصد رعائیت والا "دیاک" (Diyak طالب علم) میٹر چلا دیتا۔ دریائے تِسا یونیورسٹی کے مشرقی پہلو کو چومتا گزرتا تھا۔ وہ اس کے وسیع و عریض لان عبور کرتی شوخ لہروں سے نہلائی سیڑھیاں اتر جاتی اور ان کی

چہلیں دیکھتی سنتی رہتی۔ وہاں سے تقریباً" روزانہ ہی ہمارا کلازل (Klauzal) سکوئر جانا ہوتا۔ دوبئی میں عصمی جب بھی آئس کریم کھاتی اس کا گلا خراب ہو جاتا تھا لیکن وہاں فلاور کیک شاپ "وِیراگ ککراسدا"(ViragCukraszda) میں صبح شام' اس نے جی بھر ہنگری کی آئس کریم اور پیسٹری کھائی کبھی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ رات کلازل کی دھرتی بینڈ کی زبردست تال پر تھرکنے لگتی اور 'ریمپ' پر 'کیٹ واک' شروع ہو جاتی تو اردگرد کھڑکیوں کے ریشمی پردوں میں بھی سرسراہٹ ہونے لگتی۔ وہاں کے لوگوں کی طرح ہم بھی دن بھر سڑکوں پہ چلتے رہتے۔ کنارے لگے دو رویہ درخت ہمارے سروں پہ اپنی نازک نازک شاخ پتوں کے سائبان تانے رکھتے۔ کبھی بارش ہو جاتی تو ننھی منی سپید سپید کلیوں کی طرح وہ شفاف بوندیں دیر تلک جھڑتی رہتیں۔ اس شہر میں ہمہ رنگ گلاب ہر ہر جگہ سیاحوں سے اپنی محبتوں کا اظہار کرتا ہے۔ گھروں کے دروازوں پہ لگی بیلیں انگور کے میٹھے اور خوش ذائقہ خوشوں سے آنے والوں کا استقبال کرتی ہیں۔ گھروں کی دیواروں سے باہر جھانکتی شاخوں پہ چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے فانوسوں کی طرح لٹکی ناشپاتیاں اور آلو بخارا ہر لمحہ وِرد کرتے ہیں۔ "تو تم اپنے رب کی کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟" ہم نے بار بار راہ چلتے انہیں توڑ کر کھایا کہ انہیں کھانے پر آدمی جنت سے نہیں نکالا جاتا۔ کہتے ہیں 1879 کے سیلاب میں مکمل تباہ ہو جانے کے بعد اس شہر کو خوابوں کے معماروں نے طالب علموں کے لئے بنایا بسایا تھا۔ لیکن اب میں اس کی مزید باتیں نہیں کروں گا کہ میرے لئے وہاں صرف سلگتی یادوں کی راکھ رہ گئی ہے جسے کریدتے کریدتے خود میرے ہی ہاتھ جل جائیں گے۔

تقریباً" ایک ماہ وہاں رہ کر ہم چلے آئے۔ دسمبر میں بقیہ تعلیمی سال کی فیس بھی ادا کر دی۔ ٹرم ٹیسٹ ہوئے تو بوبی کے پروفیسر کا مجھے ٹیلیفون آیا کہ اس نے یونیورسٹی کے سات سالہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ مجھے اس پر بہت فخر ہوا لیکن کرسمس اور موسم سرما کی چھٹیاں شروع ہونے سے صرف دو روز پہلے مجھے اطلاع دی گئی کہ اٹھارہ سال عمر کی لازمی شرط پوری نہ

ہونے پر بوڈاپسٹ منسٹری نے اس کا داخلہ رد کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ صرف آئندہ برس ہی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔ دو روز میں تڑپتا پھڑکتا ٹیلیفون کرتا رہا۔ پھر چھٹیوں کی وجہ سے یونیورسٹی بند ہو گئی اور وہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ فیس وہ وصول کر چکے تھے۔ میں نے جان لیا میں بازی ہار چکا ہوں۔ اگلے سال کی کلاسوں کا وہاں رک کر انتظار کرنا سیگڈ کی جادوگرنیوں کو للکارنا تھا۔ میں اس شہر میں درجنوں عرب سٹوڈنٹس کو مل چکا تھا جو تعلیم حاصل کرنے گئے لیکن ان سوہنیوں کے ایسے فسوں اسیر ہوئے کہ 'شورما' کی دوکان ڈال وہیں بیٹھ گئے۔ چنانچہ میں نے اسے واپس بلا لیا۔

بیسویں صدی کروٹ بدل کر اکیسویں میں ڈھل آئی۔ پہلے ہی سال چوتھا ہارٹ اٹیک بھی مجھے مات دینے کی کوشش میں ناکام گذر گیا۔ البتہ عصمی کے امتحانات بہت سخت و سنگین ہو گئے۔ اک طرف تو میرا فکر کہ میں اسے اکیلی چھوڑ ر فوچکر نہ ہو جاؤں۔ دوسری طرف بچوں کے تعمیرِ مستقبل کا خیال۔ نطشے کا ایک بے حد خوبصورت قول ہے۔ "آپ انسان تک گئے ضرور ہیں اس تک پہنچے نہیں۔۔۔" اس 'گئے' اور 'پہنچے' کے بیچ ہی تو عظمتوں کے فاصلے ہیں۔ ایسا ہی فرق 'ماں ہونے' اور 'ماں بننے' میں ہے۔ جانوروں' پرند و چرند اور انسانوں میں 'مائیں ہونا' تو یکساں ہے لیکن 'ماں بننے' کے لئے ایثار و تیاگ' سچائیوں اور لگن کے ساتھ فطرت کے سونپے اس منصب کی آبیاری کرنی ضروری ہے۔ اپنی ہڈیوں سے خون تبخیر و کشید کرنا پڑتا ہے تبھی ماں بنتی ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ میرے بچوں کی ماں ایسی ہی تھی۔ اس کا صلہ ہمیں یوں ملا کہ بوبی اِس بار "اوکلاہوما" (Oklahoma) یونیورسٹی امریکہ میں پہنچ گیا۔ مارکیٹنگ، انٹرنیشنل بزنس اور فنانس' تینوں میں ایم بی اے کیا۔ فارن سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا پہلا پاکستانی صدر بنا۔ یونیورسٹی چرچ کے ایک ہال کو بطور مسجد وقف کروایا۔ عین ۹/۱۱ ہنگاموں دوران یونیورسٹی میں کرسچین مسلمان قربتوں کے لئے لیکچر دیئے۔ ان خدمات کے اعتراف میں گورنر اوکلاہوما نے اسے حکومت کی طرف سے اوکلاہوما کی اعزازی شہریت

دی۔ لیکن وہ واپس دوبئی چلا آیا۔ بڑا اور سب سے چھوٹا بیٹا برطانیہ کی تعلیم کے بعد ارسطو اور سقراط کے یونان سے مارکیٹنگ اور بینکنگ کی ڈگریاں لائے۔ بیٹی لندن میں رہی۔ ویسٹ منسٹر اور برائٹن یونیورسٹیوں سے دو ماسٹرز کئے۔ بیٹی پر عدم اعتماد عصمی کو تھا اور نہ مجھے۔ لیکن ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں وہاں رشتہ داروں کے منہ بند رکھنے بھی بہت ضروری ہیں۔ چنانچہ ماں چند دن دوبئی میں ہوتی اور پھر بیٹی کے پاس لندن میں۔ دونوں کے بیچ اک طرح کی دوستی بھی تھی۔ گھومتی پھرتیں۔ بھائیوں کے بھی چکر لگتے رہتے۔ اڑوس پڑوس ہالینڈ جرمنی آسٹریا وغیرہ وغیرہ سبھی کے سیر سپاٹے ہو گئے۔ میں روپیہ پیسہ کے انبار پر بیٹھا کوئی نواب' رئیس نہیں تھا جو کچھ ہم دونوں نے کمایا بچایا تھا وہ سب اس حصولِ تعلیم میں جھونک دیا۔ کوئی سیاسی شخصیت ہوتا تو وہ سب حکومتِ پاکستان کے سرکاری خرچے پر پڑھ جاتے۔ لیکن میں بیرونِ ملک کام کرنے والا ایک عام آدمی تھا اور ہوں۔ جس نے اپنے بچوں کے لئے صرف خواب دیکھے تھے۔ ان میں خوبصورت رنگ بھرنے کے لئے اللہ نے مجھے شریکِ حیات دی۔ وہی میری اصلی دولت تھی اس نے نہ صرف مجھے میری ماہیت پر سنبھالے' بچائے رکھا بلکہ بچوں کی کردار سازی بھی کی۔ چنانچہ بڑے بیٹے کے سوا باقی تینوں بچے پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں۔ بوبی فنانس ہاؤس میں دوبئی اور ناردرن امارات کے لئے کارپوریٹ اور کمرشل فنانس ہیڈ ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا بینک امارات میں آئی ٹی فیلڈ آپریشنز اور وی آئی پی سروسز کا ریلیشن شپ منیجر ہے۔ بیٹی کانفرنس منیجر ہے۔ سب سے بڑا بیٹا ایک اور بینک میں ریلیشن شپ آفیسر ہے۔ مجھے انتظار ہے اس کے ستارے کب عروج پر جاتے ہیں۔

2 اپریل 2005 سے' مسلسل پینتیس سال دوبئی واٹر ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت کے بعد میں ریٹائر ہو گیا۔ اتنی طویل ملازمت یہاں فقط آپ کا ذاتی اعزاز ہے کیونکہ اس کے اعتراف میں آپ کو برسوں میں کمائی گریچوٹی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہاں ایک دلیل دی جاتی ہے کہ آپ ایک گھر بنواتے ہیں۔ اس کے لئے ایک کنسلٹنٹ، انجینئر' کارپینٹر' پلمبر' الیکٹریشن' راج

مزدور سب مل کر کام کرتے ہیں۔ گھر مکمل ہو جانے پر آپ کسی کو یہ پیشکش تو نہیں کرتے کہ تم نے مدد کی تھی آؤ اب تم بھی ساتھ رہو۔" تم خارجی لوگوں کو کام کا معاوضہ مل گیا اب اپنے گھروں کو جاؤ۔۔۔" میرے پاس اس کا تب جواب تھا اور نہ اب ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ صرف پانچ دن پہلے اس مسبب الاسباب نے بچوں کی ملازمتوں کے سلسلہ میں بھی مجھے ہر کسی سے بے نیاز کر دیا۔

وقت کی رفتار اور آدمی کی حِسیات میں کوئی تال میل نہیں۔ آئینوں سے روز ہم اپنا حال پوچھتے تھے لیکن وہ بولتے نہیں۔ وہ گنگ رہے اور ہماری آنکھوں' نگاہوں نے جانا' پہچانا ہی نہیں کہ لمحوں کی بے آواز چاپ ہمارے چہروں پہ دھوپ چھاؤں کے کتنے ہی نقوش' کتنی ہی لکیریں' تحریریں ثبت کر گئی ہے۔ ہمارے گرد تو جیسے رنگین دائروں کا جال بچھا تھا اور ان کی دلکشی میں کھوئے اک دوجے کا ہاتھ تھامے ہم ان میں سفر کرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک دائرہ عبور ہو جاتا تو نئے مرحلے کے تقاضے شروع ہو جاتے۔ کارزارِ تعلیم سمٹا اور بچے اپنا رزق کمانے لگے تو اب نیا باب کھل گیا۔ بچوں کے گھر بسانے کا۔ نئے آدم اور نئی حوا۔ تب پہلی بار مجھے احساس ہوا عصمی اور میں کتنی منزلوں سے گذر آئے ہیں۔ اک روز وہ ایک اجالا' اک روشنی بن کر میری زندگی میں آئی تھی۔ مل کر ہم نے چھوٹے چھوٹے خوابوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے اپنا آشیاں سجایا۔ گھر میں کلکاریاں ابھریں تو حوصلوں کو مہمیز لگ گئی۔ اپنی راہوں کی کٹھنائیوں کو تسخیر کرتے کرتے آج ہم اس پڑاؤ پر پہنچے تو میں نے جانا۔ عصمی کے بال ملگجے ہی نہیں' کم بھی ہو گئے تھے اور چہرے پہ سوجن بھی ٹھہرنے لگی تھی۔ دل پہ اک بوجھ سا بن گیا لیکن سامنے درپیش ذمہ واریوں کا تسلسل کچھ ایسا تھا کہ وہ کوندا سا انہی کی لپیٹ میں سمٹا رہ گیا۔

اوائل 2007 میں ہم لندن میں تھے جب لیسسٹر (Leicester) میں ایک رشتے کا پتہ چلا۔ ہم دیکھنے گئے۔ اتفاق سے عصمی کو بیٹھنے کے لئے جگہ ایسی ملی جہاں ان کا صوفہ ٹوٹا ہوا تھا۔ پتہ

نہیں ان کا پردہ رکھنے کے لئے وہ کیوں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جب رخصت ہونے لگے تو کولہے میں درد کی وجہ سے اس کا اٹھنا اور چلنا محال تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر اسٹک کا سہارا لیا۔ ہم واپس دوبئی پہنچے۔ ڈاکٹر نے انجکشن وغیرہ لگائے۔ کچھ افاقہ ہوا تو پھر سے رشتوں کی تلاش خاطر لاہور کا رخ کیا۔ اپنے خاندان میں دور دور تک شادی کے قابل لڑکیوں کا اکال تھا۔ جو مناسب تھیں وہ پہلے ہی دوسری شاخوں پہ اپنے آشیانے بنا چکی تھیں۔ لڑکوں کا حال ان سے بھی برا تھا۔ اور یہ ہمارے متوسط طبقہ کا بہت بڑا المیہ ہے خدا جانے بیٹیوں کے نصیبوں کا فکر کرتے ماں باپ ان کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہو جاتے ہیں کہ اٹھارہ بیس سالہ جوان کالر تلے رومال ٹھونسے' محلے کی کسی دیوار پہ دوستوں کے ساتھ بیٹھے سگریٹ کے مرغولے اڑاتا بہت فخریہ انداز میں جواب دیتا ہے۔ " میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا اس کے بعد سے میں نے سکول کا منہ نہیں دیکھا۔ " مجھے ایسے کسی نیوٹن' آئن سٹائن کی ضرورت نہیں تھی جو اپنی آوارگی کی نت نئی دریافتیں بیان کرتا ہو۔ چنانچہ اخباروں میں اشتہارات دیئے۔ کئی میرج بیورو سے رابطہ کیا۔ پرائیویٹ ایجنٹوں کی خدمات بھی حاصل کیں کیونکہ ایک ہی وقت میں ہمیں بیٹی اور دو بیٹوں کے لئے' تین رشتے درکار تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کے لئے کچھ مزید انتظار ہو سکتا تھا لیکن یہ سوچ رکھا تھا کہ کوئی اچھی سی' پیاری سی لڑکی پسند آ گئی تو اس کی بات بھی پکی کر آئیں گے۔ ٹیلیفون پہ تانتا بندھا۔ میں سب کے کوائف اور رابطہ نمبر لکھتا گیا۔ کچھ لوگ تو ہمارے سید شیعہ ہونے کا سن کر ہی انکار کر گئے۔ مجھے سمجھ نہ آیا کہ انسان کو مختلف عقیدوں والے گھروں میں پیدا کرنا تو امر ربی ہے پھر یہ تفرقہ کیسا؟ میں تو ہر انتہا پسند پہ لعنت بھیجتا ہوں۔ ہم نوزائیدہ بچے پر بھی شیعہ سنی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ بہر کیف ہولے ہولے لسٹ بن گئی۔ اک روز میں نے ڈرائیور سمیت کار کا بندوبست کر لیا اور ہم وہ درِ نایاب ڈھونڈنے نکل پڑے۔ قدبت' شکل صورت اور تعلیم و آداب سب باتوں کو دیکھنا تھا۔ اب کون کیسی تھی اس سے قطع نظر' مجھے بے پناہ خوشی ہوئی کہ میرے وطن کی بیٹیاں

ماشاللہ سچائیوں اور لگن سے حصولِ علم میں گامزن ہیں۔ اور یوں اک روز ہمیں وہ پہلی لڑکی مل گئی۔ بے حد پیاری اور اس قدر شفاف شخصیت کہ وہ خود ہی سر تاپا اپنا منہ بولتا تجزیہ تھی۔ لاہور ہائیکورٹ میں وکیل تھی۔ ماں ٹیچر اور گرایجویٹ باپ صرف اس لئے ایک وکیل کا اسسٹنٹ تھا کہ اسے کسی طور اپنی بیٹی کو پڑھانا تھا۔ آداب واطوار بہت سلجھے ہوئے۔ اس نے مجھے اور عصمی کو جیت تو پہلی ہی نگاہ میں لیا تھا لیکن اگلی ایک دو ملاقاتوں میں وہ دل میں اتر گئی۔ چنانچہ ہم نے بڑے بیٹے کے لئے اس بیٹی کو مانگ لیا۔

اب اگلی تلاش شروع ہوئی لیکن پروگرام کے برعکس اس روز عصمی میری سب سے چھوٹی بھابی کو اس کے ہارمونز چیک کروانے ماڈل ٹاون لے گئی۔ وہاں ہر ماہ شارجہ آنے والے ایک ڈاکٹر صاحب کا ہومیو پیتھی ہسپتال تھا اور ہمارے ان سے فیملی مراسم تھے۔ صبح سے گئی یہ دونوں شام کو لوٹیں تو میں نے ڈانٹا کہ یوں پریشانی ہونے لگتی ہے کم از کم کوئی خبر اطلاع تو دے دیتے۔ موبائیل بھی بند کر رکھا تھا۔ عصمی نے کوئی بھی صفائی نہ دی تو مجھے شک ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے پھر پوچھا تو وہ یکبارگی رو کر بولی۔ " میں مر جاؤں گی تو پھر کس کو ڈانٹو گے۔۔۔؟" مجھے ایسے جواب یا سوال کی توقع نہ تھی۔ اب میں سچ مچ پریشان ہو گیا۔ اسے کندھوں سے تھام کر پوچھا تو وہ میرے ساتھ لگ گئی اور بلک کر بولی۔ " مجھے کینسر ہے۔۔۔!!!" وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ہسپتال میں نئی 'الٹراساونڈ' مشین نصب ہوئی تھی۔ اسے دعوت دی گئی تو رپورٹ سے پریشان ہو کر ٹیسٹ دوبارہ کیا گیا اور پھر ڈاکٹر نے اسے "بریسٹ کینسر" تشخیص کر کے مشورہ دیا کہ ایک دو روز میں فیصلہ کر کے وہ آجائے تو متاثرہ حصے کو الگ کر کے تیسرے دن اسے ڈسچارج کر دیں گے۔۔۔" شیرازہ تو میرا بھی بکھر گیا تھا لیکن یہ فیصلہ مجھے قبول نہ تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ کینسر محدود ہے پھیلا ہوا نہیں۔ نیم جانی سے میں نے اسے تسلی دی کہ صبح ہوتے ہی شوکت خانم ہسپتال سے چیک کروائیں گے۔ اگلا فیصلہ اس کے بعد ہو گا۔

وہ رات' عالمِ خوف کی رات تھی۔ میری زبان' میرے حواس' میری سوچ سبھی یکدم مفلوج ہو گئے تھے۔ یوں جیسے میں خلا کے سکوت میں معلق ہو گیا تھا۔ رفاقت کے ان تمام برسوں میں عصمی کو کھو دینے سے بڑھ کر مجھے کبھی کوئی خوف نہیں رہا۔ ہارٹ اٹیک ہوئے تو میں نے بس اس کا ہاتھ تھامے ہوئے مرنا چاہا۔ وہ پاکستان' لندن یا کہیں اور جاتی تو مجھے دیمک چاٹنے لگتی کہ میں پھر اسے دیکھ پاؤں گا یا نہیں؟ بلاشبہ میں خود غرض ہوں اور میں نے ہمیشہ اس سے ایسی وفاداری چاہی کہ میرا دم نکلے تو آخری لمحوں اس کی صورت میری آنکھوں میں ہو۔ اور یہ عاشقی نہیں' اک اعتراف تھا۔ میری نگاہ میں وہ مجھ سے بہت بہتر انسان تھی اور بچوں کو آپس میں پیار سے باندھے رکھنے کے لئے وہ انمول دولت تھی۔

اگلی صبح کار جلدی منگوالی تھی۔ ہسپتال اوقات شروع ہونے سے پہلے ہی ہم وہاں تھے۔ اپنی تعلیم کے پسِ منظر میں مجھے ایک خوف تھا کہ کینسر "ٹیومر" فی الحال اگر صرف بریسٹ ہی میں سویا سمٹا ہے تو بائیوپسی (Biopsy) سامپل کے لئے اسے لازمی طور پھوڑنا پڑے گا۔ یوں بکھر کر وہ پھیل گیا تو۔۔۔؟ لیکن اس سوال کا تسلی بخش جواب مجھے کہیں سے نہیں ملا۔ لہٰذا شک کی لکیر پار کرنے کے لئے مجبوراً" ہمیں آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ صبح لاکھ روپے سے زیادہ رقم لے کر امید خریدنے نکلا تھا۔ دن بھر خوف وابتلا کی منزلوں سے گزر کر رات گیارہ بجے خالی ہاتھ وہاں سے واپس چلا تو میں اس بری طرح چیخ چکا تھا کہ عصمی کو کھوکھلے الفاظ میں تسلی دیتی میری اپنی آواز پہ خود مجھے ہی یقین نہ تھا۔ جانے وہ خود کس کرب سے گذرتی میرے جھوٹ کو سہارا دے رہی تھی جب کہ ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ کینسر کنفرم ہو چکا ہے اور ہمارے قدموں تلے زمین اچانک ہی دھسانی ریت میں بدل گئی تھی۔ جو ہمارا اعتبار و اعتماد نگل گئی تھی۔

اگلے تین دن ہم شوکت خانم ہسپتال کے ڈاکٹروں سے مشورے کرتے رہے۔ ہر کوئی سوچے سمجھے بغیر اگلے ایک دو روز میں متاثرہ حصے کو کاٹ الگ کر دینے کے لئے کہہ رہا تھا۔ لیکن جلد

بازی کی بجائے میں یقین چاہتا تھا کہ کیا صرف یہی اس کا آخری حل ہے؟ ہمیں دو ہفتہ کا وقت دے دیا گیا۔ ادھر شوکت خانم کا نام منہ سے نکل جانے پر بچے پریشانی میں بار بار ٹیلیفون کر رہے تھے۔ چنانچہ رشتوں کی تلاش وغیرہ ترک کر کے واپس دوبئی پہنچ گئے۔ اگلے ہی روز یہاں ایک پرائیویٹ اسپیشلسٹ لیڈی سرجن سے ملے۔ انہوں نے بھی اپنے ٹوکے چھریاں کھنکھنائیں۔ لگ بھگ پچیس ہزار درہم فیس فرمائی اور نوید سنائی کہ ایک روز بعد متاثرہ حصے کو کاٹ الگ کر دیں گی۔ مجھے لگا ہم اندھی گدھوں کے ہجوم میں پھنس گئے ہیں۔ پھر ہم اس کے پاس نہیں گئے۔ اگلے دن کویتی ہسپتال میں "گوا" کے ایک کینسر سپیشلسٹ کا مشورہ لینے گئے۔ ان دنوں لیسسٹر سے اٹھا کولہے کا درد پھر عود کر آیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے پیشِ نظر فجیرہ ہسپتال میں 'باڈی سکین' کے لئے پرچہ بنا دیا۔ وہاں گئے۔ میں باہر بیٹھا دعائیں مانگتا رہا کہ سب خیریت ہو لیکن آدھ گھنٹہ بعد ٹیکنیشن برآمد ہوا تو مجھے سامنے پا کر اس نے بہت مایوسی سے سر ہلایا۔ میں اسے الگ کھینچ لے گیا۔ اس نے بتایا کہ سارے بدن کی ہڈیوں میں پھیلا ہوا گریڈ 4 کینسر ہے۔ عصمی کچھ دور بنچ پہ بیٹھی غور سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ہمارے بیچ احساس کا ایک ایسا رشتہ تھا کہ کچھ کہے سنے بنا بسا اوقات ہم دونوں اک دوسرے کے دل کی بات چہروں پہ پڑھ لیتے تھے۔ اب دور سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ مجھے لگا جیسے اس کے ذہن میں منفی سوچ کا دھارا بہہ نکلا ہے۔ "لو! اپنی کہانی تو ختم ہوئی۔۔۔" میں نے کبھی اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ لیکن اس ساری خبر کی دہشت ایسی تھی کہ یکلخت مجھے لگا جیسے میں اس کے ساتھ کسی ریلوے اسٹیشن پر کھڑا ہوں۔ ٹرین سرکنے لگی تو میرا ہاتھ چھڑا کر وہ کچھ کہے بتائے بغیر اچانک ہی اس میں سوار ہو گئی ہے۔ جانے کیسے' میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔ میں نے چیخ چیخ اسے پکارنا چاہا لیکن یوں جیسے میری آواز کھو گئی تھی۔ عالم خوف کے وہ چند لمحے میری ہستی کو تہہ و بالا کر گئے۔ قدم آزاد ہوئے تو میں ٹوٹا بکھرا اس کے پاس آیا اور کہیں گہرے کنویں میں سے بولا۔ "ہڈیوں میں بھی ہے لیکن اعضائے جسم محفوظ ہیں۔

مناسب علاج سے انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔" میرے پاس کوئی اعجازِ مسیحائی تھا اور نہ وہ یقین' کہ کہہ دوں۔ "تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔۔۔" لیکن میں نے جو کہا اس نے چپ چاپ مان لیا۔ اس صنف کا خمیر ہی ایسا ہے کہ مشرق سے ہو یا مغرب سے' مرد کو بہر صورت ناخدا ضرور مانتی ہے۔

پھریوں جیسے اوس کی ننھی ننھی چھنٹ سے دھیرے دھیرے شبنم کی بوند بنتی ہے۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا حوصلہ' امنگ اور جولانیِ طبع پھر سے لوٹ آئے۔ اس کے رویوں میں بھی تبدیلی آگئی۔ بچوں کی وہ ہمجولی بن گئی۔ آدھی آدھی رات تک گھر ہی میں ان کی پکنک پارٹیاں چلتی رہتیں۔ دوسری منزل پہ فلیٹ تھا۔ ٹیلیفون پہ مشروبات و برگر' پیزا' (Pizza) کا آرڈر دیا جاتا۔ ڈوری باندھ کر کھڑکی سے لفافہ لٹکاتے' پیسے نیچے اور سامان اوپر پہنچ جاتا۔ میں اپنے کمرے میں ان کی کھلکھلاہٹ اور قہقہے سنتا رہتا۔ ادھر شوکت خانم کی تاریخ بھی سر پہ آن پہنچی تھی۔ تیاری ہو گئی۔ اب کی بار بیٹی بھی ساتھ آئی۔ شوکت خانم ہسپتال کے پہلو میں واقع ہوٹل میں قیام کیا۔ کہاں تو صرف دو تین ہفتے پہلے وہ ڈاکٹر فوری سرجری کے لئے مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے' اب رپورٹیں دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ کیس کی نوعیت ہی بدل گئی ہے لہٰذا اب سرجری کا کوئی امکان نہیں۔ میں نے سوچا کتنی عورتیں ہوں گی جو ایسے غلط اقدام یا ہمارے ڈاکٹروں کی جلد بازی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ ان کے پیشِ نظر ایک موٹی رقم کی کمائی ہوتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی ہر عورت کو اپنے بدن کے اس حصے سے عشق ہے۔ اس کی ممتا وہیں تو نمو پاتی ہے۔ اور حتمی تفتیش کے بغیر چھاتی کو جسم سے کاٹ پھینکتے آپ جذباتی طور پر ایک عورت کی مکمل انسائیت کا قتل کر دیتے ہیں۔ میں نے شوکت خانم میں ایسی کتنی ہی کراہتی' بلبلاتی' عذابوں سے گذرتی عورتیں دیکھی ہیں جن کی چھاتیاں بلا تعین الگ کر دی گئیں اور اب وہ باقی بدن میں پھیلے کینسر کا علاج کروا رہی تھیں۔

جانے کہاں' کس ڈاکٹر نے' کسے اپنی مہارت کا تختۂ مشق بنایا ہو گا؟ مشکل تو یہ ہے کہ ان کے لباس سے خون کی بو بھی نہیں آتی۔

اب تک تمام عزیز واقارب میں عصمی کے کینسر کی خبر پہنچ چکی تھی۔ رشتہ دار ہوٹل میں آنے شروع ہو گئے۔ بعض اوقات آدمی کی بے حسی اور خود غرضی پہ شرم آنے لگتی ہے کہ ان میں بیشتر وہ تھے جو اپنی ضروریات کے لئے عصمی سے مالی امداد حاصل کرنے آئے تھے۔ وہ فتوے حاصل کر کے آئے تھے کہ ہماری زکوۃ' خمس اور صدقات سب ان پر حلال ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہر کسی کی ضرورت دو لاکھ سے چھ لاکھ روپے تک تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ حاتم طائی کا صدقہ یا بخشیش اس کی شہرت کے اعتبار سے بڑی ہونی چاہیے۔ ان مہمانوں میں ایک کھرا انسان منظور شاہ بھی آیا۔ عصمی کی تشخیص سے کچھ عرصہ پہلے مجھے خبر ملی تھی کہ اسے کینسر ہے۔ میں تو کیا' شروع شروع میں کسی نے بھی نے اس پر یقین نہیں کیا۔ ہر کسی کا خیال تھا کہ وہ لاپرواہ' لاابالی سا انسان اپنا ذاتی چندہ جمع کرنے کا اک نیا بہانہ لایا ہے۔ اس کی ضرورت ہمیشہ پچاس' سو سے پانچ سو تک ہوتی تھی۔ وہ ملتے ہی شور شرابہ ختم کر کے وہ رخصت ہو جاتا۔ اس بار میری اور اس کی ملاقات شاید سال' ڈیڑھ بعد ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹیں اور ٹانکے لگی کمر دکھائی۔ کینسر تمام بدن میں پھیلا ہوا تھا چنانچہ انہوں نے ایک پھیپھڑا بھی کاٹ نکال دیا تھا۔ میرے سامنے بیٹھ کر وہ بے طرح رویا۔ "پہاجی! میں مرنا نہیں چاہتا۔۔۔" یہ وہ شخص کہہ رہا تھا جو زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے کا فن جانتا تھا۔ میں کسی گونگے' کھوکھلے بت کی طرح اسے بس تکتا رہا۔ وہ اور عصمی دو مختلف ماؤں سے اوپر تلے کے بہن بھائی تھے۔ شاہ جی اور ان کی بیگمات زندگی کے آخری لمحے تک کینسر کے احساس سے ناآشنا رہے۔ اِن ہی دونوں کو اس دیمک نے جانے کہاں سے تاک لیا؟ وہ تو اپنے جلو میں اِدھر اُدھر بانٹنے کے لئے بھی چھوٹی چھوٹی خوشیاں' چہچہاہٹ اور کچھ کھکھلاتے لمحے ساتھ لئے چلتے تھے۔ مجھے یاد ہے شاہ جی نے منظور شاہ کو کسی اہم کام کے لئے پیسے دیئے۔

ان کی کڑک طبعیت جاننے کے باوجود اس نے وہ رقم محلے کے کسی غریب آدمی کی مدد میں خرچ کر دی۔ اب وہ خود فریاد کر رہا تھا۔ اس کے آنسو میرے اندیشوں میں درد کی اک اور تصویر کھرچ رہے تھے۔ صبح ہسپتال میں وھیل چئیر پہ بیٹھی ایک ہلدی رنگی عورت کو دیکھ میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل عصمی کو دیکھے جارہی تھی۔ وٹینگ ہال میں' لیبارٹری میں' ڈاکٹر کے کمرے باہر راہداری میں' کینٹین میں' ہر جگہ وہ سایے کی طرح آن پہنچتی۔ اب منظور شاہ کے آنسووں میں تر چہرے نے مجھے دہلا دیا۔ میں اسے زندگی تو نہیں دے سکتا تھا جو کچھ میرے بس میں تھا' کیا اور وہ چلا گیا۔ چند ماہ بعد ایک رات کار میں دوران سفر باتیں کرتے وہ خاموش ہوا اور پھر

وہ ہجر کی رات کا ستارہ' وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا' سنا ہے کل رات مر گیا وہ

کینسر کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہ تھا' سوائے اس کے کہ یہ وہ بیماری ہے جس کا نام تو کافی پرانا ہو چکا لیکن علاج ابھی تک کوئی دریافت نہیں ہوا۔ خاندان میں دائیں بائیں جو لوگ اس کی گرفت میں آئے تھے وہ سب آنا" فانا" اوراقِ پارینہ کی کہانیاں بن چکے تھے۔ صرف منظور شاہ آپ بیتی کا قصہ گو رہ گیا تھا۔ ہاتھ سے کان کے پیچھے ہوا اڑانے والی چند رشتہ دار عورتیں بھی ملیں جنہوں نے بڑی بے نیازی سے بتایا۔ "لو! مجھے تو پچھلے سال تین بار کینسر ہوا تھا۔۔۔" اپنی پریشانیوں میں ان کی بن مانگی قیمتی فضولیات مجھے بہت مشکل ہضم ہوئیں۔ شوکت خانم ہسپتال کے ڈاکٹروں نے نپی تلی مخصوص ہدایات کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جو کچھ بھی ملا وہ مجھے 'انٹرنیٹ' سے ملا۔ اتنا زیادہ کہ میں 'کنفیوز' ہو گیا۔ جو پلے بندھا وہ "ریڈی ایشن" اور کیموتھراپی" تھیں جن کے عذابوں کو میں جانتا سمجھتا تھا۔ باقی ہارمونل ادویات کا علاج تھا۔ لیکن ان سب سے بڑا مسئلہ لاہور شوکت خانم میں علاج کروانا تھا۔ ہر تین ہفتے یہاں اور ایک ہفتہ دوبئی۔ پاکستان میں ہمارا اپنا کوئی بھی گھر مکان نہ تھا۔ آنا جانا' ہوٹلوں میں رہنا یہ

ایک ایسا امر تھا جو معاشی اور انتظامی طور پر ہمارے گھر کو بکھیر دیتا۔ دوسرا حل یہ تھا کہ مہنگا سستا' یو اے ای میں ہی علاج ہو۔ وہاں العین اور ابو ظہبی میں کینسر ہسپتال تھے۔ وہاں کیس رجسٹر کروانا تھا۔ ریٹائر ہو جانے کے بعد میرے معاملات' واسطوں میں بہت فرق آچکا تھا اس لئے بوبی کوشش کر رہا تھا اور میں فقط منتظر تھا۔

شوکت خانم میں ڈاکٹروں سے مشورے' ہدایات لینے کے بیچ عصمی نے رشتے دیکھنے کا کام پھر سے شروع کر دیا تھا۔ اب کی بار اسے کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ ماں کیسی بے بہا نعمت ہے کہ کتنے ہی روز صبح سے شام تک اسے آرام کا وقت نہ ملا' جب' جہاں' جیسے ہی' رات دس بجے بھی کوئی بلاوا آیا وہ یوں اٹھ کر چل دی جیسے تازہ دم ہو۔ نہ دیر سویر کا گلہ' نہ درد کی شکایت۔ لیکن میں نے خاص طور پر اس کی یہ کوشش نوٹ کی کہ وہ مجھے تنہا بیٹھنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ مجھے سوچوں کے گنجھل پھیلانے' انہیں سنوارنے سلجھانے اور ان کی کڑیاں آپس میں پرونے کی بیماری ہے۔ میرے دل میں خوف اور درد کے جھرنے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے میرے آگے اپنی سانجھ کی دیوار کھڑی کر دی۔ جانے کیسے' کہاں سے وہ اپنی باتوں میں گلوں کی وہی خوشبو سمیٹ لائی جو شادی کے ابتدائی دنوں میں تھی۔ ہنسنا' کھکھلانا اور لمحوں کو بھی گنگانا۔ سبھی آنے' ملنے والے کہہ رہے تھے کہ بیماری کے مقابل اس کا رویہ بہت مثبت ہے لیکن میں اس کے ساتھ اتنی زندگی گذارنے کے بعد اس کے سانسوں سے بھی اس کی نبض پڑھ سکتا تھا۔ کئی بار بہت چاہا اس کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے جی بھر رولوں کہ "عصمی! میں اتنا مضبوط آدمی نہیں ہوں جتنا تم سمجھتی ہو۔ مجھے جینے کے لئے اس ہاتھ کی بھی ضرورت ہے جو میرا ہاتھ تھام کر مجھے بھی یقین دلائے کہ۔۔۔ "حوصلہ رکھو! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ تمہیں تنہا چھوڑ کر جانے کی بے وفائی نہیں کروں گی!!!" لیکن اس کی تو اپنی ہی دھن تھی کہ گذرتے پلوں کو گلال کئے جا رہی تھی۔ پھر ایک روز پتہ نہیں کیسے' کسی کی' یا شاید میری ہی نظر لگ گئی کہ اس کے سارے آبگینے ٹوٹ گئے۔ غالباً" چوتھا پانچواں دن تھا۔

ہم ایک رشتہ دیکھ کر لوٹے تھے۔ میں انہیں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر فارمیسی سے دوائی لینے چلا گیا۔ واپس لوٹا تو پتہ چلا وہ ماں بیٹی چھت پر ہیں۔ میں ان کے پیچھے اوپر پہنچا تو عصمی موبائل پر کسی سے کہہ رہی تھی۔

"ان دونوں سے ذرا صبر نہیں ہوا کہ ادھر مجھے کینسر کا پتہ چلا۔ میں علاج کے لئے لاہور آئی ہوں اور اُدھر انہوں نے اپنی شادی رچالی۔ یہی موقع ملا تھا ان کو۔۔۔؟ کیا آپ کو اس بات کی خبر تھی۔۔۔؟"

جواب میں جانے کیا کہا گیا کہ یکلخت اس نے موبائل بیٹی کو تھمایا اور سیمنٹ کی سل پر بیٹھ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بلک بلک رونے لگی۔ ادھر بیٹی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اسی دوران اسے بھی شاید ایسا ہی کہا گیا کہ اس نے موبائل مجھے تھما دیا اور روتے لہجے میں بولی۔

"وہ بہت گندی زبان بول رہی ہے۔۔۔"

میں نے سنے بغیر لائن کاٹ دی۔ عصمی کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دیتے میں نے بیٹی سے پوچھا تو پتہ چلا۔ ہمارے سب سے بڑے بیٹے عدیل نے شادی کر لی ہے اور تین روز سے گھر چھوڑ دیا ہے۔ لڑکی کی ماں کینیڈا میں رہتی تھی۔ عصمی نے اپنے جی کا درد کہنے کے لئے پوچھا کہ کیا یہ شادی اس کے علم میں تھی؟ تو اس نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی چوراہے میں گڑ گیا ہوں۔ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ کدھر جاؤں' انہیں سنبھالوں؟ ان کے ساتھ مل کر اس عورت کی بد اخلاقی کا سوگ مناؤں؟ بیٹے کے کئے پر تڑپوں؟ یا اپنے آپ کو رو لوں؟ اسی بیٹے کے لئے ہم نے بہت ارمانوں' بہت پیار سے اس وکیل لڑکی کو چنا تھا۔

XXX

اک قیامت سی تھی جو اس رات ہمیں چھو گئی۔ میں عصمی کو تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کر چکا تھا اور اب بیٹی اسے سنبھال رہی تھی لیکن اس کے آنسو تھم نہ رہے تھے۔

"اتنے بڑھے ہوئے مرض سے کہاں بچ پاؤں گی۔ میرے مرنے کا انتظار ہی کر لیتے؟" وہ سسکی۔ "ماں نے بلائیں لیں نہ باپ نے سہرا باندھا۔ بہن نے لاگ لاڈ کیا نہ بھائی قدم ملا کر ساتھ چلے۔ مبارک ہو! پہلے' بڑے بیٹے کی شادی تو ہو گئی۔۔۔" اذیت سے کچلی وہ تڑپی۔ " کیا اسی لئے پالا پوسا تھا میں نے اسے' کہ مرتے لمحوں وہ مجھے چھوڑ جائے؟ یہی موقع ملا تھا اسے۔۔۔؟

دو سال پہلے بھی انہی دونوں کے عشق نے ہمیں لگ بھگ ایسی ہی اذیتوں سے گذارا تھا۔ سمجھایا بجھایا اور پھر ہم نے باور کر لیا کہ اصلاح ہو گئی۔ زندہ رہنے کے مسائل ایسا انبار ہیں کہ بچوں پر سالوں نظر رکھنا ناممکن ہو چکا ہے۔ سوسائٹی کا ارتقا پرانی قدروں اور آداب کو چاٹ گیا ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ماں باپ میں تھکن اور جوان اولاد میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی سرکشی زیادہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم اپنے بھولے ہوئے سبق کو پڑھ رہے تھے۔

"وہ دنیا کا پہلا لڑکا نہیں ہے جس نے ایسا کام کیا ہے۔۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "عشق' چاہ تو ہے ہی ایسی ہوشربا سرکشی' کہ آدم سے جنت اور اللہ کی قربت بھی چھین لیتا ہے۔ تمہاری تربیت میں کوئی کمی نہ تھی بس ان کے خمیر میں باغی عشق رچا ہے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ ہمیں باقی سب کو تمہاری ضرورت ہے۔۔"

لیکن میری دلیل اس پر اثر نہ کر رہی تھی۔ اس کا دوسرا بڑا صدمہ تھا کہاس لڑکی کی ماں نے بہت گندی زبان بولی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے ٹیلیفون کرنا فاش غلطی تھی لیکن جس کا پاؤں کسی اور کے بجھائے انگاروں پہ جلا ہو اس سے ہوشمندی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ اور کینیڈا میں تہذیب و اخلاقیات کی ڈگریاں تو نہیں بٹتیں کہ اتفاقاً" بن جانے والے اس رشتے کو اخلاق اور اسلوب سے استوار کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ادھر پنجاب کی ایسی اجڈ گنوار عورت بیٹھی تھی جس نے مغز کی پوٹلی سے صرف زہر اگلنا ہی سیکھا تھا۔ یہی کارزارِ حیات ہے۔ کبھی کبھار ماں باپ بھی کانٹوں کی ایسی فصل بیج ڈالتے ہیں کہ اولاد ساری عمر کاٹتی ہے۔
صبح بوبی کا ٹیلیفون آگیا کہ "العین" کے "توام ہسپتال" میں نام رجسٹر ہو گیا ہے۔ شوکت خانم میں ایک ڈاکٹر عظمت تھے انہیں لاہور میں علاج سے متعلقہ اپنے مسائل بتائے تو انہوں نے العین ہسپتال کے نام مرض کی تفصیلی رپورٹ اور علاج سے متعلقہ اپنی تجاویز لکھ دیں۔ چنانچہ جلدی جلدی اپنے کام نمٹائے اور مزید تاخیر کئے بغیر ہم واپس دوبئی لوٹ آئے۔ رشتے' شادیوں کے منصوبے ایک بار پھر ہنگامِ حالات کی نذر ہو گئے۔
ایرپورٹ پر سب سے چھوٹا بیٹا احتشام "سنی" ہمیں لینے آیا تھا چنانچہ ایف آئی آر وہیں سے بننی شروع ہو گئی۔ گھر پہنچے تو عصمی کا موبائیل بھی کھنکھنانے لگا۔ عدیل نے شاید ڈر سے اُس کی کال نہیں لی لیکن گھنٹہ دو میں اس نے اِدھر اُدھر اس کے دوستوں سے تمام معلومات حاصل کر لیں۔ کب' کہاں' کیسے یہ شادی ہوئی' کون کون دوست اور ان کی بیگمات شامل تھیں۔ فوٹو سیشن ہوئے' ایک پکنک پارٹی تقریب فجیرہ میں بھی منائی گئی وغیرہ وغیرہ۔ پتہ نہیں عصمی کے جی میں کیسا اندھا الاؤ تھا کہ وہ اس لاوے کو اپنے اندر سمیٹتی گئی۔ یوں پہر پہر دن بیت گیا۔ مجھے معلوم تھا رات اس کا اسسٹنٹ سنی ڈیوٹی سے واپس آجائے گا تو یہ آتش فشاں جاگے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ اِدھر میں نے اپنے کمرے کی بتی بند کی اور اُدھر پانچ منٹ کے اندر وہ دبے پاؤں کھسک گئے۔ میں نے اوپر کھڑکی میں سے جھانکا۔ بیٹی بھی ان کے ساتھ

تھی۔ پھر گھنٹوں گذر گئے وہ نہیں لوٹے۔ صبح ہسپتال میں کاغذات مکمل کرتے مجھے پتہ چلا کہ عدیل جہاں رہتا تھا وہاں کی گلی گلی اس کی کار تلاش کرتے بالآخر انہوں نے گھر پا ہی لیا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن آنگن میں پلائی وڈ کے بنے اور بھی کمرے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان کی الف لیلہ ہزار داستان مزید نہیں سنی۔ مجھے یقین تھا کہ عصمی اس دروازے سے لگ کر روئی ہو گی۔ "عدیل کو وہاں نیند کیسے آتی ہو گی؟" اپنے گھر میں وہ خود بھی اس کے بند کمرے کے آگے سے دبے پاؤں گذرتی تھی کہ اس کی نیند بہت کچی ہے وہ بے آرام نہ ہو۔ بہت دنوں سے اس نے بیٹے کو دیکھا بھی نہ تھا اور یوں ممتا نے اسے بہت رلایا ہو گا۔ دوسری جانب میں تھا۔ دو دھڑوں کے بیچ میں پستا ہوا۔ کسے سمجھاتا؟ اسے' جو چھوڑ کر چلا گیا تھا؟ یا اسے' جو چھوڑ جانے کا خوف و درد خود میرے اندر جگا رہی تھی؟ بعض اوقات بے بسی سے آدمی خود اپنے ہی اندر محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

ابتدائی ٹیسٹوں اور کاغذات مکمل کر کے توام ہسپتال العین آتے آتے کئی دن گذر گئے۔ کینسر کے مریض ہم نے شوکت خانم ہسپتال کے دالانوں' راہداریوں' انتظار گاہوں اور وارڈوں میں بھی دیکھے تھے۔ خدا جانے کیوں' وہاں خون سے نچڑے ہوئے چہرے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ لیکن یہاں ایک بالکل ہی الگ منظر تھا۔ عورتیں' مرد' شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکیاں' بچے یوں چلے آ رہے ہیں جیسے کسی پارک میں جھولے لینے آئے ہوں۔ اکثریت کے چہروں سے کینسر کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ بالخصوص ملازمت پیشہ جوان لڑکیاں پورے میک اپ میں آتیں۔ تیس پینتیس منٹ اپنا "کیمو" سیشن لیتیں اور فوجی جوانوں کی طرح چاک وچوبند 'ٹھک ٹھک' چلتی لوٹ جاتیں۔ عجیب بات ہے کہ اس خطے میں عورتوں کی سب سے زیادہ اموات کینسر سے ہوتی ہیں لیکن انہوں نے اپنی رگوں ہڈیوں میں اس خوف کو سرایت نہیں کیا۔ دوسرا فرق مجھے شوکت خانم سے آئے ہوئے ایک مریض نے بتایا کہ "وہاں مفت ملنے والی ادویات اتنی سخت ہیں کہ مرض سے زیادہ آدمی کو وہی کھا جاتی ہیں۔ بہتر علاج وہاں

بھی میسر ہے لیکن اس کے لئے آدمی کو بادشاہ ہونا چاہیئے۔" میں نے اس کی تصحیح کر دی کہ پاکستان میں بادشاہ لوگ اب صرف سیاسی لیڈر ہیں جو عوام کے خرچے پر ہر چھ ماہ بعد اپنے کھانسی زکام کا چیک اپ لندن' نیویارک میں کرواتے ہیں۔ بہتر علاج سفارشی وی آئی پیز کے لئے مخصوص ہے۔ اور ہم دیس بدر تو عوام تھے اور نہ بادشاہ۔ خدا کا شکر ہے کہ اسی کے سایۂ رحمت تلے تھے۔ ہمیں تو ام ہسپتال نے تھام لیا۔ وہاں ایک بہت دھیمی طبعیت والے لبنانی ڈاکٹر جعفر سے ملاقات ہوئی۔ انہیں شوکت خانم کے ڈاکٹر عظمت کی سفارشات دکھائیں اور انہوں نے اتفاق کرتے ہوئے "ہارمونل" علاج سے ہی ابتدا کی۔ بیماری کے مقابل ہمت بڑھائی۔ حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے رویے مثبت رکھنے کی تلقین کی۔ ادویات دیں اور انجکشن لگادیا۔ ہم لاہور سے اس "ہوّا" بیماری سے متعلق لوگوں کے ڈرائے ہوئے تھے۔ دوسروں کے برعکس ہم گھنٹہ بھر وہیں بیٹھے رہے کہ اگر کوئی 'ری ایکشن' ہو جائے تو ہسپتال سے فوری طبی امداد مل جائے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ڈرتے ڈرتے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ گھر پہنچے تو ہر کسی نے بنا کہے' بتائے' آپ ہی آپ کچھ نہ کچھ ذمہ واری سنبھال لی۔ اس کی بہن مسعودہ اٹلی میں تھی، بھانجے بھانجیاں' بھتیجے برطانیہ' فرانس اور جرمنی میں مقیم تھے۔ پروگرام بننے لگے کہ وہ جلدی جلدی ٹھیک ہو جائے تو اس بار وہ ان سب کو ملنے چلیں گے۔ عصمی ان کا ساتھ تو دے رہی تھی لیکن مجھے اس کی سوچوں پہ مسلسل اک مبہم سے سائے کا پہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں اسے تکے جانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ عدیل اس روز بھی نہیں آیا تھا لیکن آئینوں' آبگینوں کی پاسبانی کا خیال کرتے میں نے کوئی تبصرہ کیا اور نہ اس نے ہی کوئی گلہ' شکوہ' ذکر تک کیا۔ وہ اپنے درد کو مجھ سے زیادہ جانتی تھی اس لئے بچوں کے ساتھ اور بھی کھل کر ہنس رہی تھی۔ شاید یوں اسے میرے ارد گرد بھی ریشمی پردوں کی سرسراہٹ پھیلانی مقصود تھی۔ رات کا ڈیڑھ بج گیا تو وہ بشاش لیٹتی ہوئی بولی۔

"مجھے تو منظور شاہ نے ایسے ہی ڈرا دیا تھا کہ اس انجکشن سے یہ ہو جاتا ہے' وہ ہو جاتا ہے۔ طبعیت بہت بوجھل ہو جاتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔۔۔"

بچے مطمئن ہو گئے اور اللہ سے دعا کرتے اٹھ گئے کہ اسے کچھ نہ ہو۔ بیٹی نے اسے لحاف اوڑھا دیا۔ میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا لیکن مجھے اگلے پہر بھی نیند نہ آئی تو اک بار پھر اسے دیکھنے گیا۔ بتی جلتی چھوڑ کر وہ دونوں سو رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں' میرے اندر نہ سمجھ آنے والا اک گھن سا لگ گیا تھا۔ میں کچھ دیر اس کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر بے چین سا لوٹ آیا۔ شاید گھنٹہ بھر نیند لی ہو گی کہ اعصاب و تحت الشعور میں مچلتی بے چینی سے پھر آنکھ کھل گئی۔ اٹھا اور دوبارہ اسے دیکھنے گیا۔ وہ اب بھی سو رہی تھی لیکن عجیب بات تھی کہ اس بار اس کا چہرہ بھی لحاف کے اندر تھا۔ وہ کبھی ایسے نہ سوتی تھی۔ دل سہا لیکن اپنی تسلی کے لئے اس کی نیند میں مخل ہونا بھی درست نہ تھا اس لئے بہت پل میں پاس کھڑا اس کے سانس کا اتار چڑھاؤ محسوس کرتا رہا۔ اطمینان ہو گیا تو میں پھر لوٹ آیا۔ صبح ہوئی تو بچے تیار ہو کر میرے سامنے ہی اپنے اپنے کام کاج پر نکل گئے۔ تقریباً" ساڑھے نو بج گئے اور وہ آدھی رات سے تب تک اسی کروٹ بلا جنبش پڑی رہی تو میں پریشان ہو گیا۔ وہ اتنا دن چڑھے تک کبھی نہیں سوئی تھی۔ میں نے دو تین بار آواز دی۔ جواب نہیں ملا۔ ایک کونے سے لحاف اٹھایا تو وہ مکمل بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے ماتھے' چہرے اور بازو پہ ہاتھ لگایا تو وہ بالکل ٹھنڈے۔ لباس اور لحاف اندر سے یوں گیلے جیسے بستر میں ہی ڈونگے بھر بھر پانی سے نہلا دیا ہو۔ گھبرا کر میں نے اسے ہلایا۔ وہ تب بھی نہ بولی تو خوفزدہ ہو کر میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ پھر کہیں وہ کراہی۔ اس سرد بدن کے نیچے سے ہاتھ ڈال میں نے اس بٹھانا چاہا تو وہ نرم گندھے آٹے کی طرح میرے بازوؤں کے اوپر سے ڈھلک گئی۔ اکثر و بیشتر ایسے مواقع پر میں اپنے حواس قائم رکھتا ہوں لیکن تب مجھے بالکل سمجھ نہ آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ بانہوں میں کس

کر میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے گال سے گال لگائے جھولتا اسے پکارتا رہا۔ جانے وہ کون ساعالم تھا اور کون سا پل' یا پھر کوئی لحہ ٔقبول وایجاب' کہ اک بار وہ ہولے سے کراہی' کسمسائی اور پھر ہوش میں آ گئی۔ دھیرے دھیرے حواس بھی لوٹ آئے۔ اس دوران میں نے بیٹی کو ٹیلیفون کر دیا تھا۔ وہ گھر سے قریب ہی شارجہ ایکسپو میں مینیجر تھی چنانچہ فوراً" آ گئی۔ اس نے العین میں ڈاکٹر سے رابطہ کیا تو احتیاطی تدابیر بتانے کے علاوہ اس نے مکمل ٹھیک ہونے تک اگلا انجکشن ملتوی کر دیا۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ اسے حالات سے باخبر رکھا جائے اور ضرورت پڑے تو فوراً" ایمر جنسی میں لے جائیں۔ پھر سب کچھ اس کی ہدایات کے مطابق ہوا۔ اسی روز احتشام اس کے لئے وھیل چیئر خرید لایا اور ہم اسے باہر کی ہنگامہ پرور دنیا میں بھی لے جانے لگے۔ یوں اس کی حالت سنبھلتے سنبھلتے کچھ دو ہفتے لگ گئے۔ علاج پھر سے شروع ہوا تو گھر کی فضا پہ سوناپن پھر گہرا ہونے لگا۔ دن تو جیسے تیسے گذر جاتا لیکن رات ڈھلتی تو احساس پہ کہرا چھا جاتا۔ ایسے میں بوبی کو ماں کی مایوسیاں دور کرنے کی نئی راہ سوجھی۔ اس نے کہا عمرہ کرنے چلتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو احتیاط کی بہت تلقین کے ساتھ انہوں نے اجازت دے دی کہ تین ہفتے کا کورس پورا ہونے پر ایک ہفتہ آرام ہو گا اس میں جا سکتے ہیں۔ ہر کسی کی ملازمت کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں چنانچہ عصمی کے ساتھ صرف میں اور بوبی ہی جا سکے۔

اعتقادات کی بات ہے۔ ہم تھکے ہارے مسلمانوں کے گھروں میں جیسے ہی اللہ رسول کا نام داخل ہوتا ہے آدھے مسائل تو وہیں حل ہو جاتے ہیں۔ بسیوں ہی لگا جیسے ہمارے گھر میں رحمتوں کے ان دیکھے' غیر محسوس سے بادل اتر آئے ہوں۔ چھوٹی چھوٹی مسکراہٹیں' کھکھلاہٹیں گھر کے گوشوں سے پھوٹنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں امیدوں کی جوت بھی جگنے لگی تھی انہی کی تابانی میں وہ اپنے گلے 'شکوے' شکایتیں اور گذارشات جمع کرتی گئی۔ ہمیں آستانہ ٔرسول کی مہک ساتھ لے کر 'کن فیکون' کی قدرت رکھنے والے کے حضور جانا

تھا۔ 7 ستمبر 2007 فلائٹ آدھی رات مدینہ منورہ پہنچی۔ انوارِ مدینہ ہوٹل میں قیام تھا۔ کمرہ حرم شریف کے بالمقابل اور اتنا قریب تھا کہ یوں جیسے ہاتھ بڑھاؤ اور اس دہلیز کو چھو لو۔ نگاہوں سے جتنا چاہو اس بقعۂ نور گنبدِ خضرا کو چوم لو۔ تہجد کا ابھی وقت نہ ہوا تھا۔ شاید بوبی نے' یا میں نے ہی کھڑکیوں کے درمیان' ہوادان کے سامنے کرسی ڈال دی اور عصمی چپ چاپ اس میں بیٹھ گئی۔ پچھلی بار جب وہ یہاں آئی تھی تب نہ یہ ہوٹل تھا اور نہ ہی وہ روشنیں' قمقے' چھتریاں یا گنبد۔ باب النسا اور بابِ جبرائیل کے سامنے جنت البقیع تک تازہ بنایا ہوا ایک کھلا میدان تھا۔ دوسروں کی طرح ہم بھی وہیں چٹائی بچھا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ بچے تتلیوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کھیلتے رہتے۔ میں ان پہ نگاہ رکھتا اور جس کے پاؤں میں پارے کی تھرتھراہٹ بھری تھی وہ ادھر جاتی اور جالیوں سے لگ کر اپنے دل کی بات کہہ آتی۔ لیکن آج وہ تھکی تھکی' گنگ بیٹھی اس آستانۂ اقدس کو دیکھے گئی۔ اس کی جل تھل آنکھیں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے آسمان کی وسعتوں تلے پھیلا خلاء کا سکوت یکلخت سمٹ کر کمرے سے میری حدِ نگاہ تک پھیل گیا ہو۔ عصمی کچھ کہہ رہی تھی اور شاید ادھر سے بھی کچھ جواب آ رہا تھا لیکن احساس کے دھاروں پہ کشیدہ وہ سب پیغام اتنے غیر مرئی تھے کہ میری سماعت و بصارت ان کا احاطہ نہ کر پائی۔ تبھی ادھر سے بلاوا آ گیا۔ آذان شروع ہو گئی۔ روشوں پہ زندگی جاگ اٹھی۔ محض اتفاق تھا کہ وہ سحر النسا تھی۔ مسجدِ نبوی' ریاض الجنتہ اور روضہ مبارک کی زیارت صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھی اور مردوں کا داخلہ ان اطراف بند تھا۔ بوبی نے ماں کو وھیل چیئر میں بٹھایا اور دھکیلتا ہوا ہوٹل کے سب سے قریبی دروازے پر خدامہ میں سونپ آیا۔ ہم نے کہاں اور کیسے نماز پڑھی؟ مجھے یاد نہیں۔ میری سوچ میں بے طرح بے چینی تھی کہ عورتوں کے اس سیلِ رواں میں اسے کہاں جگہ ملی ہو گی' اس کی ریاض الجنتہ میں نماز کی خواہش پوری ہوئی ہو گی' روضے کی جالیوں سے لگ کر اس نے اپنے دل کی کہی ہوں گی یا نہیں؟ کینسر ہڈیوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے ہمیں پہلے ہی دھکم

پیل میں بہت احتیاط اور پاؤں بچانے کی خصوصی تاکید کی تھی۔ وہ کہیں گر گئی تو؟ باب النساء کے سامنے میں کبھی اِدھر بیٹھتا اور کبھی دوسری جگہ۔ جتنی وھیل چیئر اندر سے بر آمد ہوئیں میری بے کلی اتنی ہی بڑھی۔ پھر کہیں اس کی سواری بھی آئی اور خادمہ نے اسے بوبی کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ وہ بے پناہ خوش تھی۔ اس نے ریاض الجنتہ میں اپنی ہمت کے مطابق جی بھر عبادت کی۔ قرانِ پاک پڑھا اور روضے کی جالیوں سے لپٹ کر زیارت بھی کی اور دل کی ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ کسی نے روکا نہیں' ٹوکا نہیں۔ جب کہنے کو کچھ نہ رہ گیا تو وہ ہٹ آئی۔ لیکن شاید میری بے کلی' میری پریشانی کا جواب ابھی باقی تھا۔ اور کچھ یوں ہوا کہ بابِ مجیدیہ کے سامنے ایک سٹال سے تھوڑی سی کھجوریں خرید کر ہم واپس بابِ جبرائیل کو چلے تو یکلخت میری طبعیت بگڑ گئی۔ لگا' دل گیا۔ کھڑے رہنا بھی مشکل تھا۔ بوبی بے دھیانی میں کہیں آگے نکل گیا تھا۔ عصمی نے دیکھا تو وھیل چیئر سے اٹھ گئی۔ اپنی جگہ مجھے بٹھایا اور خود دھکیلتی بابِ جبرائیل لے گئی۔ اسی راہ اک کوندا سا میری رگ وپے' میری ہستی سے گذر گیا۔

"اب یہ بھی جان لو کہ جنہیں ہم بلاتے ہیں ان کے امین بھی ہم ہی ہیں۔۔۔"

بوبی ماں کو جنت البقیع کی زیارت کروا لایا تھا۔ اب ہوٹل میں ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہوٹل کا سپروائزر ایک پاکستانی ڈرائیور کو لے آیا۔ گذشتہ رات ہی ہم نے اس سروس کے لئے درخواست کر دی تھی۔ نام فضل' شاید ملتان کے قریب مظفر گڑھ کا رہنے والا تھا۔ تقریباً" اٹھارہ انیس سال سے مدینہ منورہ میں ٹیکسی چلا رہا تھا۔ منحنی سا آدمی' اکھڑ کڑک مزاج کا دعویدار لیکن اماں جی کا ہاتھ جو اس کے سر پر پھرا تو تین روز تک انہی کے مدار میں گھومتا ہمارا گائیڈ ہو کر رہ گیا۔ میدانِ احد' اس کی نواحی پہاڑیاں' غار' کنویں' باغ و شجر اور جابجا واقع مساجد' جتنی بھی زیارات اسے معلوم تھیں اور ان سے متعلق جتنے بھی قصے کہانیاں اسے معلوم تھیں انہیں سناتا' وہ ہمیں مختلف زمان وادوار میں گھماتا رہا۔ اسی نے بتایا

کہ میدانِ بدر کے راستہ مکہ چلیں تو ایک کنواں آتا ہے جس میں حضور ﷺ نے اپنا لعابِ دہن ملایا تھا اور وہ پانی شافی ہے۔ وہ مکہ کا ڈرائیور نہیں تھا لیکن خود ہی ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ دربارِ عالی پہ تعظیم پیش کی۔ اذنِ رخصت لی اور اب کارسازِ کائنات کی راہ پہ چل دیئے۔ حسبِ عادت اس بار مجھے نیا فکر چمٹا تھا کہ ٹیکسی میں لگ بھگ آٹھ گھنٹے کا سفر تو اچھے بھلے آدمی کے پیچ پرزے ڈھیلے کر دیتا ہے وہ یہ تھکن کیسے سہہ پائے گی؟ بہر کیف یہ اس کا جنون و شوق تھا۔ بیٹا ہر بات میں اس کا ساتھ دیئے جا رہا تھا لہٰذا میں ساتھ بیٹھا بس اپنے خدشات کی گٹھڑی ہی سنبھالتا رہا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ کنواں پہلے آیا تھا یا شہر بدر۔ بہر کیف وہاں پہنچے تو کئی اور زائرین بھی پتھروں پہ چوکڑی مارے براجمان تھے۔ پتہ چلا کہ کنواں تقریباً" خشک ہو چکا ہے۔ آدھا گھنٹہ بیٹھو تو شاید دو تین لیٹر پانی دستیاب ہو گا۔ ہمیں کوئی دو گھونٹ پانی کنویں سے ملا جو عصمی کو پلا دیا۔ ایک مقامی صاحب کا ٹینکر شاید سب سے پہلے آیا ہوا تھا۔ انہوں نے کئی دوسروں کی طرح ہمیں بھی اپنے ذخیرے میں سے دو چھوٹی بوتلیں دے دیں اور ہم انہیں دعائیں دیتے آگے چل دیئے۔ میدانِ بدر پہنچے تو ہمیں احاطہ قبرستان کی دیوار کے باہر سے بھی فاتحہ پڑھنے کی اجازت نہیں ملی کہ یہ ایک بدعت ہے۔ عجیب بات ہے کہ فہم وادراک کی ان گنت کٹھنائیوں میں پڑا آدمی یہ دھیان تو دیتا نہیں کہ وہ کیوں اور کیسے مسلمان' ہندو یا عیسائی ہو گیا لیکن تاویلیں گھڑتا' دھونس جماتا ہے کہ جس راہ پہ اس کا پاؤں ہے وہی صراط المستقیم ہے۔ فضل نے سمجھایا کہ اس سرزمین پر قانون نہیں' فرمان کی حکمرانی ہے۔ اس نے ایک قریبی مسجد کے پاس ٹیکسی روکی۔ دروازے کے پاس ایک بڑے سے کتبے پر شہدائے بدر کے نام لکھے تھے ہم نے وہیں اپنی تعظیم پیش کی اور آگے نکل لئے۔

سہ پہر مکہ مکرمہ کی حدود میں تلبیہ کہتے داخل ہوئے۔ منزل پہ احرام باندھے۔ ہلٹن ہوٹل میں سامان رکھا اور اللہ کی رحمت کہ کمرہ ایسا ملا جہاں سے صحنِ حرم میں زیارتِ کعبہ بھی ہو گئی۔ فضل ہمیں چھوڑ کر اپنے کام چلا گیا کہ شام کو عرفات' مزلفہ و منیٰ کی زیارات پہ لے

جائے گا۔ ہم مالکِ کون و مکان کے حضور بندگی پیش کرنے چلے گئے۔ آگے بوبی ڈھال بنا' پھر عصمی اور اس کے پیچھے میں' منقش کالے غلاف میں لپٹی کوٹھڑی والے کے مدار میں گھومنے لگے۔ سبحان اللہ والحمد للہ ولا إله إلا اللہ واللہ أکبر۔ نوافلِ طواف بھی ہو گئے اور اب بوسۂ حجرِ اسود کو چلے تو لاکھ کوشش کے باوجود ڈھیروں لوگ عصمی اور میرے بیچ حائل ہو گئے۔ بلکہ کتنی ہی بار میں مدار سے باہر دھکا کھا گیا۔ ایک بار پھر خوف ذہن و دل کو چاٹ گیا لیکن تبھی ایک ہاتھ میری گردن پہ آیا۔ میرے سر کو تھاما اور حجرِ اسود کے چھوٹے سے حجرے میں ٹھونس دیا۔ وہاں دعائیں مانگتے وہ منظر بھی میری نگاہوں میں ثبت تھا۔ ایک شرطہ (پولیس والا) ہاتھ میں ڈنڈا لہراتا' دوسرے ہاتھ سے ہجوم کو آہستہ ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ عصمی اس کے پیچھے کھڑی تھی اور وہ ہاتھ اسی کا تھا۔ بوبی چند قدم دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میرا وجود پگھلنے لگا۔ جی چاہا کہوں۔

"اللہ میاں! میری ہستی' میرے ہونے کا مالک ہی تو ہے تو پھر بار بار یہ ڈرانے کا کھیل کیسا۔۔۔۔۔۔؟؟"

لیکن اسی لمحہ پھر اس ہاتھ نے مجھے حجرے سے باہر کھینچ لیا۔ شاید ابھی کچھ حسابات باقی تھے۔ پتہ چلا عصمی دھکم پیل میں حجرِ اسود تک پہنچی تھی۔ شرطہ نے دیکھا تو خود میدان میں اتر آیا اور ہجوم کو دھیما کیا۔ بوبی اور عصمی نے تسلی سے دل کی کہہ لیں۔ اتنے میں میں بھی لڑھکتا وہاں پہنچ گیا اور جو شاید ممکن نہ تھا وہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ابلیس کی جب اللہ میاں سے ٹھن گئی اور اس نے اللہ کی جانب رجوع کرنے والوں کو بہکانے' بھٹکانے کا ٹھیکہ لے لیا تو پروردگار نے فرمایا "جو میرے بندے ہوں گے ان کے دلوں پہ تم گرفت نہ پا سکو گے۔" اس نے سوال کیا۔ "دلوں کا حساب کون رکھے گا؟" تو اک فرشتہ سر بسجود ہو گیا کہ مالک! تجھے لبیک کہتا جو بھی آئے گا۔ تا قیامت ان کے دلوں کی سچائی یا کھوٹ کا میں امین بنوں گا۔ چنانچہ بصورتِ حجرِ اسود اسے بیت اللہ کے کونے میں نصب کر دیا گیا (واللہ علم بالصواب) شاید

ہمارے دلوں کی دھڑکنیں بھی وہاں رقم ہونی مقصود تھیں کہ ربُ العزت نے خود ہی یہ اہتمام فرما دیا۔ اب آبِ زمزم پیا اور سعی کو چلے۔ کوہِ صفا سے چلے۔ نشیبی حصہ میں سبز روشنیوں کے درمیان فاصلہ طے کرتے چھوٹی چھوٹی ٹائیلوں پہ چلتے مجھے یوں لگا میرے پاؤں کے تلوے پھٹ جائیں گے۔ جیسے تیسے ہمت کر کے وہاں سے گذر تو گیا لیکن مروا سے واپسی پر اسی علاقے میں یوں نیم جان ہوا کہ اگلا چکر شروع کرنے سے پہلے میں بلبلا اٹھا۔ "بوبی میں چل نہیں سکتا۔ آبلہ پا سا ہو گیا ہوں۔۔۔" اسنے فوری طور پر میرے لئے وھیل چیئر کا انتظام کر دیا۔ اب سواری اس اہتمام سے چلی کہ میری دائیں جانب آگے بوبی' پیچھے میرے ساتھ ساتھ' عصمی چل رہی تھی۔ اور میں شرمندہ درمیانی روش پر کرسی پہ دھکیلا جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بقیہ چھ چکروں میں سے کچھ حصہ خود عصمی نے اور کافی فاصلہ بوبی نے دھکیلا تھا کہ ؎

عاشق کا تماشہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

میں عجز سے سر نہوڑے بس ان کے لئے دعائیں ہی کرتا رہا۔

چندے آرام کے بعد حواس کچھ درست ہوئے ہی تھے کہ فضل آ گیا اور عرفات و منی کی زیارات پہ لے چلا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ عصمی کو جبلِ رحمت قریب سے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ حدودِ مکہ سے وہاں پہنچتے رات ہو گئی۔ دفاتر کے پاس گاڑی پارک کر کے ہم شاید کوئی دو سو میٹر ہی چلے ہوں گے کہ مجھے پاؤں تلے زمین کچھ ناہموار لگی۔ میں نے سوچا اندھیرے میں ٹھوکر سے گر نہ جائے وھیل چیئر میں بٹھا لیں تو پہاڑی کے دامن پہ آگے تک جا سکیں گے۔ فضل کے ساتھ میں کار تک گیا۔ واپس لوٹا تو عصمی اور بوبی دونوں ہی غائب۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ آوازیں دیں۔ نظر آئے نہ جواب آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی دکھائی دیں۔ مجھے یقین تھا وہ اس راستہ کوہ پیمائی کرنے گئے ہوں گے۔ وھیل چیئر کو وہیں چھوڑ میں بھاگا کہ کوئی ضرورت پڑ گئی تو بروقت ان کی مدد کر سکوں۔ سانس پھول گیا لیکن وہ نظر نہ آئے۔ دو تین منٹ میں ہانپتا' کانپتا چوٹی پہ پہنچا تو محترمہ اس سنگِ میل کے ساتھ جہاں اِس

زمین' اس دنیا' میں آدم و حوا پہلی بار ملے تھے 'ایک پولرائیڈ کیمرے والے سے اپنی یادگار تصویر بنوا رہی تھی۔

"اِدھر آپ وھیل چیئر لینے گئے میں نے کہا یہی موقع ہے۔ پھر میں اور بوبی بس اوپر آ کر ہی رکے۔۔"

اللہ میاں اس مقام سے بہت ہی قریب تھا۔ شاید نوعِ انسان پر یہیں رحمتوں کی بارش ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرے سبھی وسوسے' سبھی خدشات آپ ہی آپ معدوم ہو گئے۔ جو دعائیں میرے پاس رہ گئی تھیں وہ میں نے وہیں نذر کر دیں۔ میری روح مہک گئی۔

مسجدِ نمرہ کی زیارت کر کے سب مقامات کو چلتے چلتے دیکھا۔ ہوٹل پہنچے تو فضل بھی کمرے تک آیا۔ اس کے پاس ایک نایاب تسبیح تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی اس کی جان بھی لے لے وہ دینے کو تیار ہے لیکن تسبیح نہیں دے گا۔ اب چند لمحے گذرنے کے بعد اس نے خود ہی وہ آگے بڑھا دی۔

"ماں جی۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے میں یہ آپ کو دے دوں۔۔۔" وہ ہمیں کہہ گیا کہ ہمیں جدہ ایرپورٹ پہنچانے کے لئے پھر آئے گا لیکن مجھے معلوم تھا اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ بعد میں ہوٹل کے نیچے تبرکات کی دوکان پر تسبیح دکھائی۔ وہ واقعی بیش قیمت تھی۔

اگلے روز تمام ممکنہ زیارات بھی مکمل ہو گئیں اور پھر اس نے حرم شریف میں ہی ڈیرہ ڈال لیا۔ کتنی بار یوں ہوا کہ سیڑھیوں پہ بیٹھی میرے ساتھ باتیں کرتی وہ یکبارگی کھڑی ہو جاتی اور "میں ابھی آئی۔۔۔" کہہ کر ہجوم میں غائب ہو جاتی۔ یوں جیسے اسے بلاوا آیا ہو۔ پندرہ بیس منٹ بعد لوٹ کر بتاتی کہ بیت اللہ کا طواف کر کے حجرِ اسود کو بوسہ بھی دے آئی ہے۔

دوبئی واپس لوٹے شاید اگلا روز تھا کہ عدیل آ گیا۔ ماں بیٹا گلے لگ کر روئے۔ وہ اس کا منہ چومتی رہی اور ہم سب بھیگی آنکھوں انہیں دیکھتے رہے۔ اسے جیسے سکون آ گیا کہ اس کی

دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ لیکن چند روز چکر لگانے کے بعد عدیل پھر رفو چکر ہو گیا۔ اور وہ علاج سے لاتعلق ہو کر پھر گلیاں کھوجنے لگی۔ یہیں سے میرے اور اس کے اختلافات بلکہ جھگڑے شروع ہو گئے۔ میں بھی بے پناہ اذیت سے گذر رہا تھا۔ میں اسے کیسے سمجھاتا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسے بے قیمت' بے وقعت کر کے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی جس نے اپنی دنیا الگ بسالی تھی۔ کینسر کے عذابِ مسلسل نے اسے بہت زیادہ توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔

اپریل 2008 میں ہم پاکستان گئے۔ خیال تھا کہ وہیں سے ٹیسٹ کروا کے سپیشلسٹ ڈاکٹروں سے مشورہ اور طریقہ علاج کا موازنہ بھی کیا جائے۔ اور اگر وہاں سے امید افزا اشارہ ملے تو ہر تین چار ماہ بعد ان سے بھی رائے لے لیا کریں۔ شوکت خانم ہسپتال میں کچھ عطیات جمع کروا ئے اور مارکر ٹیسٹ کروانے رجسٹریشن آفس پہنچے تو بتایا گیا کہ " ٹیسٹ کِٹ " آوٹ آف سٹاک ہے۔ آغا خان ہسپتال کراچی میں' سامپل کوریئر' کریں ہفتہ بھر میں رپورٹ آ جائے گی۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی کہ کس غرور سے ہم وہاں مشاورت کے لئے آئے تھے؟ بہر کیف ان کے مشورے پر عمل کرنا ہی پڑا۔ اسی دوران قذافی سٹیڈیم کے پاس ایک کینسر سپیشلسٹ لیڈی ڈاکٹر کا پتہ چلا۔ اپائنٹمنٹ لی اور پھر دو دن ہم کلینک میں ان کی زیارت کا انتظار ہی کرتے رہے وہ نہیں آئیں۔ اندازہ ہو گیا کہ پاکستان میں باقاعدگی سے علاج کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ آغا خان سے رپورٹ آ گئی کہ کینسر مارکر بہت بڑھ گیا ہے۔ کولہے کا درد بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ واپس لوٹ آئے۔ ڈاکٹر کافی عرصہ سے ریڈیو تھراپی کو التوا میں ڈال رہا تھا۔ اب چارہ نہ رہا تو اس نے ہمیں تختۂ دار پہ چڑھا دیا۔ ان شعاعوں کے کارنامے ہم ہیروشیما' ناگاساکی کے قصوں میں پڑھ سن چکے تھے اب آنکھوں بھی دیکھ لیا۔ وارڈ میں داخل ہوئے تو اتنی خاموشی' کہ بولنے سے اس کے بکھر جانے کا ڈر لگا۔ بمشکل دو منٹ کا مختصر سا سیشن تھا لیکن اگلے دنوں میں کمر و پیٹ سے گوشت جھلس کر یوں پھٹ گیا

کہ بیٹی کو بھی متاثرہ حصے پر مرہم لگانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ یہ کام مجھے ہی کرنے پڑے۔ اللہ کا شکر ہے عدیل ان دنوں آتا رہا اور عصمی کے زخم دھیرے دھیرے مندمل ہو گئے۔

وہ ٹھیک سے اپنے پاؤں پہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تو ریڈیو تھراپی کو ذہن سے دھو ڈالنے کے لئے بوبی نے آپ ہی آپ ویزے لگوائے اور اس بار ہمیں ایران کی زیارات پہ لے چلا۔ حسبِ سابق احتشام اور عدیل بوجہ ملازمت اس بار بھی ساتھ نہیں جا سکے۔ ہم دوبئی سے اُڑے اور مشہد میں اترے۔ میں نے اس شہر مقدسہ کو جولائی 1970 میں دیکھا تھا اور اب جولائی 2008 تھا۔ تب رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی میرے ذہن میں پرانے دل پذیر خدوخال نقش تھے لیکن اب جو دیکھا تو نئے دور سے میری شناسائی ہی نہ تھی۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ گلی کوچے، سرائے' قہوہ خانے گم گشتہ ہو چکے تھے۔ تب روضۂ مبارک آنکھ کی پتلی میں سما جاتا تھا اور اب سوچ کے احاطے سے بھی اتنا آگے پھیل گیا تھا کہ سہ پہر داخل ہوئے تو واپسی پر ایک ہی جیسے دالانوں میں کھوئے گھنٹوں بعد ملے۔ اطراف میں بے پناہ تبدیلیوں کے باوجود حجرۂ ضریح کا سائز اب بھی وہی ہے۔ اس پہ ستم یہ کہ اسے زنانہ اور مردانہ حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے چنانچہ جالیوں تک رسائی کے لئے جنون بھی درکار ہے۔ بے پناہ دھکم پیل کے سبب عصمی اور بیٹی' ثمرین جالیوں تک نہ پہنچ پائیں۔ چوکھٹ پہ بیٹھی وہ مولا سے فریاد ہی کرتی رہی کہ اس نے حجرِ اسود کو تو بار بار بوسہ دے لیا لیکن یہاں اسے موقع کیوں نہیں دیا؟ شاید کینسر نے اس کے جسم و جاں سے توانائی چاٹ لی تھی۔

تہران پہنچے۔ شام کھانے کے لئے نکلے۔ لال مرچ کے ذائقے نے اتنا خوار کیا کہ کوئی آدھ درجن ریسٹورنٹ کے ایک دروازے سے داخل ہوئے اور دوسرے سے نکلے۔ بالآخر ایک انڈین ریسٹورنٹ کے 'چلو کباب اور تکے' جیسے تیسے حلق سے اتارے اور بل دے کر باہر نکلے تو بوبی نے ساری ایرانی کرنسی میری جیب میں ٹھونس دی کہ جہاں ایک وقت کھانے کا بل تقریباً "ڈیڑھ ملین ریال ہو وہاں وہ حساب کتاب میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ واپس

اپنے ہوٹل پہنچے تو اگلی صبح قم شریف کے لئے ٹیکسی کا بندوبست کیا۔ دورانِ سفر سوچ سوچ کر میں نے فارسی کے دو چار جملے ترتیب دیئے۔ ڈرائیور سے بات چیت شروع کی تو میرے گھر والوں کو بہت حیرت ہوئی لیکن جب اس نے جوابی گرینیڈ پھینکا تو میرا اسلحہ تمام ہو چکا تھا۔ اب عربی' فارسی' اردو' انگریزی کی لشکری ڈھال استعمال کی کہ۔۔۔زبانِ یارِ من ترکی' و من ترکی نمی دانم۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد دوسرا مورچہ بھی خاموش ہو گیا۔ اس دوران' اور باقی سارا راستہ بھی عصمی تقریباً" خاموش ہی رہی۔ اس کی تسبیح کے دانے اپنے مدار میں گھومتے رہے۔ ہم روضہ ہائے گھرانۂ رسول کو جا رہے تھے لہٰذا مزارِ خمینی کے پہلو سے گذر گئے۔ منزل پہ پہنچے تو عصمی کا چہرہ بھی از خود ہی روشن ہونے لگا۔ بیبیوں کے اس آنگن میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ ہر ضریح میں انگلیاں پرو کر اس نے جی کی ڈھیروں باتیں کہہ لیں۔ شاید مشہد والی سرکار کی شکایت بھی کی ہو کہ چوکھٹ پہ بٹھا بٹھا کے بھیج دیا۔ بہر کیف اتنا ہوا کہ جب اس کا جی پوری طرح سیراب ہو گیا اور ہم واپس چلے تو تمازتِ سکون سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ راہ میں مسجدِ جمکران پہ رکے۔ نوافل پڑھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں سے حضرت امام مہدی علیہ السلام پردۂ غائب میں گئے تھے۔ اور میرے پاس اس کی کوئی توجیہہ نہیں ہے کہ آج بھی وہ مسجد برسوں سے میری یادوں میں یوں ثبت ہے کہ میں کھلی آنکھوں اس کی فضا میں سانس لے سکتا ہوں۔ مغرب اور عشا کی نمازیں ہم نے مزارِ خمینی کی مسجد میں ادا کیں۔ کوئی جو بھی فتویٰ صادر کرے میرے دل کو تو وہ نماز بے پناہ بھا گئی۔ دائیں' بائیں اور پشت پہ قبریں' رُو بہ قبلہ' اور سر سجدے میں' اللہ اکبر۔! ہم (تیرے بندے) تیری ہی طرف سے آئے ہیں اور تیری ہی جانب رجوع کرنا ہے۔۔۔

اگلا دن زیاراتِ تہران کے لئے مخصوص تھا۔ ہر جگہ حاضری دی۔ اسی سفاری کے دوران ہم اس علاقے میں سے بھی گذرے جس کی تصاویر میں نے چند روز پہلے اخبارات میں دیکھی تھیں کہ ایران وہاں ایٹمی مسالے تیار کر رہا ہے۔ میں نے مہینوں منگلا ڈیم کی تعمیر دیکھی ہے

اور (مولانا فضل الرحمان سے معذرت کے ساتھ) اگر پاکستان کے تناظر میں بات کروں تو وہاں درجنوں شاول اور ٹرک ایک چوڑی نہر کی کھدائی کر رہے تھے۔ دراصل امریکی مافیا پوری دنیا کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ ہر سرکش کو پاؤں کے انگوٹھے تلے رکھنے کی فکر اسے کھائے جارہی ہے اور اس نے دنیا بھر' بالخصوص خود امریکنوں کو اس ذہنی خلجان میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ایران پورے کرہ ارض کو تباہ کر دینے والے ہتھیار بنارہا ہے۔ بات صرف تیل سے بھرے اس پیالے کی ہے جو اس دھرتی کی کوکھ میں ہے۔ آج ایران وہ پیالہ امریکہ کے منہ کو لگادے تو امریکن بگل کی تان چہار سو "ایران امریکہ بھائی بھائی" بکھیرنے لگے گی۔ لیکن ایرانی بلحاظ مزاج' ناپسندیدہ حد تک اکھڑ قوم ہے۔ اگر انہوں نے ایک بار کہہ دیا کہ مرغے کی ایک ٹانگ ہوتی ہے تو دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مرغے کی بس ایک ہی ٹانگ رہے گی۔ اپنے دعوے کو درست ثابت کرنے کے لئے بھلے ہی وہ ایک ٹانگ آپ کی آنکھوں کے سامنے کاٹ کر الگ کر دیں۔ چنانچہ امریکہ' اس کے حواریوں اور ان کی لگائی تمام پابندیوں کو وہ "ٹھینگے پہ" رکھتے ہیں۔ کھاتے ہیں' پیتے ہیں اور گہری نیند سوتے ہیں۔ ان کے لئے امریکہ شاید نظامِ شمسی سے باہر کا کوئی سیارچہ ہے جس کی انہیں دھیلہ دمڑی برابر بھی پرواہ نہیں۔

اب ان زیارات کے بعد عصمی کا ایک بار پاکستان جانا تو بنتا ہی تھا اس لئے نہیں کہ اس نے کوئی بہت بڑا معرکہ مارا تھا بلکہ جن رشتہ داروں نے وہاں اسے 'بیچاری' کہنا' اور بیتی بسری بات سمجھنا شروع کر دیا تھا وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ کینسر سے اس کی جنگ جاری ہے اور وہ اس موذی مرض سے ہاری نہیں۔ پتہ نہیں کیسے' اس نے اپنے وجود' اپنی ہستی کے ذرے ذرے سے ساری توانائی اپنے ارادوں میں نچوڑ ڈالی اور جب وہ ان کے سامنے گئی تو ہر کوئی اپنے قیافوں کے ٹوٹ جانے پر حیران تھا۔ رشتوں کے معاملہ میں اس بار بھی ہم ناکام ہی رہے۔ عزیز و اقارب میں سے کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے کو تیار نہ تھا کیونکہ ہر ایک کسی نہ کسی

شادی میں ملوث ہو کر اپنی عاقبت خراب کر چکا تھا۔ ہر ایجنٹ کی ایڈوانس فیس پانچ ہزار اور پھر ان کا' نیٹ ورک'۔ آپ آگے بک جاتے ہیں۔ نیلم بلاک اقبال ٹاؤن میں ایک محترمہ ہیں انہوں نے اپنی فیس لینے کے بعد ہم سے پاکستان میں ہماری غیر منقولہ جائیداد کی مصدقہ دستاویزات طلب کیں۔ معاشرے میں ایسی تبدیلی کی ہمیں کوئی خبر ہی نہ تھی۔ کئی بار محترم مستنصر حسین تارڑ سے ملاقات کی کوشش کی کہ میرے بچوں کے لئے بھی کوئی "پیار کا چھوٹا سا گھر" بسا دیں۔ درجنوں بار "جیو" کے آفس گیا۔ 'جنگ" اخبار میں اشتہارات وہیں سے دیتا رہا۔ لیکن انہوں نے شاید اپنا ایوان پیرس میں ہی بسا رکھا ہے۔ ملنا نہیں ہو پایا اور میری اتنی پرواز نہیں ہے۔

واپس لوٹے چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک شام عدیُل اپنا سامان اٹھائے گھر آن پہنچا۔ خدا جانے بیوی سے لڑ کر آیا تھا۔ صبح آفس جاتا پھر سیدھا گھر لوٹتا تو گھر پہ جیسے جھلملاتی ابرق برسنے لگتی۔ پہاڑوں پہ جھکتی چھوٹی چھوٹی بدلیوں کی طرح سکون ہمارے احساس کو جھولنا جھلا دیتا۔ ہر گوشے سے کھکھلاہٹیں پھوٹنے لگتیں۔ ماں بے حد خوش کہ اس کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ ہم خاموشی سے ڈرامہ دیکھتے رہے۔ دس بارہ دن گذُرے تھے کہ وہ سامان اٹھا کر پھر چلتا بنا۔ اس بار سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عصمی کا بھرم ٹوٹ گیا۔ دل میں ڈھیروں دھند اتر آئی کہ اس کا پیار کسی کو باندھ نہیں سکتا اور اللہ میاں بھی اب اس کی دعا نہیں سنتا' مانتا' قبول کرتا۔ اس مایوسی نے بیماری کے خلاف اس کی روحانی وجسمانی مزاحمت کو یوں مفلوج کیا کہ کینسر مار کر جو دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا اب یکبارگی اوپر جانے لگا۔ کچھ روز بعد وہ پھر آیا۔ ہمارے گھر قریب فلیٹ لینے کے لئے اسے میری مدد درکار تھی۔ میں نے سوچا یوں اس کا آنا جانا لگا رہے گا چنانچہ اس کا فائدہ اٹھایا۔ ایک دوپہر توام ہسپتال العین میں اس کا ٹیلیفون ملا کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔ عصمی کو بیڈ پر انجکشن دیا جا رہا تھا۔ اسے کسی جذباتی ہیجان میں ڈالنا مناسب نہ تھا لہٰذا میں نے بیٹی کو اعتماد میں لیا۔ شام کو اسے گھر چھوڑ ماں بیٹی کے

لئے تمام اشیائے ضرورت کی شاپنگ کی۔ اور انہیں ملنے ہسپتال جا پہنچے۔ دونوں میاں بیوی کو سمجھایا کہ اللہ نے موقع دیا ہے تو اس کا فائدہ اٹھائیں اور گھر میں رچ بس جائیں۔ شاید تیسری یا چوتھی شام تھی جب عدیل بانہوں میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی اٹھائے آیا اور ماں کے آگے بڑھا دی۔

"ماں! یہ آپ کے لئے لایا ہوں۔۔۔!!"

عصمی کے سوا سب کو معلوم تھا کیا ہو رہا ہے۔ اس نے بلا سوچے سمجھے ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا تو جانا کہ وہ اک ننھی بچی ہے۔ کتنے ہی لمحے وہ حیرت سے اک نگاہ اسے دیکھتی اور پھر باری باری ہم سب کو' جو سبھی آبدیدہ تھے۔ تب اسے ہم سب کی ملی بھگت سمجھ آ گئی۔ اس نے ایک طویل سانس لیا بچی کو چوما اور سینے سے لگا کر عدیل سے بولی۔

"اب تم جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔۔۔"

مجھے یقین ہے کہ عصمی نے چاہا ہو گا عدیل کی جگہ وہ تحفہ اس کی بیوی لاتی۔ جہاں پوتی ایک ہی پل میں سینے میں کھب گئی وہیں اس کی ماں بھی قبول ہو جاتی۔ لیکن وہ عورت بھی یکتائے عنوان ہے۔ اس نے گھر کے آنگن میں آتے آتے بہت دیر کر دی۔

2009 ڈھل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ادویات کے ناگوار اثرات بھی عصمی کے مزاج میں گھل مل گئے تھے۔ چہرے پہ سوجن اور کچھ خمیرا پن سا آ گیا۔ بوبی اپنے طور اس میں جینے کی امنگ جگا رہا تھا۔ اس بار اس نے زیاراتِ "شام" کا نسخہ چلایا۔ ثمرین کو بھی ساتھ لے لیا۔ نواسیٔ رسول حضرت بی بی زینب علیہ السلام کے روضہ کے بالکل قریب 'سفیر' ہوٹل میں ٹھہرے۔ بالکنی میں سے دائیں ہاتھ گنبدِ روضہ اور مینار نظر آ رہا تھا اور سامنے نیچے پھیلا وہ باغ تھا جہاں بی بی کو قید میں رکھا گیا اور وہیں ان کی شہادت ہوئی۔ باغ اور ہوٹل کے بیچ سڑک پر حدِ نظر تک رنگارنگ بازار لگا تھا۔ میں زمان و مکاں کا طالب علم ہوں۔ اجڑی بستیوں' آثارِ قدیمہ کو انہی کے ادوار میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ان لوگوں سے تعلق قائم کر کے

میری روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ خدا جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے یہ شہر آج بھی اپنی ہیئیت و حیثیت کو اسی طرح سمیٹے وقت کے ساتھ چل رہا ہے۔ ایرپورٹ سے ہوٹل تک سفر دوران بھی میں نے محسوس کیا کہ اس شہر کی مٹی میں آج بھی قرونِ وسطیٰ کے سارے ادوار ایک دوسرے میں گندھے پڑے ہیں۔ روضہ مبارک پہ تعظیم پیش کرنے کے لئے نکلے تو تنگ سی ٹوٹی پھوٹی سڑک دیکھ کر لگا یہ ضرور کسی لٹے پٹے قافلے کی گذرگاہ رہی ہو گی۔ ڈیوڑھی سے باہر رک کر حاضری کی اجازت لی۔ دالان میں پہنچے تو پرانی طرز کے بڑے سے گھر کا آنگن لگا۔ ہر طرف سادگی۔ پاکستان و بھارت میں بیشتر بزرگانِ دین کے مزار و مقابر کا تزک و احتشام اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں صرف ایک گنبد و مینار ہے جو راہِ حق کی علامت ہے۔ اور اس سبز گنبد تلے گھرانۂ رسول کی وہ عظیم بی بی مدفون ہیں جن کے خطبات نے گنگ "شہادتِ" اور "رُوحِ اسلام" کو معنون کیا ہے۔ جو بھی عالم ہے وہ حضور ﷺ مدینۃ العلم کے اسی گھر کی چوکھٹ سے علم کی خیرات لے کر اٹھا ہے۔ اور ان کی عظمت سے منکر نہیں ہے۔

عصمی کی وھیل چیئر کو ثمرین زنانہ حصہ میں دھکیل لے گئی۔ بوبی اور میں اذنِ زیارت لے کر مردانہ میں چلے گئے۔ ایرانی زیارات کے مقابلہ اندرِ ضریح اور فانوس کے سوا وہی سادگی' وہی غریب الوطنی کا احساس تھا۔ بوقتِ نماز سب کا رخ قبلہ کی طرف ہو گیا۔ اللہ اکبر اور سر بسجود۔ فارغ ہو کر دالان میں منتظر تھے کہ عصمی نے رکنے کا پیغام بھیجا۔ پتہ چلا اس کی وھیل چیئر کو ضریح کے بالکل پہلو میں جگہ دی گئی تھی۔ پتہ نہیں کیسے ہوا کہ کچھ عورتیں پاس آئیں' اس کا ہاتھ چوما اور کہا کہ "آپ سیدزادی ہیں۔ ہمارے لئے دعا کریں۔۔" اس نے سب کے لئے دعا کی۔ کچھ پل میں روضہ مبارک کا منتظمِ اعلیٰ یسین آگیا اور بتایا کہ مرکزی روشنیاں بجھنے تک انتظار کریں تو وہ زیارتِ مخصوص کا انتظام کر دے گا۔ یہ غیر متوقع بلاوا اک بہت بڑا اعزاز تھا چنانچہ ہم رک گئے۔ پھر جیسے یہی لگا کہ دریا کنارے بٹھا کر ہمیں کہہ دیا گیا جی بھر کے سیراب ہو لو۔ دل کی کہہ لو' سن لو۔ ہم نے کیا مانگا' کیا ملا؟ اس کی خبر نہیں بس یہ جانتا

ہوں کہ ضریح سے الگ ہوئے توروح واقعی مخمور ہو چکی تھی اور چلے تو ہاتھوں میں وہ تبرکات تھے جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوں۔ حرم سے نکلے تو ارد گرد تین اطراف پھیلے بازاروں میں گھومے۔ روضے کے کتنے ہی دروازے ہیں اور ہر ایک کے سامنے' ہر شب ایک میلہ سالگ جاتا ہے۔ پھیری والے' مستقل دوکانوں والے اور ان کے علاوہ بلدیہ کے چھاپہ مار۔ صدیوں پہلے بھی گھرانۂ رسول کے ہر دروازے پہ' ہر صدا دینے والے کو رزق ملتا تھا اور آج بھی وہی روایت قائم ہے۔ اس در سے کوئی خالی نہیں جاتا۔

اگلی صبح مسجدِ امیہ' اس کے گرد و نواح میں پھیلی زیارات اور قبرستانِ شہدا کے لئے چلے۔ مسجد کا داخلی دروازہ وہ تھا جس کے سامنے صعوبتوں سے چور قافلۂ کربلا کو رات بھر بھوکے پیاسے روکے رکھا گیا تھا کہ اگلی صبح انہیں دربارِ یزید میں پیش کیا جانا تھا۔ بالکل سامنے بازارِ شام آج بھی اسی ہیئت میں قائم ہے۔ وہی کھڑکیاں' وہی جھروکے جن سے پتھر برسے تھے۔ مسجد کے وسیع و عریض دالان میں ٹمپل سے چرچ اور پھر مسجد تک کتنے ہی ادوار کی کہانیاں و کردار سو رہے ہیں۔ جنوبی جانب مسجد کا غیر روایتی طویل ہال ہے۔ حضرت یحیی ابنِ زکریا کا سر اقدس یہیں دفن ہے۔ بیشتر وقت یہودی اور عیسائی ان کی ضریح سے لپٹے نظر آتے ہیں۔ چند قدم دور حضرت ہود کا (بند) کنواں اور بڑا سا پتھریلا پیالہ ہے جس میں وہ طہارت و عبادت کے لئے پانی جمع رکھتے تھے اور یزید اسے شراب نوشی کے لئے استعمال کرتا رہا۔ مرکزی محراب کے بالمقابل اوپر ایک بالکنی اس کا شاہی جھروکا تھی وہیں سے اس نے اپنی فتح کا جشن منانے کے لئے کربلا سے لٹے اجڑے قیدیوں کا دربار سجایا تھا۔ اور نیچے منبر کے پاس کھڑی حضرت بی بی زینب نے وہ تاریخی خطبہ دیا تھا جو کل' آج اور ہمیشہ شجاعت و جرأت کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کا بھی انمول اثاثہ ہے۔ اس کلام نے نہ صرف حق و باطل کی تفریق کی بلکہ شہادتوں کو امر اور معرکۂ کربلا کو ایسے سماوی معنی دے دیئے کہ اس کی تابندگی تا قیامت قائم و دائم رہے گی۔

مسجد کے جنوب مغربی کونے میں مینارِ عیسیٰ تلے مکتبِ یزید آج بھی برقرار ہے۔ تصدیق کرنے کے لئے میں نے ایک فلسطینی سے پوچھا تو اسے بہت برا لگا۔ جی چاہا اسے کہوں۔ "کب تک اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید سے چمٹے رہو گے؟ راہِ حق کی تلاش میں کچھ تحقیق اپنی عقل سے بھی کر لو۔ منزلیں آسان ہو جائیں گی ورنہ ابو جہل ہی کہلاؤ گے۔۔۔" لیکن وہ چہرے کے ناگوار زاویے بناتا' زیرِ لب بدبداتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

مشرقی برآمدے کے پیچھے "راس الحسین" ایک طاقچہ ہے جہاں حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر اقدس اک عرصہ رکھا گیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مسجد کے دورانِ تعمیر مزدوروں کو حضرت یحییٰ ابنِ زکریا کا سر اقدس ملا تو 'ولید اول' نے احترام سے مسجد کے ہال میں دفن کروا دیا اور وہیں تاریخِ اسلام کی بدترین مثال عہدِ یزید بھی ہے جس نے اپنے ہی رسول کا گھرانہ اجاڑ دیا۔ نواسۂ رسول کے سر اقدس' اور ملحقہ زندان میں ان کے فرزند زین العابدین کی نمائش کی۔ معصوم بچوں کو سنگلاخ قید خانوں میں دم کش کیا۔ یہاں اتنی زیارات اور اتنی حکایات ہیں کہ آدمی کی روح شرمسار ہو کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ پرانے دمشق کے گلی کوچوں میں قبروں کے کتبے پڑھتا چلوں' یا تختیوں پہ لکھے تاریخی کوائف یوں سناؤں کہ۔۔۔یہ وہ جگہ ہے جہاں اک عرصہ سولہ شہدائے کربلا کے سر بغرضِ نمائش رکھے گئے تھے۔ صرف اس پاداش میں کہ انہوں نے بد اور بدی کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا۔۔۔ خود نشانِ عبرت ہو گئے مٹانے والے وہ۔

زیارات ہو گئیں بلکہ تین ماہ بعد احتشام ایک بار پھر ماں کو دمشق لے گیا کہ اسے بی بی زینب کے روضے پہ بے پناہ سکون و راحت ملی تھی۔ لیکن فنا کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ چنانچہ ہر جگہ دعائیں مانگنے کے باوجود اس کا کینسر مارکر (نارمل: 30 سے کم) بڑھتے بڑھتے 345 تک جا پہنچا۔ اور پھر ستمبر 2009 میں ہارمونل طریقہ علاج کی ناکامی کا

اعلان ہو گیا۔ ان ادویات کا اثر ختم ہونے کے لئے ایک وقفہ دے دیا گیا۔ اب صرف "کیمو تھراپی" ہی آخری راستہ رہ گئی تھی۔

اور پھر گیارہ جنوری 2010 اسے "کیمو" کے عنوان سے وہ زہریلا انجکشن دے دیا گیا۔ دل سہمے' دہلے ہوئے اور احساس بے پناہ تھکا تھکا سا تھا۔ اس بار ہمیں معلوم تھا آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس رات میرے پاس تسلی دینے کے لئے فقط جھوٹ تھا اور وہ اتنی ذہین اور معاملہ فہم ضرور تھی کہ میرا بھرم رکھنے کے لئے خاموشی سے جلد سو گئی۔ مجھے بہت دیر نیند نہیں آئی۔ اذیت کے کتنے ہی سوتوں کے منہ کھل گئے تھے۔ نسائیت کی نمو عورت کے سینہ اور سر کے بالوں میں ہوتی ہے۔ سینہ ' جو زمانوں پہ محیط' نوعِ انسانی کو بعنوانِ ممتا سینچتا' آبیاری کرتا' حیاتِ جاوداں بدیتا آیا ہے اور بال جو اسی ممتا کا اعزاز و غرور ہیں کہ انہی کی چھاؤں میں اس نے تصویرِ کائینات میں پیار کے رنگ بھرے ہیں۔ چنانچہ جب کسی کی کینسر زدہ چھاتی کاٹ الگ کر دی جاتی ہے یا اس کے بال تلف ہو جائیں تو اس نامکمل' کچلی ہوئی عورت کی روح تک آبلہ دار ہو جاتی ہے۔ میں نے بارہا ایسی کھوکھلی دیمک زدہ زندگی کو کراہتے' بلبلاتے دیکھا ہے۔ اور میں سچ مچ خوفزدہ تھا کہ اپنے سامنے پھیلی آنکھوں میں گنگ سوالوں کا سامنا کیسے کروں گا؟

سحر تک جاگنے کی وجہ سے میری آنکھ دیر سے کھلی۔ اس کے کمرے میں گیا تو وہ پر سکون اور معمول کے مطابق ثمرین کے ساتھ گھریلو افکار میں مصروف تھی کہ علاج میں اب جو وقفہ ہو گا تو وہ ایک بار پھر رشتوں کی تلاش میں پاکستان جائے گی۔ اور انشاءاللہ کامیاب لوٹے گی۔ اس کے تکیئے پر ڈھیروں سیاہ لکیریں چمٹی تھیں اور جتنی بار اس نے سر کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں اک نگاہ ان کالے تاروں کو دیکھا اور فرش پہ جھاڑ دیا۔ کوئی شکوہ' نہ شکایت۔۔۔ کتنے ہی دن' صبح شام یونہی چپ چاپ آئے اور نکل گئے۔ اس کے معمولاتِ زندگی بھی چاک و چوبند رہے تو مجھے وہ میرے اندیشوں سے بہت بالاتر' بہت مضبوط لگی پھر

بھی میں ڈراڈرا آئینوں کی شکستگی کا انتظار کرتا رہا۔ کیونکہ بال کم ہوتے ہوتے سر کی جلد جگہ جگہ جھانکنے لگی تھی۔ ایک صبح گھر میں مکمل سکوت پا کر مجھے لگا شاید وہ ابھی تک سو رہی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا وہ ثمرین کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہے۔ اس کی جولانی طبع پہ حیرت ہوئی۔ پھر سوچا شاید نئے انجکشن کی انرجی نے اسے کچھ عجوبہ کام کے لئے اکسایا ہو۔ اور جب وہ واپس لوٹی تو وہ واقعی ایسا کام کر آئی تھی جس کا حوصلہ لاکھوں میں ایک کسی عورت میں ہو گا۔ وہ سر منڈا آئی تھی۔ پتہ چلا آنکھ کھلنے پر اس نے روزانہ سے کہیں زیادہ بال تکیئے پر بکھرے دیکھے تو کچھ صدمہ ضرور پہنچا۔ لیکن اس بار کھیل کھیلنے والے کی رضا کو ہنس کر جھیل جانے پہ دل چاہا۔ بیوٹی پارلر والوں کو تو وہ تحیر زدہ چھوڑ آئی تھی کہ اس کے ساتھ مل کر ہنسیں یا بالوں کا پرسہ دیں؟ لیکن ہسپتال میں ڈاکٹر نے اسے جرأت و حوصلے کی مثال بنا دیا۔ کیموتھراپی کی دہلیز پہ کھڑی کتنی ہی لڑکیوں کو اس نے عصمی سے ملوایا کہ ایسے مثبت رویوں سے زندگی کو سجانا چاہیئے۔ میں نے سوچا شمع کی لو اگرچہ لڑکھڑا رہی ہو تو بھی دوسروں کے لئے اجالا ضرور بکھیر جاتی ہے۔

جون 2010 تک اس کی صحت کچھ سنبھلنی شروع ہو گئی۔ گھنے' دودھیا سفید' اور بے حد چمکدار بال نکل آئے تھے جو اس کے گورے رنگ اور شخصیت کے ساتھ بہت خوبصورت میل کھاتے تھے۔ درجنوں ہی ایسے واقعات ہوئے کہ لوگ اسے روسی یا یورپی خاتون سمجھے۔ ہم گھر والوں نے تو ان سے بھی بڑا دھوکا کھایا۔ جانا کہ وہ اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ اس بار احتشام اسے عمرہ کروانے لے گیا۔ وہاں سے لوٹی تو ستمبر میں کیمو کا پہلا دور مکمل ہو گیا۔ 20 تاریخ کو کینسر مارکر پہلی بار 21.5 پہ جا ڈھلا تو نئے جوش و خروش کے ساتھ رشتوں کی تلاش میں پاکستان نکل گئی۔ وسط اگلے سال تک چار مرتبہ جانا آنا ہوا۔ کوئٹہ میں ایک بہت باعزت فیملی ہے۔ ماں' بیٹے اور دو بیٹیاں' سبھی ڈاکٹر۔ انہوں نے دونوں ہمیں دے دیں لیکن آدم و حوا کی نسبت آسمانوں پہ ٹھہری تھی اور آج بھی جوڑیاں آسمانوں پر بننے کی روایت قائم ہے چنانچہ

لاکھ چاہنے کے باوجود ہم اس لکھے کو بدل نہیں سکے۔ جنوری 2011 میں بیٹی کے لئے ایک رشتہ ملا۔ صاحب بہاولپور میں ڈاکٹر تھے۔ پہلی ہی نظر میں ہم لوگ اک دوسرے کو بھا گئے۔ بس پسندیدگی کے پیمانے فرق تھے۔ ہم نے قدبت' شکل صورت کے علاوہ کھانے پہ سامنے بٹھا کر ان کی ذاتی شخصیت جانچی۔ انہوں نے فرمایا۔ " لندن میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مجھے داخلہ مل چکا ہے۔ بیوی کو ماں اور بہن کے پاس گاؤں چھوڑ کر 'سپیشلائز کرنے جانا چاہتا ہوں' یا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شادی واپس لوٹ کر ہی کروں۔ بس خواہش ہے کہ کوئی میری معاشی سرپرستی کر دے۔۔۔" میں نے اباؤٹرن کیا اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بیٹی نے پاکستان میں شادی سے انکار کر دیا کہ کوئی ویزوں کی اور کوئی پیسہ' بنگلہ' گاڑی کی سپانسر شپ مانگتا ہے۔ "بجلی پانی وہاں نہیں' جان و مال محفوظ نہیں اور پھر گاؤں کے چولہے چوکی میں تعلیم ضائع کرنی ہے۔" اس نے کہا۔ "دوبئی ہی میں کوئی رشتہ دیکھ لیں جسے محنت کر کے باعزت کمانے کا چلن آتا ہو۔۔۔"

رشتوں کی داستان سنا سنا کر میں خود تھک گیا ہوں۔ لیکن دیارِ غیر میں رہنے والے ہم پاکستانیوں کا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی مٹی سے رشتہ نہیں توڑ پاتے اور ادھر لوگ سید شیعہ کی چکر دھارا میں پھنسے رہتے ہیں اللہ میاں کو کوئی نہیں پوچھتا کہ اس نے روحوں کی کھیپ اِدھر اُدھر ان گھروں میں کیوں پیدا کی؟ بہر کیف انہوں نے اپنی خو چھوڑی نہ میں نے جھوٹ بولا۔ 'سیّد شیعہ " سنتے ہی ٹیلیفون پٹخ کر وہ معدوم ہو جاتے۔ اور ایک بار پھر ہم ناکام ہو گئے۔ لیکن اس بار ایک بہت بڑا اچنبھا' عجوبہ ہو گیا۔ رشتے خود ہمیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے ایک رشتہ شارجہ ہی سے بیٹی کے لئے آیا تھا۔ عصمی نے ایک محفلِ میلاد میں شرکت کی۔ وہیں کراچی کی محترمہ ایم کیو ایم سے ملاقات ہوئی۔ ان کا بیٹا شارجہ ایکسپو میں ثمرین کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ چنانچہ میلاد گذرے چند روز ہوئے تھے کہ وہ ہمارے گھر "رشتہ ڈالنے " آ گئیں۔ دوسرا رشتہ ریاض حسین مرحوم کی بیٹی' اور ڈھوڈووال سیالکوٹ

میں "سریابی بی" کے پیر گھرانے کی بہو۔ "سفینہ ہما" عرف "بے بی صاحب" لائی تھی۔ یہ
یالکوٹ ہی کے ایک اور پیر گھرانے کی بیٹی تھیں اور رشتہ بوبی کے لئے تھا۔
عصمی اور میں' یا بچے ان دونوں گھروں سے متعارف نہ تھے۔ اب انہیں سیاق و سباق سے جاننا
تھا۔

7
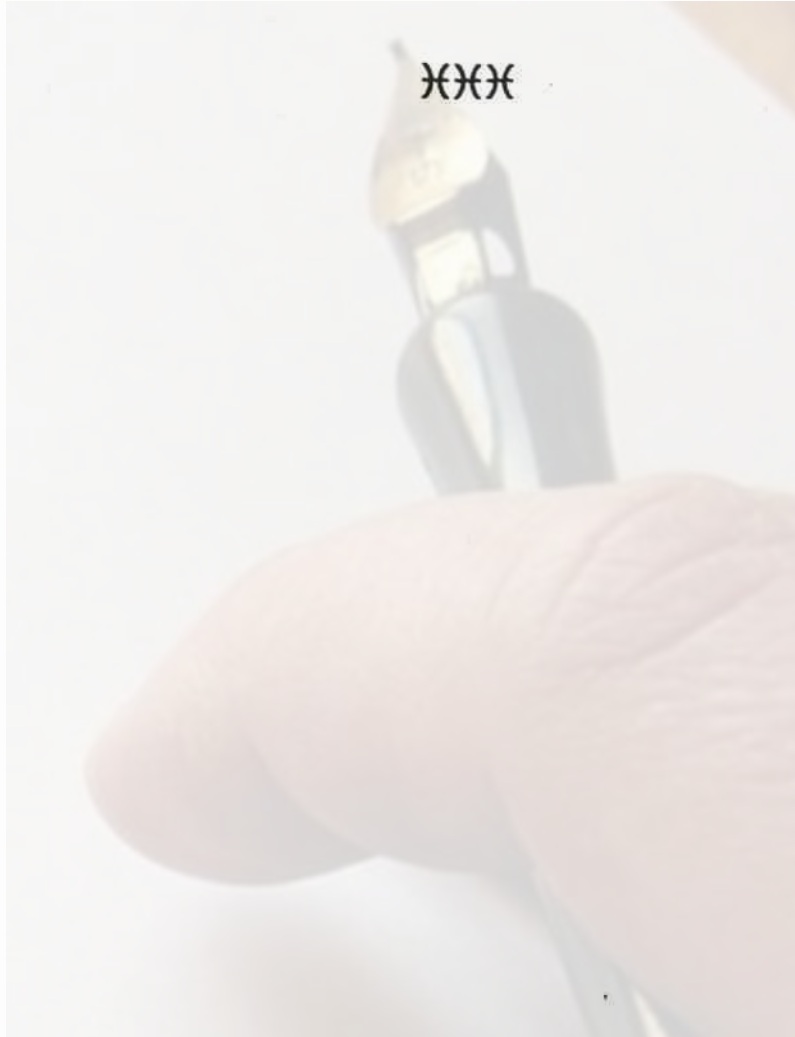
عصمی کا یوں تو عرب' ایرانی' افغانی' بھارتی' پاکستانی اور اردو بولنے والی عورتوں سے ملنا جلنا رہتا تھا لیکن اسے ان لوگوں سے سخت چڑ تھی جو اپنے آپ کو "مہاجر" کہتے ہیں۔

"دہائی خدا کی۔ چونسٹھ' پینسٹھ سال پہلے ان کے باپ دادا انڈیا سے پاکستان آئے۔ اب ان کی پچھلی نسلیں وقت کی تہوں میں تقریباً" معدوم ہو چکی ہیں۔ آگے ان کی دوسری اور تیسری نسل پاکستان کو کھا پی کے' اسی مٹی کا حصہ بن رہے ہیں۔ اس کے باوجود اپنی تشخیص "مہاجر" کے طور کرتے ہیں۔ تقسیم کے وقت یہاں سے بھی تو لاکھوں لوگ انڈیا منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں تو مہاجر نسل نہیں پھوٹی؟ اور ان کی نسلیں بدل جانے کے بعد' یہ کس قانون اور نظامِ حیات سے اب بھی مہاجر رہ گئے؟ امریکہ' برطانیہ' کینیڈا کی شہریت حاصل کرنے کے لئے کشکول لئے پھرتے ہیں لیکن بن مانگے پاکستانی پاسپورٹ پا کر بھی اپنے آپ کو پاکستانی مانتے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ خود ترسی کے شکار یہ مہاجر'ہندوستان کے مفاد میں فتنہ فساد پیدا کرنے والے بھتہ خور ایجنٹوں نے خوف سے پیدا کئے ہیں۔ انہیں جتنا چاہے دودھ پلاتے رہو یہ کبھی سگے نہیں بنیں گے۔۔۔"

میرے سسر "شاہ جی" نے خود اپنے گھر کے ارد گرد مندر کی زمینوں پر انہی "تب مہاجروں" کے پچاسوں گھروں کو بسایا تھا۔ آج کے پیمانے پر اس وقت تمام مہاجروں کے بیچ میں وہاں صرف ایک ہی پاکستانی گھر تھا۔ اور عصمی اسی ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ان کا اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا' رہن سہن اور اچھی بری ساری باتیں پوری طرح جانتی تھی۔ اور

تبھی سے اسے پان کھا کھا کر دانت زنگ خوردہ کرنے والی' چیڑ چیڑ بولنے والی' اور ہفتہ دس دن کے بچے کھچے باسی سالنوں کو ابلے چاولوں میں ' طاہیری' کے عنوان سے ملغوبہ بنانے والی عورتیں سخت ناپسند تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کے دروازے پہ کوئی سائل آجائے تو ان کے پاس دینے کو کچھ ہوگا ہی نہیں' کھانے کی بجائے یہ اس کے جھولے میں حدیثیں اور آیات ڈالتی ہیں اور ان کا اطلاق صرف سامنے والے پر ہی ہوتا ہے۔ یعنی پنجابیوں کے لحاظ سے "میٹھا میٹھا ہم ہم' کوڑا کوڑا تھو تھو۔۔۔" تقسیم کے بعد بھارت سے شاہ جی کے کتنے ہی ہندو سکھ دوست اک عرصہ تک پاکستان آتے' اور ان کے گھر پہ ٹھہرتے رہے۔ وہ سب اس کے "چاچاجی" تھے کیونکہ پنجاب کی تہذیب یہی تھی کہ گلی محلے کا ہر بزرگ مرد باپ کا بھائی یعنی چاچا ہے اور ہر عورت ماں کی بہن "ماسی" ہے۔ پھر بانو قدسیہ ' اشفاق احمد اور فاطمہ ثریا بجیا' جو ہیں ہی عصمی کے اپنے' اسی کی طرح کلمہ گو'۔ وہ صرف ایک "ریڈ کلف لائن" پار کرنے سے مہاجر کیسے ہو گئے؟ یہ لوگ تو اپنے اردگرد بکھری اچھائیوں کو چنتے' اپنے اندر سجاتے اور لوگوں میں بے دریغ بانٹتے ہیں' کردار کا میزان بن جاتے ہیں' ہمارے دلوں میں رہتے ہوئے وہ پرائے یا مہاجر کیسے ہوئے؟ 'مہاجر پن' کا فتنہ یوپی' سی پی کے اس مخصوص "قبضہ گروپ" کا شاخسانہ ہے جو وہاں سے صرف اپنے حقوق کا واویلا مچاتے لوٹ مار کرنے آئے تھے۔ کہتے ہیں اردو بولنے والوں کے خلاف امتیازی سلوک ہے۔ ارے پنجابیوں سے زیادہ خوبصورت اردو کون لکھتا اور بولتا ہے؟ تم ہماری طرف سے اردو بولو' پنجابی' پشتو' سندھی' بلوچی یا فارسی' عربی' ترکی زبان بولو۔ بس اتنا بولو۔ "ہم صرف اور صرف پاکستانی ہیں!!" حقوق مانگنے ہیں تو مہاجر نہیں' پاکستانی بنو۔ تم بھی مان لو کہ روم جاؤ تو رومنوں جیسا کرو۔

لیکن میری مت ہی تو ماری گئی تھی کہ گھر کی اتنی بڑی یونیورسٹی کی بات سنی ان سنی کر کے میں ان مہمانوں کے بیچ بیٹھ گیا جو یو اے ای' شارجہ میں چپ چاپ اپنے آپ کو "خارجی" کہلا

لیتے ہیں لیکن کراچی پاکستان میں نسلوں سے رہتے ہوئے اپنے آپ کو مہاجر بتاتے ہیں۔ حالانکہ میرے تایا جان نے اپنی دو بیٹیاں کراچی ہی کے دو مہاجر بھائیوں سے بیاہنے کے بعد آخری دم وصیت کر دی تھی کہ مہاجروں میں کبھی کوئی بیٹی نہ بیاہنا' ورنہ میری طرح روتے رہو گے۔ پر میرے ستاروں کو شاید کوئی سورج گرہن لگا تھا کہ میں نے وہ نصیحت بھی نظر انداز کر دی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ بیٹی کو پڑھاتے پڑھاتے وقت کی طرف ہمارا دھیان ہی نہ رہا تھا۔ اب احساس ہوا تو پتہ چلا بیٹی پینتیسواں سال بھی پار کر چکی ہے۔ یوں تو ایشوریا رائے کی شادی بھی چھتیس برس کی عمر میں ہوئی لیکن مشکل یہ تھی کہ ہم میں اس جیسے گن بالکل نہیں تھے اور مجھے ڈر تھا کہ اب مزید تاخیر کی تو ہم کہیں "بائی پاس" روڈ کی زد میں ہی نہ آجائیں۔ اس لئے سوچا مہمان آ ہی گئے ہیں تو بات سننے میں کیا مضائقہ ہے۔ محترمہ مہاجرہ کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا اور وہ اس کے نام سے ہمارے گھر رشتہ "ڈالنے" آئی تھیں۔ اپنی موومنٹ چلا کر وہ لوگ چلے گئے تو عصمی یکدم سے پھٹ پڑی۔

"چپڑ چپڑ باتیں کرنے والی ایسی عورتوں کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔۔" اسے غصہ تھا کہ ان نام نہاد مہاجروں کو میں نے اتنی دیر برداشت کیوں کیا۔ "یہ اپنے آپ کو اہلِ زبان کہتے ہیں۔۔۔ "رشتہ ڈال دیا ہے۔۔۔" یہ کوئی خط ہے جو لیٹر بکس میں ڈال دیا ہے؟ اردو کا بیڑا غرق کرتے ہیں یہ لوگ۔ ہماری طرح "رشتہ مانگا ہے۔۔" کہتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔۔؟"

"یہ ان کی معاشرتی زبان ہے بھئی!۔" میں نے کہا۔ "شکر کرو اس نے یہ نہیں کہا۔ "میں شمیم کے گھر سے آئی ہوں۔ اس نے بچہ دیا ہے۔۔۔"

"آخ۔۔۔" اس نے کراہت سے آواز نکالی۔ "جیسے شمیم کوئی گائے' بھینس' بکری ہو گئی۔ انڈیا سے آئے اس طبقے کی زبان اردو ضرور ہے لیکن یہ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ وہ تو بہت پیاری اردو بولتے ہیں۔ ان کی صفوں میں اکثریت سے

یوپی' سی پی کے گھسیارے آن بیٹھے ہیں جنہوں نے زبان کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔۔۔" پھر جیسے اسے اپنا ادھورا موضوع یاد آگیا۔ "اور وہ جو اڑتیس سالہ' بیٹھا مٹھی' کھڑا بالشت' بونا ساتھ آیا تھا۔ مجھے بالکل پسند نہیں۔ عمر پر تو میں اعتراض نہیں کرتی لیکن قد شاید پانچ فٹ تین انچ ہو گا؟ اس بونے کو کسی سے کیسے ملاؤں گی کہ یہ ہمارا داماد ہے؟ کوئی پوچھ بیٹھا کہ ساری دنیا میں کیا یہی ملا تھا۔۔ تو؟"

لیکن یہ واقعی میری مجبوری تھی۔ سب بہن' بھائیوں' رشتہ داروں کو پتہ تھا کہ اتنی بار میں بچوں کی شادیوں کے سلسلہ میں پاکستان کے چکر لگا چکا ہوں۔ کسی نے میری مدد کی نہ حامی بھری۔ اور اس تلاشِ رشتہ میں ہمیں جو نمونے ملے تھے وہ 'پیر تسمہ پا' کی طرح میرے ہی کندھے پہ سواری کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر بیٹی نے بھی پاکستان میں شادی سے انکار کر دیا۔ جو کسر رہ گئی تھی وہ عصمی کے کینسر نے پوری کر دی۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ رشتہ ہی آیا ہے۔ کون سا منڈپ سج گیا ہے۔ ذرا دھیرج رکھو۔ شاید تب تک کوئی اچھا بر مل ہی جائے؟

چند روز گذرے تھے کہ اس اڑتیس سالہ نوجوان کا ٹیلیفون آیا۔ وہ کسی کافی شاپ میں مجھ سے ایک ملاقات چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ جواب ملا کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ ہم ملے۔ سامنے کرسی پر بیٹھے اس کا انداز بالکل ایسے تھا جیسے وہ دو زانو ہو کر مجھے انگوٹھی پیش کر رہا ہو۔ ہر زاویے سے وہ پیہم ایک عہد نامہ تھا کہ۔ "میری ہمیشہ 'کریئر اورینٹڈ' لڑکی سے شادی کی خواہش تھی۔ میں آپ کی بیٹی کو ساری زندگی خوش رکھوں گا۔ کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دوں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔" عصمی کی طرح خود مجھے بھی اس کا پستہ قد ہونا ہضم نہیں ہو رہا تھا لیکن اس کی باتیں اتنی لچھے دار تھیں کہ میں وہ لازمی سوال بھی بھول گیا جو مجھے پوچھنے تھے۔ مثلاً"۔ "تعلیم کیا ہے؟ کس کمپنی میں کام کرتے ہو؟ تنخواہ کتنی ہے؟ کوئی بینک

بیلنس وغیرہ بھی ہے یا نہیں؟اس نے کہا۔"شادی کے بعد تین ماہ تک میں ماں باپ کے ساتھ رہوں گا پھر رہائش الگ کرلوں گا۔"میں نے اسے سمجھایا کہ " بیوی کے حقوق الگ ہیں اور ماں باپ کے الگ۔ دونوں میں سے کسی کو بھی پامال نہیں کرنا چاہیئے۔۔۔" ہم واپس چلے تو میں نے سوچا اس کے قد کو نظر انداز کر کے ایک بار اس کے والدین سے ملنے اور ان کا رہن سہن دیکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بیٹی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ۔"میں زیادہ تو نہیں جانتی۔ گرایجویٹ ہے۔ میرے ساتھ ایکسپو میں ہی کام کرتا ہے۔ دوسرے سٹاف سے سنا ہے کہ کھلے ذہن کا ہے۔ عید پر ہم سب ایک دوسرے کے علاوہ ان کے گھر بھی گئے تھے تو اس کے ماں باپ سے ملنا ہوا تھا۔ شفقت سے پیش آئے تھے۔ اس کی بڑی بہن شارجہ ہی میں کسی بینک میں کام کرتی ہے۔۔۔" ابتدائی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ باقی کے لئے ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ اس کی اماں کے درشن تو پہلے ہو چکے تھے۔ اب پاپا کو بھی دیکھا۔ عجوبہ کھچڑی گھر تھا کہ امی' پاپا' بہن' بھائی سارا گھر ہی پانچ فٹ سے شروع ہو کر پانچ فٹ چار' پانچ انچ تک ختم ہو جاتا تھا۔ پاپا جی کا کام ہر بات پہ حیرت ظاہر کرنا تھا۔ مثلاً" آپ ان سے کہہ دیں۔ "لاہور میں ایک سڑک جی ٹی روڈ ہے۔"وہ حیرت سے کہیں گے۔"اچھا جی؟!" آپ کہیں۔"یہ سڑک دہلی سے پشاور تک ہے۔۔۔" اب منہ کھل جائے گا۔"اچھا جی؟!" "یہ سڑک شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔۔۔"اچھا جی؟!" اور اگلا سوال بے حد سادگی کے ساتھ ادھر سے آئے گا۔"یہ شیر شاہ سوری کوئی روڈا نجینئر تھا۔۔۔؟" ہائے! اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ ان سب کی خوشی کا یہ عالم تھا جیسے سچ مچ ان کے دروازے پہ بارات آن اتری ہو۔ ہمیں کھانے پہ بٹھایا۔ گھر پہ بنائی ہوئی چاولوں کی ڈش تھی' روٹی' چٹنی اور ہوٹل کے دو سالن۔ ایک پلیٹ سینڈوچ تھے جن کے بارے تعریف کرتے ہوئے محترمہ ایم کیو ایم نے بتایا کہ وہ ان کی سپیشلٹی ہیں۔ ذیابیطس اور دیگر احتیاط کی وجہ سے عصمی نے صرف سینڈوچ ہی لیا۔ سالن تو دیکھنے سے ہی پتہ چل رہا تھا کسی ہوٹل سے تیل کے تالاب میں بنوائے

گئے ہیں۔ چاولوں کا ذائقہ کچھ الگ سا ہی لگا لیکن آدابِ مہمانی تھے چنانچہ نگل لئے۔ ابھی کچھ ہی وقت نکلا تھا کہ عصمی کی طبعیت خراب ہونے لگی۔ واپس چلتے چلتے میں نے احتشام سے پوچھا۔ "کیسے لگے ہیں یہ لوگ۔۔۔؟" اس نے بہت سکون سے کہہ دیا۔ "شریف آدمی لگتے ہیں!!" مجھے بیٹی بیاہنے کا تجربہ نہیں تھا تو اسے کیا معلوم ہوتا۔!!

شام تک عصمی کی طبعیت اور بھی بگڑ گئی۔ کھانسی شروع ہو گئی اور سانس جیسے دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ رات کو بخار بھی ہو گیا۔ ان علامات سے بچنے کی ہمیں سخت تاکید تھی۔ اس سینڈوچ کا ایک ایک ٹکڑا میں نے اور احتشام نے بھی لیا تھا۔ ہم صحت مند تھے شاید اس لئے ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ 'عصمی کا 'اِمیون" سسٹم ڈاؤن تھا اس لئے وہ بیمار ہو گئی۔

"وہ لازماً" بچے کھچے باسی کھانے کا بنایا ہو گا۔۔۔" وہ مصر تھی۔" یہ لوگ لیموں' چٹنی' اچار کے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ میں نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے ان چیزوں سے پرہیز ہے۔ آپ کو پتہ ہے کیمو کی وجہ سے میرے ہونٹ اور مسوڑے سن ہیں اور مجھے ذائقے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس نے یقیناً" چٹنی بھی ڈالی ہو گی۔ اور سب کچھ جانتے بوجھتے مجھے سینڈوچ تھما دیا۔۔۔"

مجھے ' طاہیریوں' یا ان لوگوں کے ثقافتی کھانوں بارے کچھ معلوم نہ تھا البتہ سینڈوچ میں ہلکی سی کھٹاس ضرور تھی۔ پھر بھی محض ایک اتفاق سمجھتے ہوئے میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس کا خمیازہ ہمیں اگلے دو تین دن میں ہی بھگتنا پڑا جب سانس اس قدر خراب ہو گیا کہ اسے دوبئی ہسپتال ایمرجنسی لے جانا پڑا۔ اس بار میری بجائے وہ احتشام کے ساتھ گئی کیونکہ اس رشتے کے سلسلہ میں اسے مجھ سے بہت رنجشیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ میں ان لوگوں کی طرفداری کرتا ہوں اور اس کی بات نہیں سنتا' مانتا۔ اس پہ ستم یہ کہ اولاد بھی "ہارس ٹریدنگ" کر کے "ماں پارٹی" میں شامل ہو گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر نے کیا کہا یا بتایا' مجھے اس کی خبر نہیں دی گئی۔ اس کی حالت سنبھلتے بہت دن لگ گئے۔ 'توام ہسپتال العین' پہنچے تو

نمونیہ کے آثار بتائے گئے۔ سانس میں دقت کی وجہ سے سی ٹی سکین کیا تو پتہ چلا کینسر صرف ہڈیوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ پھیپھڑوں میں بھی جا پہنچا ہے۔ مارکر ٹیسٹ 228.5 پہ جا پہنچا تھا۔ یعنی دوسری کیمو لائن بھی ناکام ہو گئی تھی۔ اسے ترک کر کے تیسری کیمو لائن شروع کر دی گئی تو میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ سوچا۔ یہاں لگ بھگ سبھی جوان لڑکے لڑکیاں کام کرتے کماتے ہیں۔ ان کے ساتھ پرواز کرتے اوپر سے میاں کیوپڈ بھی اپنی تیر اندازی کا شوق پورا کرتے رہتے ہیں۔ میرے تین بیٹے ہیں۔ عدیل کی ابھی مسیں بھیگی تھیں کہ ایک نگاہ نازا سے اچک کر لے گئی۔ سمیر اور احتشام کو بھی ہر دوسرے تیسرے چاند اگلے پڑاؤ تک کوئی نہ کوئی ہاتھ تھام لیتا ہے۔ اپنے اپنے زاویے سے انتخاب ہوتے ہیں۔ لڑکیاں ذرا زیادہ ہوشمند ہیں۔ اچھا مستقبل ناپ تول کر ساتھ نتھی ہوتی ہیں ورنہ اگلے موڑ سے نئی راہیں' نئی پگڈنڈیاں۔ آج کے دور میں زمانے کا یہی چلن ہے اور اسے "آج کا فیشن" کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پھر میرے گھر میں یہ "مولویانی' کہاں سے پیدا ہو گئی؟ اتنے سال لندن میں تعلیم حاصل کی۔ پھر سالہا سال سے دوبئی شارجہ میں ملازمت کر رہی ہے۔ اسے کوئی مخلص انسان نہیں ملا جو میرے گھر کی دیواروں پہ بھی رنگا رنگ جھنڈیاں لگا دیتا؟ اس کا جواب ملا۔ "آپ نے ہمیں سمجھایا' بتایا ہی ایسے تھا۔۔۔" پتہ چلا کہ بیٹے کان لپیٹے اور بیٹیاں سر نہوڑے نصیحتیں سنتی ہیں اور زیادہ تعلیم بھی کبھی کبھار ناکامیوں کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

گنگا رام ہاسٹل لاہور میں ایک ڈاکٹر رباب ہیں۔ پتہ نہیں وہ ڈاکٹر کیسی ہیں لیکن انسان بہت ہی اچھی ہیں۔ بیٹی کے لئے رشتہ تو وہ بھی نہ بتا پائیں لیکن شادی کے نئے ایک عدد دولہا ہمارے پاس ابھی بقایا تھا اس کے لئے انہوں نے ابوظہبی میں ایک گھرانے کا ٹیلیفون نمبر دیتے ہوئے تاکید کی کہ اس لڑکی کو ضرور دیکھ لوں۔ اب کی بار آدھی مشکل پھر آن پڑی کہ وہ باپ کی طرف سے پنجابی اور ماں کی طرف سے ایم کیو ایم تھی۔ لیکن میں نے اسے دیکھا تو لاہور والی وکیل لڑکی کی طرح پہلی ہی نگاہ میں اسے اپنی بیٹی مان لیا۔ لندن سے فنانس میں ماسٹرز' مزاج

میں بہت سلجھا ہوا ٹھہراؤ اور شائستگی۔ شکل صورت' قد بت بھی بے حد پیارا۔ بوبی کی بات عصمی پاکستان میں ہی چلا رہی تھی۔ میں نے سوچا اگر احتشام مان جائے تو یہ لڑکی اس کی بہترین ہمسفر ہو گی۔ ان دنوں وہ ماں کے کیمپ میں سر گرم تھا اور گھر کی فضا میں وقتاً" فوقتاً" سونامی پیدا کر رہا تھا۔ نیند کا ایسا زبر دست دھنی کہ ڈھول بجاتے رہو اس کی بلا سے۔ بینک میں ساتھ کام کرنے اور اسے چاکلیٹ کھلانے والی ڈھیروں لڑکیوں نے ہر صبح ٹیلیفون کر کے اسے جگانے کی ڈیوٹی لے رکھی تھی۔ انمیں سے ایک بہ نفسِ نفیس اس کے خوابوں میں براجمان ہو گئی۔ چنانچہ ہر کچھ روز کے بعد وہ ایک شگوفہ چھوڑ رہا تھا کہ اس لڑکی کے گھر آگے رشتہ مانگنے والوں کی قطاریں لگی ہیں۔ اس کے ماں باپ کسی کو 'ہاں' کر دیں گے اس لئے آپ جلدی کرو۔ عجیب بات ہے کہ میرے گھر میں ایک بیٹی سالوں کے فاصلے طے کر گئی سفید گھوڑے پہ بیٹھا کوئی شہزادہ نہیں آیا۔ ادھر چوتھے نمبر پر جنگجو پیادے کو بے چینی لگی تھی کہ سوئمبر رچا ہے۔ کوئی اور دلہنیا کو اڑن کھٹولے پہ نہ بٹھالے جائے۔ ستم یہ کہ وہ بھی "مہاجر" قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی اور عصمی پریشان تھی۔ احتشام اس کا سب سے لاڈلا سہی لیکن اسے 'ہاں' کہنے کے بعد وہ خود ہی اپنی استقامت کھو بیٹھتی۔ باقیوں کو وہ پنجاب کے کھلیانوں میں کیسے دھکیلتی؟ چنانچہ ایک روز اس گردان سے تنگ آ کر اس نے کہہ ہی دیا۔ "اتنے عرصے سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو۔ اس کے ماں باپ نے اب تک اس کا رشتہ کہیں کیا کیوں نہیں؟ انہیں کہو۔ کر دیں اس کی شادی۔۔۔" مجھے موقع مل گیا۔ میں نے احتشام کو بہت دلار سے کہا۔ " سنی! میں نے تمہارے لئے ابو ظہبی میں ایک بہت پیاری لڑکی دیکھی ہے۔۔۔"

میرا قصیدہ ابھی ادھورا ہی تھا کہ اس نے جواب دیا۔ "اگر وہ پینتیس ہزار درہم ماہانہ کماتی ہے تو میں دیکھے بغیر ہی اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں چاہے وہ لنگڑی لولی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر نہیں تو میں ساری زندگی اور کہیں شادی نہیں کروں گا۔۔۔" تب میں نے جانا' عصمی اور میں تو فقط گڈریے تھے۔ اپنا آپ بھلا کر سنگلاخ زمینوں' چٹانوں اور موسموں میں ہم ان

میمنوں کی دیکھ ریکھ کرتے رہے۔ اب بڑے ہو کر چند پل پہلے وہی ہیں ہمارے آس پاس ہی چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ ان کے پیچھے بھاگتے ہمارے قدم تھک گئے ہیں تو جانے کدھر' کس کے ریوڑ میں جا ملے ہیں؟ یو اے ای میں ویسے بھی قبضہ نام نہاد 'مہاجروں' کا ہے۔ بحیثیت پاکستانی پنجابی فیمیلیز بہت کم ہیں۔ اور دریا میں رہنا ہے تو مگرمچھ سے بیر کب تک چلے گا؟ چنانچہ اگلے تین ماہ میں عصمی کی تیسری کیمولائن فیل ہو گئی تو میں بھی چیخ گیا۔ اور بیٹی کا رشتہ قبول کر لیا۔ عصمی کا صاف شفاف گورا رنگ پھیکی حنا میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے بھی اپنی کرچیاں سمیٹیں اور احتشام کے لئے اسی کی پسند کا رشتہ مانگ لیا۔ میں' وہ' ہم دونوں ہی ہار گئے۔ مہاجر جیت گئے۔ الطاف حسین جیت گیا۔ کبھی ایک پنجابی لوک گیت سنا تھا۔ "رانجھا رانجھا کر دیاں میں تے آپے رانجھا ہو گئی۔۔۔" اب مہاجر مہاجر کرتے ہم دونوں خود اپنے گھر میں ہی مہاجر ہو گئے۔ نیو ایسٹ انڈیا کمپنی کھل گئی ہے۔ مہاجرو! یار اب تو پاکستانی بن جاؤ۔ تمہاری خاطر ہم نے اپنا آپ قربان کر دیا ہے۔!!

عصمی اور میرے بیچ شادی بیاہ باعثِ نزع بن گئے۔ کچھ پسند ناپسند کا مسئلہ تھا اور کچھ دیمک کی طرح چاٹنے والا اس کا مرض۔ دھیرے دھیرے اس کا ردِ عمل شدید ہو گیا۔ ایک بار کسی بات سے اختلاف ہو گیا تو پھر اسے 'سمجھانا' منانا بہت مشکل ہو گیا۔ میں ذہنی انتشار و خلجان کا شکار ہو گیا۔ بیٹے اپنے موقف پر قائم تھے اور مجھے ڈر تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف گئے تو وہ پکھیرو ہمیں چھوڑ کر اپنے آشیانے الگ بنا لیں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بار پھر وہ گلی گلی "ہوکاں" دیتی انہیں ڈھونڈتی پھرے۔ اب تو اُس کی صحت ایسے ہنگاموں کی متحمل ہو ہی نہ سکتی تھی۔ چنانچہ اسی سبب مجھے گھر کو بھی یکجا رکھنا تھا۔ دوسری جانب میری رگوں سے بھی جان کھنچ رہی تھی؟ رات سونے کے لئے لیٹتا تو آگے خلاء اور پیچھے اس سنگ بیتے لمحوں' اس کی یادوں کا پاتال نظر آتا۔ بیچ میں فقط میری بے بسی تھی کہ سر نہوڑے' بین کرتے 'گذرتے لمحوں کو میں روک سکتا تھا اور نہ ان عذابوں' اذیتوں کا اتہ پتہ خود اسے ہی بتا سکتا تھا۔ اندر کے

درد سے میں نے مٹی کے بتوں کو تڑختے" ٹوٹتے" کراہتے' بکھرتے اور ہڑپہ" موہنجوڈارو میں ڈھلتے دیکھا۔ عہدِ حاضر میں بچا کھچا جو کچھ بھی میرے پاس رہ گیا تھا وہ میں نے ان خاموش لمحوں کو سونپ دیا۔

Along the banks of Bablon

We sat and wept,

Remembering thee !!

ویڈنگ کارڈ چھپ کر آئے تھے کہ شارجہ کے مہاجر ہیڈ کوارٹر " زیرو ٹو۔۔۔02" سے مجھے ارجنٹ بلاوا آگیا۔ دنیا میں رہتے' زمانے کے ساتھ چلتے عرصہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا کھٹک گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ دونوں ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ روزانہ ملنا ہوتا تھا۔ شاید کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہو چنانچہ ان لوگوں کے ذہن پڑھنے ضروری تھے۔ عصمی کو بھنک بھی پڑ جاتی تو مجھے ہرگز نہ جانے دیتی۔ اس لئے بتائے بغیر پچاس کلومیٹر گاڑی دوڑائی اور وہاں جا حاضری لگوائی۔ سلام دعا کے بعد دولہا میاں ڈرائینگ روم میں ایک طرف کھڑے شاید مسئلہ فیثاغورث سلجھانے میں مصروف ہو گئے اور بڑے میاں اپنے ایک ہاتھ میں دوسرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے میرے قریبی صوفے پر یوں سمٹے' ٹھٹھرے بیٹھ گئے جیسے کمرے میں صرف ان کے اوپر برفباری ہو رہی ہو۔ دور دوسرے کونے سے مہاجر محترمہ نے ارشاد فرمایا۔

"اِن دونوں کے بیچ ابھی سے کچھ اختلافات ابھر آئے ہیں۔ جو اچھے نہیں ہیں۔۔۔ " یہ ایک سرزنش تھی۔ وقفہ آتے ہی آگے کا لقمہ بڑے میاں نے دے دیا۔ "ہمیں تو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ابھی یہ عالم ہے تو آگے جانے کیا ہو؟" اتنے میں محترمہ نے شمع محفل پھر اپنے سامنے کھینچ لی۔ " اس لئے وہ تو کہتے ہیں اس بات کو یہیں پہ ہی ختم کر دو۔۔۔"

ان کی مسدس پوری ہوگئی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ انہوں نے مجھے بلیک میل کرنے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا تھا۔ لحظہ بھر توقف کے بعد میں نے کہا۔

"اچھا ہے کارڈ ابھی بٹے نہیں۔۔۔" پھر کچھ سوچ کر میں نے سر جھٹکا اور بولا۔ "لیکن بٹ بھی جاتے تو کیا تھا؟ غلط فیصلوں کا احساس ہوتے ہی انہیں بدل دینا چاہیئے۔۔۔" یکبارگی تینوں چہرے اپنے مرکز پر گھوم کر ایک دوسرے کے سامنے ہوگئے۔ میں اپنا حالِ دل سنائے گیا۔ "ابھی دیر نہیں ہوئی۔ آپ لوگ آپس میں مشورہ کر لیں۔ جو فیصلہ ہو گا مجھے قبول ہے۔۔۔" میں واپسی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے یقین تھا انہیں مجھ سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ چنانچہ ابھی گھر کے راستہ ہی میں تھا کہ دولہا میاں کا ٹیلیفون آگیا۔ "انکل! ثمرین سے میری بات ہوگئی ہے اور ہمارے اختلافات اب ختم ہوگئے ہیں۔۔" یکدم ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے پاس تو کوئی جادو ہے۔ کاش میں اس سے مسئلہ کشمیر اور فلسطین حل کرواسکتا۔ لیکن گھر پہنچ کر میں نے عصمی کو اپنی اس جادوگری کا کمال بتایا تو وہ بپھری شیرنی کی طرح میرے گلے پڑگئی کہ میں اس طرح اس عورت کے بلانے پر وہاں گیا ہی کیوں تھا۔ لیکن پھر ثمرین نے ان اختلافات سے پردہ اٹھانا شروع کیا تو بات اس کی سجھ میں آگئی۔

"ساسوجی نے مجھے کچھ مشورے دیئے تھے کہ سونے کے زیورات کی ان میں ہمت نہیں ہے۔۔۔" اس نے بتایا۔" وہ کراچی سے چاندی کے زیور پر پانی چڑھوا دیں گی۔۔۔ دوسرے لہنگا سیٹ بھی وہیں سے بنوا لایں گی۔۔۔ اور دریافت کیا تھا کہ۔ "تم پنجابیوں میں تو رسم ہوتی ہے ناں! فرنیچر دینے کی۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔ میں نے انہیں جواب دیا تھا کہ ہمارے گھر میں نقلی زیورات یا جھوٹ کا سہارا نہیں لیا جاتا۔ آپ میں ہمت نہیں تو آپ زیور نہ دیں

لیکن دنیا کے سامنے چاندی کو سونا کہنے' بنانے کا کام میں نہیں کروں گی۔۔۔ لہنگے کے بارے میں نے کہا تھا کہ وہ لمبے قد پر اچھا لگتا ہے۔ مجھے نہیں جچے گا۔ لہٰذا میرے لئے نہ بنوائیں۔۔۔ فرنیچر کا میں نے بتایا تھا کہ ابو نے میرے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا دیئے ہیں۔ آپ کے یہاں فی الحال مزید فرنیچر کی جگہ ہی نہیں ہے۔ جب کبھی ضرورت آئے گی لے لیں گے۔۔۔" وہ ایک ایک کر کے تمام معاملات کی توضیح کرتی گئی۔ "اب ساسو جی نے اپنی بیٹی سے مشاورت کی۔ آپ پر دباؤ ڈالنے کے لئے 'بات ختم کرنے' کا مشورہ اسی نے دیا ہے۔ اپنے بھائی کو چابی دینے والی بھی وہی ہے۔ اس نے مجھ سے بات کی تو میں نے اپنا موقف بلا جھجک کہہ دیا۔ مجھے یہ اندازہ بالکل بھی نہیں تھا کہ وہ اس بات کو اتنا طول دیں گے اور پھر اس کے بعد آپ کو بھی بلا لیں گے۔"

"کمال ہے۔۔" قصہ ختم ہوا تو عصمی پھر سے بھڑک اٹھی۔ "ہمیں کسی بات کی خبر ہی نہیں اور اس سے بھاؤ تاؤ ہو رہے ہیں۔ رشتے کی آڑ میں بلیک میل کر رہے ہیں۔ اور ہمیں لوگوں کے مشورے کیوں بتاتے ہیں۔ سیدھے بات ختم کیوں نہیں کرتے۔ ہم نے رشتے کے لئے منت کی نہ کوئی تقاضا کیا پھر اتنی چکر بازیاں کس بات کی؟ آپ نے غلط کیا جو انہیں شرعی حقِ مہر کا کہا ہے۔ اب تو میں دو لاکھ درہم لکھاؤں گی۔ ہمت نہیں ہے تو اپنا راستہ لیں۔۔"

"دو لاکھ نہیں۔۔" میں نے سوچ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ " ایک لاکھ کی شرط میں بھی رکھوں گا۔ کیونکہ مجھے بھی ان پر اعتبار نہیں رہا۔ شرعی حقِ مہر اب نہیں چلے گا۔"

اگلے روز میں نے ٹیلیفون کر کے انہیں بلا لیا۔ میرا اندازہ تھا کہ صرف ماں بیٹا آئیں گے اور وہی ہوا۔ شاید اپنے گھر پہ حکومت کر کر کے ان محترمہ کو اپنی ذات پہ بہت ناز تھا کہ وہ ساری دنیا کو 'ناک آؤٹ' کر سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے شمع محفل پہلے ہی انہی کے آگے سرکا دی۔

"آپ کو جو کچھ بھی شکایات ہیں' یا جو بھی مطالبات ہیں آپ ثمرین کی ماں سے کہہ سکتی ہیں۔۔۔" میں نے کہا۔

" میں نے تو ثمرین سے بس اتنا کہا تھا کہ میں تمہیں چاندی کے زیور پر سونے کا پانی چڑھوادوں گی۔۔۔" وہ شاید اس کے لئے تیار نہیں تھیں چنانچہ نچلی سیڑھی سے ہی بول پڑیں۔ "سونے کی تو ہم میں ہمت نہیں ہے۔۔"

"رشتہ لے کر آپ آئی تھیں۔۔" عصمی اپنے نحیفانہ غصے کو دباتی ہوئی بولی۔ "آپ میں شادی بیاہ کی ہمت نہیں تھی تو رشتہ ہی کیوں لائیں؟ میں نے کبھی نقلی پہنا ہے نہ اپنے بچوں کو پہنایا ہے۔ ہم نے آپ سے زیور وغیرہ کا مطالبہ بھی کوئی نہیں کیا تھا۔ لہٰذا یہ پیشکش ہمیں قبول نہیں۔۔"

اب ان محترمہ نے رونا شروع کر دیا۔ عورت کے آنسوؤں سے مرد کی جان جاتی ہے اور وہ ماہر نفسیات تھیں۔ انہوں نے اپنی بن بادل برسات کو میری جانب گھمایا اور بولیں۔

"چاندی کی تو زکواۃ بھی دے جاتی ہے۔" انہوں نے دین و دنیا کو ملانے کی کوشش کی۔

"لیکن آپ شادی کرنے چلی ہیں زکواۃ دینے نہیں آئیں۔۔۔" میں نے جواب 'آں راغزل' بھی سنا دیا۔ "اور ہاں! حق مہر بھی ایک لاکھ درھم ہو گا۔۔۔"

"اتنی تو ہماری ہمت نہیں ہے۔" وہ 'سٹپٹا' بوکھلا کر پھر بولیں۔ آنسوؤں کے پرنالے پھوٹ پڑے۔ دولہے میاں بھی بولے۔ "انکل یہ تو بہت زیادہ

ہیں۔۔۔" پھر خود ہی سمجھ کر بولے۔ "امی! ٹھیک ہے۔ میں نے کونسا چھوڑنا ہے جو فکر کر رہی ہیں۔۔۔"

حق مہر دراصل ہوتا تو بیوی کا اک چھوٹا سا ناز ہے لیکن اسے دولہے کے ماں باپ کی جانے کیوں جان جاتی ہے؟ شاید انہیں شک ہوتا ہے کہ وہ جو ملکیت اور باندی خرید لے چلے ہیں اسے اک ڈھال مہیا ہو جائے گی۔ کہیں کسی وقت یہ سر پر پڑ گئی تو؟ چند روز بعد دوبئی کی شرعی عدالت میں رسم نکاح تھی تو بڑے میاں معاہدے کا حصہ بننے سے کھسک گئے۔ دولہا میاں نے بتایا کہ حق مہر سے اختلاف کے سبب انہوں نے شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ حضرت بہت کایاں ہیں۔ ان کی وہ سادگی' بھولپن صرف لوگوں کو گرویدہ بنانے کا فن پارہ ہے ورنہ گلیشئر کی طرح وہ ایک حصہ زمین سے باہر ہیں اور گیارہ حصے اندر۔ کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں تلے کی زمین کا آپ سمیت سودا کر دیں گے اور آپ کو خبر بھی نہ ہو گی۔ صرف دو دن پہلے عصمی کے وجدانی احساس نے پھر اس نکاح کو رکوانے کی آخری کوشش کی۔ کاش اس کی بات مان کر یہ نیک کام میں نے کر دیا ہوتا تو اگلے کتنے ہی عذابوں سے بچ جاتا۔

مارچ کے پہلے ہفتہ میں رخصتی بھی ہو گئی۔ اگلے روز محاورۃ" ابھی سجدہ شکر سے سر نہ اٹھایا تھا کہ پتہ چلا دولہے میاں تو گزشتہ دسمبر کے ملازمت سے فارغ ہو کر گھر پہ بیٹھے ہیں۔ اپنے آپ پہ مجھے غصہ بہت آیا کہ میں نے اپنی آنکھوں پہ فرض پورا کرنے کی یہ کیسی پٹی باندھ لی تھی۔ کل کا وہ بچہ اور اس کے مہاجر امی پاپا میری آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے مات دے گئے تھے۔ لیکن جنہوں نے ملک کے اندر آن بسیرے بنالئے' شہریت' قومی پاسپورٹ لے لئے اور پھر قوم و ملک کی محبتوں' بھائی چارے کو ٹھینگا دکھا کر بدستور مہاجر رہنے کی کیل ٹھونک دی ہو' ان سے وفا کی امید میرا پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا۔ میں نے عصمی سے یہ خبر پوشیدہ رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے پتہ چل ہی گیا اور میرے لئے ایک نیا محاذ بھی کھل گیا۔ پچھلے دو تین ماہ سے عصمی کئی بار مجھ سے' اور ثمرین سے بھی شکایت کر چکی تھی کہ اس

کی ساس ٹیلیفون کر کے اشتعال انگیزی کرتی' اور اسے پریشان کرتی رہتی ہے لیکن ہم نے ہر بار اسے دونوں کے بیچ انڈیا پاکستان کی سرحدی الزام تراشی سے آگے کچھ نہیں جانا۔ اب ملازمت جانے کا یہ نیا اسلحہ بارود آگیا۔

"ان کے گھر کا خرچا یہی چلا رہی ہے۔ اور مکلاوے پہ سارے تحفے تحائف بھی یہ اپنی جیب سے لائی تھی۔۔" اس نے بہت شور مچایا۔" دیکھ لینا۔ یہ اپنی اسی ہی چلی ساس کے ہاتھوں برباد ہو گی۔۔"

بیٹی نے انکار کیا لیکن بعد میں عصمی کا الزام سچ ثابت ہو گیا کہ اس گھر میں جانے کے بعد لگ بھگ چھ ماہ تک بیٹی ہی اس گھر کا راشن ڈال کر دیتی رہی تھی۔ اور ان کی طرف سے مائیکے کے لئے تحائف بھی وہی خرید کر لائی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ شادی کے دو تین روز بعد سے ہی شوہر نامدار بار بار اسے دوبئی کورٹس کے گرد طواف کرواتا رہا کہ وہ حق مہر معاف کرنے کا حلف نامہ سائن کر دے۔ مجھے بے حد تکلیف پہنچی۔ بچوں کی زندگی استوار کرنے کی فکر میں خدا جانے میری عقل پہ کیسے پتھر پڑ گئے تھے کہ میں نے وہ ہاتھ چھوڑ دیا جسے تھام کر میں زندگی کی ہر مشکل سے گذرا تھا۔ اس کی پیش گوئی کو بد دعا سمجھ کر دل دہلا بھی تھا لیکن میری بد قسمتی کہ میں نہ صرف اس کے ساتھ ساتھ پلنے بڑھنے والی "گوگی بی بی" کو بھلا چکا تھا بلکہ اس کی ممتا کے الہام و ادراک کو بھی نہیں پہچان پایا۔

عصمی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ قدرت کا اپنا ہی نظام ہے۔ کبھی کبھار وہ ہم پر مسائل کے اتنے انبار لاد دیتی ہے کہ ان سے ہمیں کچھ دکھانا' سبق دینا مقصود ہوتا ہے۔ ان دنوں ہمارا گھر بھی عصمی کی بیماری' اس کے ذیلی اثرات' شادیاں اور پھر ان سے جڑی بد نظمی کا شکار تھا۔ یوں جیسے ہر روز کوئی نیا سونامی ہمیں تہس نہس کر رہا تھا۔ ایسے میں شارجہ کے مہاجر ہیڈ کوارٹر "زیرو ٹو۔۔02" نے بھی اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیئے۔ ایک شام جھڑی لگی تھی۔ ہم اپنے بند باندھ رہے تھے کہ سمدھن صاحبہ کا ٹیلیفون آگیا۔

"آپ ابھی کے ابھی یہاں آجائیں۔۔۔"

لہجہ ہلاکو خانم کا اور تان ایسی تھی جیسے مجھے یہ بتایا جارہا ہو کہ آپ لڑکی والے ہیں اور اب آپ کو ہمارا تابع رہنا ہو گا۔ میرے نزدیک یہ معاشرتی سوچ انتہائی غلیظ' ذلیل اور کمینگی ہے۔ یہ نظریہ علامت ہے کہ اس کا حامل کس طبقے اور کس نوع سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ماں نہیں رہی تو اب وہ مجھ پر کاٹھی ڈال پاڑا کبڈی دوڑالیں گی لیکن مجھے اپنی بیٹی کو بھی یہ بتانا ضروری تھا کہ وہ میرا غرور ہے' کمزوری نہیں۔ چنانچہ میں نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اگلے ہی پل ان کے بیٹے کو ٹیلیفون کر کے تاکید کر دی کہ "میں اپنے گھر کی عورتوں کے علاوہ کسی غیر خاتون سے بات پسند نہیں کرتا۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو کسی مرد سے کہو وہ مجھ سے بات کرے۔ اور اپنی 'امی جان' کو سمجھا دینا کہ آئندہ مجھے اس طرح طلب کرنے کی کوشش نہ کریں۔۔"

اس پیغام نے خاطر خواہ اثر کیا۔ شاید اس گھر میں مرد صرف ایک وہی تھیں۔ چنانچہ کسی دوسرے نے مجھے پھر نہیں بلایا۔ اگلے روز ثمرین سے تفصیلات معلوم ہوئیں کہ اس کے "ہزبینڈ" صاحب آئے اور اس سے سات ہزار درہم لیجا کر ماں کو دے دیئے کہ انہوں نے کچھ قرضہ اور کمیٹی ادا کرنی ہے۔ وہ رقم بچے کی آمد کے اخراجات کے لئے رکھی تھی۔ اس پہ میاں بیوی میں بات بڑھ گئی۔ ساس نے آن دخل دیا کہ "تم پر اللہ کی طرف سے یہ آزمائش کا وقت ہے۔ اور تم پنجابیوں میں تو رسم ہوتی ہے کہ بچے کی پیدائش کا خرچا مائی کے والے دیتے ہیں۔۔" ثمرین نے ان کی بات کو رد کر دیا کہ۔ "قرضے آپ لے لے کر کھائیں۔ کمیٹیاں بھی آپ کی۔ اور آزمائش میری کیوں۔۔۔؟" بس اتنا سننا تھا کہ ساس نے دونوں ہاتھوں اپنا سر پیٹنا' واویلا مچانا شروع کر دیا۔ آپ کو بلانے کا مقصد معاملے کی سنجیدگی سے آپ کو ڈرانا تھا۔

وہ مرحلہ گذر گیا لیکن دھیرے دھیرے ان لوگوں پر سے سونے کے پانی کا ملمع اترنے لگا۔ انہیں ملازمت پیشہ دلہن اس لئے درکار تھی کہ وہ کما کر اپنا گھر چلائے اور بیٹا اپنی پوری تنخواہ لا کر امی جان کی گود میں رکھ دے۔ بڑے میاں کب کے ریٹائر ہو چکے۔ ان کی کمائی ایسی کبھی تھی ہی نہیں کہ وہ اس عمر میں اپنے شوق پورے کرنے کے لئے کچھ بچا پاتیں۔ دوسرے بیٹے بھی کھوٹے سکے ثابت ہوئے۔ اب یہی ایک ترپ کا اِکا' گدڑی کا لعل ان کی امیدوں کا مرکز تھا جو ان کے ارمانوں' ان کی حسرتوں کو پورا کرتا۔ وہ کٹی پارٹیوں کی بے پناہ شوقین ہیں اسی لئے انہوں نے گھر کا سارا خرچا بھاڑا زبردستی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ یوں وہ اشیائے خرید پر اپنی من پسند قیمتیں چسپاں کر سکتی ہیں۔ بجلی پانی کے 400 درہم بل کو 1400 بتا سکتی ہیں۔ میاں صاحب ستر بہتر سال کی عمر میں بھی "پلپلے بوائے" ہیں۔ وہ اپنا جیب خرچ لے کر کھسک لیتے ہیں۔ خود ان کے بیٹوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے "جوکر" کی بجائے مرد بن کر گھر کی باگ ڈور سنبھالی ہوتی تو کسی کا بیڑا غرق نہ ہوتا۔ ان 'بیوی برخوردار' کی بیگم جھانسی کی رانی سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ قد شاید پانچ فٹ ہے لیکن "چیریٹ" کے گھوڑوں کی طرح گھر کے تمام افراد کی لگام ان کے ہاتھوں میں ہے۔ بیٹی کو انہوں نے اپنی زیروکس کاپی بنایا ہے۔ اس کی جامع تعریف خود ان کا دل جلا داماد ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "پندرہ سال سے ان عورتوں نے مجھے کتا بنا کے رکھا ہے۔" صحیح مسلم اور صحیح بخاری سے زیادہ احادیث انہیں ازبر ہیں۔ اور اپنے مفاد میں موقع کی مناسبت سے درجنوں نئی گھڑ سکتی ہیں۔ ہر ماہِ رمضان میں اپنے پیچھے ٹی وی آن کر کے' ہاتھ میں تسبیح لئے ماڈرن اعتکاف میں بیٹھتی ہیں کیونکہ وہ اپنے پسندیدہ ڈرامہ سیریل نہیں چھوڑ سکتیں۔ اللہ بھی راضی' دل بھی راضی۔ لیکن برآمد ہونے کے بعد یہ آیات کی تشریح و تفسیر توڑ مروڑ اپنے حقوق کے لئے پیش کرتی ہیں اس سے لگتا ہے کہ انہیں ناراض کیا تو جنت گئی کہ گئی۔ ہر کسی کو انہوں نے اپنی مٹھی میں یوں جکڑ رکھا ہے کہ مکھن لگا کر بھی کوئی ان کی انگلیوں بیچ سے پھسل نہیں سکتا۔

میاں صاحبزادے پھر ملازمت پہ لگے تو گلہری کی طرح قلانچیں بھرتے پھر'امی جان' کی گود میں چڑھ گئے۔ اور ان سب کی آزمائشوں کا دور ثمرین پہ منتقل ہو گیا۔ شادی میں وہ اپنی 'پاتھ فائنڈر" گاڑی ساتھ لے گئی تھی۔ اس پر وہ سیر سپاٹے تو کر لیتے تھے لیکن اس کا میڈیکل چیک اپ کروانے کوئی ساتھ ہسپتال جانے کو تیار نہ ہوا کہ کہیں فیس نہ دینی پڑ جائے۔ وہ ماں کے صدمے سے نڈھال دوبئی آتی اور میں ٹوٹا' بکھرا اسے لئے ہسپتالوں کے چکر لگاتا رہتا۔ مجھے ڈر تھا کہ بیوی کے بعد اب بیٹی بھی ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ ڈاکٹروں نے صبح سے شام تک' اوپر تلے درجنوں ٹیسٹ کئے' پیچیدگی کی علامتیں بتائیں اور خدشہ ظاہر کیا کہ شاید آپریشن کرنا پڑے۔ تنبیہ تھی کہ اسے ذہنی سکون کی بے حد ضرورت ہے۔ اس سبب شوہر نے اسے میرے پاس بھیج دیا۔ ساس نے پیدائش پہ ملنے والے شگن' تحفے تحائف ہاتھ سے جاتے دیکھ کر بہت طوفانِ بدتمیزی مچایا اور اس کا بدلہ یوں لیا کہ جس صبح آپریشن تھا اس سے پہلی رات اس نے گھر میں مارشل لاء لگا دیا کہ کوئی اگلی صبح تک اس کی خبر لینے ہسپتال نہیں جائے گا۔ "جن کی ہے وہی سنبھالیں۔۔۔" بالفاظِ دیگر باپ تمام بل' واجبات ادا کر چکے تو جانا۔ چنانچہ شوہر کے سوا کوئی نہ آیا۔ اس نے بھی رات بارہ بجے سے صبح چار بجے تک ہمیں ہسپتال کے ویٹنگ ہال میں بٹھائے رکھا کہ کمرے کا بندوبست کر کے آتا ہے۔ تکلیف بڑھ گئی تو میں نے جا معلوم کیا۔ پتہ چلا وہ انشورنس کمپنی کی طرف سے منظوری آنے کا انتظار کر رہا ہے۔ ساڑھے سترہ ہزار درہم سے اوپر کا بل تھا اور اس کی جیب میں ایک ہزار بھی نہ تھا۔ میری تو بیٹی تھی چنانچہ ادائیگی کی اور نرسیں مختصر سے وقت میں تیار کر کے اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئیں۔ شاید آٹھ بجے سے اوپر وقت تھا۔ دروازے کے سامنے میں اور بچے دعائیں مانگ رہے تھے۔ شوہر نامدار کی صرف امی جان آن پہنچی تھیں۔ تبھی متعلقہ ڈاکٹر نے آن مبارکباد دی کہ اللہ نے مجھے نواسہ دیا ہے۔ اسے دیکھ لوں اور اگر آذان دینی چاہوں تو

اس کی بھی اجازت ہے۔ اس اثنا میں وہ ماں بیٹا بھی میرے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے۔
دونوں بیچ عہد کی یادداشت جاری ہوئی۔ ابھی میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ آواز آئی۔

"نہیں انکل! پاپا آئیں گے تو آذان دیں گے۔۔"

مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا۔ میں نے ذات پات سب کچھ بھلا کر ان لوگوں سے رشتہ کیوں جوڑا؟ اور یہ پاپا' پاپی رات بھر کہاں تھے؟ تمام بلز میں نے ادا کئے۔ بیٹی میری تھی۔ ایک شوہر کے حقوق صرف اس لئے تمام ادب و آداب پہ حاوی ہو گئے کہ وہ مرد ہے؟ میں تو سنتِ رسول کی پیروی کرنے جا رہا تھا۔ اپنے نواسوں کو آذان انہوں نے ہی تو سنائی تھی!۔ لیکن انہیں تکلیف یہ تھی کہ میں سیّد شیعہ ہوں اور علیؑ کا نام لوں گا تو شاید بچے کا دین بدل جائے گا۔ کوئی پوچھے سینے میں ایسا بغض پل رہا تھا تو شادی کیوں کی؟ رسول نے تو اپنی شرفِ نسائیت بیٹی علی سے بیاہ دی۔ پھر "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ ، فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ" کہہ کے کردار بھی اپنے ساتھ ملا دیا۔ اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فرما کر اپنے تک پہنچنے کا راستہ بھی بتا دیا۔ لیکن جن کے دلوں پر قفل لگے ہوں اور گھر میں فرمانِ رسول کی بجائے رسولاں بی بی حدیثیں گھڑتی ہو' کلام اللہ کی شرح اور تفسیر اپنے نظریۂ ضرورت کے اعتبار سے سناتی ہو' وہاں ابو جہل کی جہالت سوا کوئی فصل پیدا نہیں ہو سکتی۔ عجیب بات ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہزاروں مندروں کے ناقوس' گھنٹیاں روزانہ بجتی رہتی ہیں۔ وہاں کے مسلمان انہیں سن کر ہندو نہیں بنے اور صدیوں آذانیں سن سن کر وہ ہندو مسلمان نہ ہوئے۔

بہر کیف۔۔۔ مجھے تھا اذنِ آذان۔ تا " لا الٰہ الا اللہ" اور میں نے ابھی "اللہ اکبر" کہا تھا کہ اپنے عقب میں مجھے قدموں کی آواز دور جاتی سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ منافقت اللہ کے پاک نام سے ہی چھٹ گئی تھی۔

ہم بلڈنگ سے نیچے اترے تو باہر سڑک پر انہوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ بہن' ماں اور باپ نے اپنے گھر کے اس درِ نایاب مرد کو بھڑکایا۔ ماں نے اپنی منافقت نکالی کہ۔۔ "میرے دل

میں غبار بھرا تھا آج میں نے نکال لیا۔۔۔" وہ کاؤ بوائے فنکار پایا آیا۔ ہال میں میرے سامنے 'وکٹری رول' کیا۔ اپنا زہر اگلا اور یہ جاوہ جا۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔۔۔

دنیا میں نئی وارد ہونے والی اس اجلی روح کو ان لوگوں نے یہ تحفہ دیا تھا۔ میں غلط تھا' میری سوچ غلط تھی۔ اور یہ سب کچھ میں نے عصمی کو کھو کر جانا کہ اس کی ممتا کا الہام و ادراک سچا تھا۔ ثمرین سچ مچ اسی عورت کے ہاتھوں برباد ہو گئی تھی۔

8
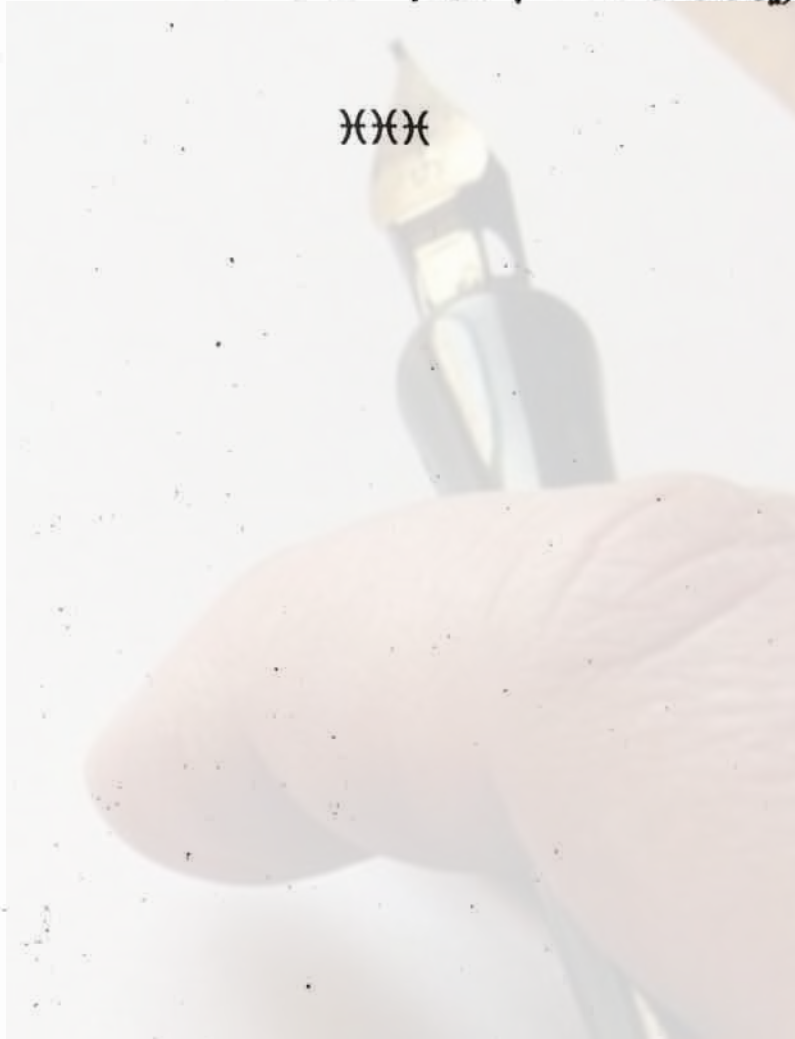
بے بی "سفینہ ہما" پیدا ہوئی تو گوگی بی بی کی گود میں پھینک دی گئی کہ اسے نام دو' پالو پوسو، نہلاؤ دھلاؤ اور بڑی کرو۔ شاہ جی کی زندگی میں ریاض حسین کا اس گھر سے اتنا ہی تعلق تھا کہ ماں ان کے لئے 'چنگا چوکھا' کھانا بنا کر رکھتی تھی اور وہ اس سے دانت پیلے کرنے آتے تھے۔ ادھر شاہ جی کے آنے کی باخبر' باملاحظہ' ہوشیار آواز لگتی اور ادھر ریاض حسین دوسرے دروازے سے باہر کھسک جاتے۔ کھانے کی 'چنگیر' بھی غائب ہو جاتی۔ شاہ جی محکمہ جاتی سر گوشیوں کو بھی سن لیتے تھے۔ رات کے گہرے اندھیرے میں آدمی تو کیا پوری ریلوے کالونی کے سائے بھی پہچان لیتے تھے۔ یہ بات ان سے کیسے چھپی رہتی کہ گھر کا رزق کس پیٹ کے تنور میں اتر رہا ہے۔ وہ بستر پہ لیٹتے تو تنہائی میں باپ بن کر اللہ کا شکر بھی ادا کرتے اور بڑی بیگم کے غائبانہ ممنون بھی ہوتے کہ بچے کی صحت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ لیکن ان کے وضع داری اصولوں میں اظہارِ ناراضگی کے لئے باپ بیٹے میں اتنا فاصلہ رکھنا ضروری تھا۔ اور ریاض حسین کو اس گھر میں اپنی "لو میرج" والی بیوی لانے کی تو قطعی' قطعی اجازت نہیں تھی۔ ورنہ شاہ جی اپنی سالی کا سامنا کس منہ سے کرتے جس کی بے گناہ' بے قصور بیٹی کو نکاح سے اگلی ہی صبح اس نالائق نے اپنے عشق کی خاطر طلاق دے دی تھی۔ پھر بھی انہوں نے رسول' منڈی بہاؤالدین سے اوور سیئرنگ کورس کروا کے اسے اپنے ہی روڈ ڈیپارٹمنٹ میں بھرتی کروا دیا تھا۔ ان کا فرض پورا ہو چکا۔ اب وہ خود اپنے بیوی بچوں کو پالے۔ دوسری طرف ریاض حسین نے اہلسنت تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر پنج دریاؤں کے ڈھیروں گھاٹوں کا پانی پی کر بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے آبائی گھر سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے "سفینہ ہما" کے عنوان سے گویا اس گھر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی

بنیاد رکھ دی۔ سکول میں تاریخ کی کتابوں نے انہیں اچھی طرح ذہن نشین کروایا تھا کہ انگریز نے اسی طریقے پورے انڈیا پہ قبضہ کر لیا تھا۔ کرنی خدا کی کہ بے بی کے بعد چار بیٹے پیدا ہوئے اور لڑکے چونکہ وارث ہوتے ہیں اس لئے شاہ جی نے بھی انہیں گھر میں رہنے سے نہیں روکا۔ ہماری شادی کے بعد شاہ جی چل بسے تو میدان صاف پا کر ان کی اماں بھی گھر میں آبراجمان ہوئیں۔ ساس کو وہ پہلے دن سے ہی برداشت نہیں کرتی تھی کہ اس کی مطلقہ سوتن اسی ساس کی سگی بھانجی تھی۔ وارد ہوتے ہی اس نے ریاض حسین کے کندھے پر بندوق جمائی' شاہ جی کی نشست و آرام گاہ والے سارے حصے پر دھڑلے سے قبضہ کیا۔ پھر دیوارِ برلن تعمیر کی اور اس کے بعد آئے دن ادھر سے فائرنگ ہونے لگی۔ ان سب معرکوں سے بے نیاز ریاض حسین کھانا بدستور ماں کے ہاتھوں کا کھاتے رہے اور ساتھ ہی 24 قیراط بیوی برخوردار رہے۔ کالیداس بھیا ویسے تو بہت جنگجو مشہور تھے لیکن ایک بار 'بھابی جی' سے ٹکرانے پر پولیس تھانے میں مار کھا چکے تھے لہٰذا چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ منظور شاہ ویسے ہی لاابالی تھا۔ آج یہاں' کل وہاں۔ اس نے سمجھا معاملہ کچھ دنوں میں خود ہی سلجھ جائے گا اس لئے خاموش رہا۔ کھارا تین میں تھانہ تیرہ میں۔ چنانچہ گھر کی باقی عورتیں اپنا اپنا سامان اٹھا کر ایک ایک کمرے میں سمٹ گئیں۔ اسے کہتے ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اک شاہ جی کے نہ ہونے سے گھر کا آنگنا کھاڑہ ہو گیا۔ رہی باہر کی دنیا تو اسے کیا پڑی تھی کہ پرائے پھڈے میں ٹانگ گھسیڑتی۔ یوں دھیرے دھیرے اس گھر کے باسیوں کو اس طرزِ زندگی کی عادت ہو ہی گئی۔

میرا اس خاتون سے آمنا سامنا کافی دیر سے ہوا۔ نام 'حسین بی بی' جسیم قد و قامت' کڑیل اور اپنی ذات پہ پر اعتماد۔ خدا گواہ ہے میری اس نے بہت عزت کی۔ میں حج کر کے آیا تھا۔ "حاجی جی' حاجی جی۔۔۔" کہہ کے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ مجھے اس القاب سے چڑ ہے۔ کیونکہ بیشتر حاجی اس عنوان سے لوگوں کو بلیک میل کر کے عزت بٹورتے ہیں۔ لیکن

اس کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ میں نے اسے نہیں ٹوکا۔ کہتے ہیں گھر پہ قابض ہونے کے بعد ریاض حسین کو اپنی خالہ ساس اور مطلقہ بیوی کی "ہائے" لگ گئی۔ کسی گاڑی نے انہیں ٹکر مار کے پھینک دیا۔ نتیجے میں انہیں لاعلاج 'سوکھا' ہو گیا۔ وہ بستر علالت پہ قریب المرگ تھے۔ حسین بی بی نے حالاتِ حاضرہ کو بغور جانچا اور پھر سرحدی دیوار کے اوپر سے اپنے مغلِ اعظم ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر دونوں ساسوں سے اپنی تعظیم کا تقاضا کیا۔ شام کو وہ ابال ٹھنڈا ہو چکا تو میں نے اسے سمجھایا کہ پہلے اور دوسرے مقام پر اس کی بڑی اور چھوٹی ساس ہیں۔ تیسرے پر اس کا خاوند ہے اور وہ دعا کیا کرے کہ اس کا نمبر چوتھا ہی رہے۔ تب تو وہ میری بات کا وزن نہیں سمجھی لیکن اگلی ملاقات میں وہ بہت روئی کہ وہ "نمبر ون" ہو چکی ہے اور زندگی بہت بوجھ بن گئی ہے۔ میں ان دنوں بیوی بچوں سمیت ڈھوڈووال کے پیر گھرانے کا مہمان تھا۔ حسین بی بی نے اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر میرے آگے پھیلایا اور بہت ٹوٹے پھوٹے ' بکھرے لہجے میں بولی۔

"حاجی جی! بے بی آپ کی بیٹی ہے۔ ریاض حسین اس لئے مر گیا کہ اس کی شادی اپنے بھانجے رؤف صاحب سے کرے گا۔ پچھلی بار آپ بھی بات پکی کرنے اس کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن 'سریا' بی بی صرف تسلیاں دیتی ہے کسی 'تل' پر آتی ہی نہیں۔ اس کی لڑکیوں کو تو خدا واسطے کا بیر ہے۔ بات آگے بڑھنے ہی نہیں دیتیں۔ میرا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ کچھ کریں نا۔!!"

عصمی اس کے ساتھ کھڑی تھی اس نے بھی سر ہلا دیا تو میں نے وعدہ کر لیا کہ اپنی پوری کوشش کروں گا۔ ہم جب بھی پاکستان جاتے بچوں کو بے بی کے حوالے کر کے بے فکر ہو جاتے اس طرح وہ جیسے ہماری بڑی بیٹی تھی۔ ڈال پہ رنگ آتے ہی ثریا پھوپھی کے بیٹے رؤف نے اسے جھلا دیا تھا۔ پچھلی بار میں نے لڑکا لڑکی دونوں کی رضامندی پوچھنے کے بعد بہت

ادب سے بڑی سالی جی سے گذارش کی تھی لیکن انہوں نے اپنی "پیر گھرانے" والی طینت نہ چھوڑی۔ اب میں نے عصمی کا مصمم ارادہ جانچا۔

"اتنے دنوں تمہاری بہن کا نمک کھایا ہے۔ اب معاملہ ایک بیٹی اور مرنے والے کی آرزو کا ہے۔ تم کہو کیا چاہتی ہو۔۔۔؟"

"میں تو اسے اپنی بیٹی مانتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔" وہ دونوں بچپن کے ساتھی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ پہا جی ریاض انتظار کرتے چل بسے۔ میں تو چاہتی ہوں اس کی شادی وہیں ہو۔ چاہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔۔"

اتنا تو میں جان ہی چکا تھا کہ ہر پیر گھرانے کی طرح وہاں بھی لکشمی اور اس سے جڑی خواہشات کی پوجا ہوتی ہے۔ مرد صرف بیٹھک کے اندر ہی حضرت پیر فلانہ فلانہ ہوتے ہیں۔ اور گھر کی چاردیواری کے اندر فقط 'پیرنیوں' کا سکہ چلتا ہے۔ میں ان کا مہمان سہی اور میری زبان بھی بلاشبہ حدِ ادب کی پابند رہی لیکن بیدار آنکھ کو دیکھنے سے کون روکے؟ چنانچہ میں بھی اپنا ایک اندازہ مقرر کر چکا تھا۔

"اس رشتے کی سب سے زیادہ مخالفت کون کر رہا ہے۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

عصمی نے بے بی کو بلا لیا۔ عجیب بات ہے کہ پیروں کے اس گھر میں عورت مرد سبھی "صاحب" کہہ کر بلائے جاتے ہیں۔ مثلاً" ایرے صاحب' غیرے صاحب' نتھو خیرے صاحب' رانے صاحب' پہانے صاحب' وغیر ہو غیرہ۔ جھوٹے بھرم ہیں کہ یوں مریدوں پر رعب پڑتا ہے۔ اور وہ سر جھکائے رہتے ہیں۔ بے بی آئی اور اس نے نام بتایا۔

"گوشے صاحب۔۔۔" اور میرا اندازہ رتی بھر بھی غلط نہیں تھا۔

گھر کے ارد گرد کھیتوں کھلیانوں میں کئی کئی انچ پانی جمع تھا۔ چاول کی فصل تیار ہو رہی تھی۔ ارد گرد اپلے بھری دیواروں سے اٹھنے والی گندھ' اور حبس اتنا زیادہ تھا کہ چھت پہ کھلے آسمان

بھی جی متلا جائے۔ اک روز سفید بادل اٹھے تھے کہ میرے ذہن میں روئی کے نرم نرم گالوں جیسی برف بچھنے لگی۔ سنجیدگی سے کوئی بات کرنی ہو تو موسم ایسا ہونا چاہیئے کہ ماحول بنانے کی بجائے' آدمی کا دل خود ہی کچھ کہنا' کچھ سننا چاہے۔ تبھی میں نے مری ہلز کا پروگرام بنالیا۔ ویگن کروائی۔ پھر بھی پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ ہوٹل میں ٹھہرے۔ سفر کی تھکان اتنی زیادہ تھی کہ بچوں کو سلاتے سلاتے عصمی خود بھی انہی کے ساتھ سو گئی۔ پیرنی اور میں بہت دیر تک باہر ٹیرس پہ دھند' بوجھل بادلوں میں ہولے ہولے بھیگتے اپنی کہانیاں سنتے سناتے رہے۔ کمرے میں لوٹے تو نیند نے اس کی پلکوں پر بسیرا کر رکھا تھا اور مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ تب میں نے کہا' اس نے سنا اور دھیرج سے وعدہ کر لیا کہ وہ مخالفت نہیں کرے گی بلکہ خود ان کی شادی کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ تھکے تھکے لمحوں کا یہی تو کمال ہے کہ مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی خود ہی چپ چاپ ہار جاتا ہے۔

واپسی لوٹے تو اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ رشتے شادی کی پھر بات چلی لیکن اس بار ثریا بی بی کا ساتھ کسی نے نہیں دیا۔ ہلکی سی ٹال مٹول' حیلے بہانے ہوئے۔ گھر میں سے مخالفت کا کوئی ووٹ نہ آیا تو اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ شادی کی تاریخ ہفتہ دس دن بعد مقرر ہوئی۔ اُدھر ہماری واپسی سیٹیں دوبئی ہی سے' شادی سے پہلے کنفرم تھیں۔ پیرنی نے بہت چاہا کہ میں بھی ان خوشیوں میں شامل ہوں لیکن ایسا ممکن نہ ہو پایا۔ بہرکیف میرا 'مشن امپاسبل' پورا ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے ایک خواہش کی کہ میں اس کے چھوٹے بھائی کو دوبئی بلالوں۔ اس کے لئے کچھ کروں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ ہمارے بیچ اکثر شعر و شاعری' ادبیات موضوع رہتی تھیں اور میرے دماغ میں ایک لیکھک مچل رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اگر میں تم پہ اک کہانی' اک کتاب لکھوں تو۔۔؟"

"ہائے سچی لکھیں نا۔۔۔" وہ سچ مچ سنجیدہ ہو گئی۔ مچل کر ہاتھوں کی جنبش سے اس نے اپنی بیتابی ظاہر کی۔ "میں سب کو فخریہ بتاؤں گی کہ یہ کتاب مجھ پہ لکھی گئی ہے۔۔۔"

پھر اس کا بھائی دوبئی آ گیا اور معقول ملازمت پر بھی لگ گیا۔ میں نے مری تک اس سفر کو 'چاہتوں کا سفر' بنا دیا اور عرصہ بعد ملاقات ہوئی تو اسے دے دیا۔

پنجابی کی اک بہت مشہور ضرب المثل ہے۔ کہ ماں بیٹے کے لئے روز دعائیں مانگتی تھی۔ "بڑا ہو کر تو تھانیدار بنے۔" پتہ نہیں بیٹا اس پر خوش ہوتا تھا یا نہیں لیکن ایک روز اس نے ماں کو جواب دیا کہ۔

"تاں نی ماں! جدوں میں تھانیدار بناں گا' تے سب توں پہلے تیرا چونڈا پٹاں گا۔۔۔"

چنانچہ بے بی شادی کے بعد 'بے بی صاحب' ہو گئی تو ہمیں بھی ہمارے کرموں کا پھل ملنے لگا۔ ان پیروں کے پاس عصمی اور میرا 'برسوں میں کمایا' بنایا کم از کم ایک کروڑ روپے سے زیادہ مالیت کا گھریلو سامان امانت رکھا تھا۔ عصمی کی بڑی بہن ثریا بی بی اس کی امین تھیں۔ چونکہ ہمارا دوبئی سے آنا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ اس لئے دیکھ ریکھ' دھوپ لگوانی انہی کے سپرد تھی۔ خدا جانے ان کی زندگی میں بھی کوئی کیڑا لگا' یا نہیں لیکن اپنے آخری ایام میں شاید انہوں نے سوچا کہ بیٹیوں نے تو بیاہ کر اپنے گھر چلے جانا ہے اس لئے ہمارے سامان کی چابیاں 'بے بی صاحب' کے پلو سے باندھ دیں۔ ہم تو بہت خوش ہوئے کہ اس نے جلد ہی اس گھر کا اعتماد جیت لیا ہے۔ لیکنیہ نہ جانا کہ سسرال میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جمانے کے لئے اس نے بمصداق۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔۔۔ ہمارا ہی سامان دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا تھا اور یوں محاورۃً" سسرال پہ چھا گئی تھی۔ پیرنی اور اس سے بڑی بہن کی شادیوں میں دیالو' دیا دان نے ہمارے ہی سامان میں سے ان کا من پسند جہیز دیا۔ بیش قیمت زنانہ' مردانہ سوٹ'

کمبل اور ڈنر سیٹ' ککنگ سیٹ' ہوم میوزک سسٹم' ڈیک' وی سی آر' سب نکل گئے۔ آدمی کی فطرت بھوکی ہے۔ جس کے پیٹ میں کچھ پہنچ جائے وہ اسے اگلتا نہیں' منہ بند کرلیتا ہے۔ اس کے علاوہ اِدھر اُدھر نئی رشتہ داریوں کی نذر نیاز چوکی اور رسومات نبھانے کے لئے بھی اسی سے رجوع ہونے لگا۔ ملکہ وکٹوریہ نے کہا۔ "آنٹی کو کیا پتہ کیا کچھ ہے اور کیا گیا۔۔۔؟"

وہ آستین کی سانپ ہمیں اور ہماری کمزوریوں کو واقعی زیادہ جانتی تھی۔ ہم دوبئی میں اس پر اعتماد میں اندھے بہرے رہے اور وہ سسرالیوں کو اپنی پالنے والی ماں کا گوشت نوچ نوچ کھلاتی رہی۔ کبھی عصمی مختصر دورانیے پہ پاکستان گئی تو اس نے لارالپا' تسلیاں دے دیں کہ کچھ روز پہلے سامان کی پڑتال کی تھی۔ سب ٹھیک ہے۔ تھانیدار اس کا اپنا تھا اس لئے وہ مطمئن ہو جاتی۔ اسی دوران ثریا بی بی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور بے بی سفینہ عرف 'بے بی صاحب' بلا شرکتِ غیرے وزیرِ خزانہ اور پردھان ہو گئی۔

مشہور ہے کہ سپیرے کی موت اکثر اسی کے دودھ پلائے سانپ سے ہوتی ہے۔ بے بی کا راج پاٹ مضبوط ہو گیا تو پھر آگے جو ہوا وہ اٹھارہ بیس سالوں پہ پھیلی داستان ہے۔ جو کوئی ہمیں اس لوٹ مار کی خبر دے سکتا تھا اس کا منہ بھی بخشیش سے بند کر دیا گیا۔ سب نے ہی جی بھر کے گنگا نہالیا۔ کینسر دوران' اس کے بلانے پر عصمی بوبی کے لئے رشتہ دیکھنے پاکستان گئی تو اس کے پاس تقریباً" بارہ تولے زیور بریسلٹ' پینڈنٹ' چین' جھمکے وغیرہ امانت چھوڑ آئی کہ بار بار لانے لیجانے نہ پڑیں۔ وہ سب پی گئی۔ اس کے میاں "رؤف صاحب" نے خالہ گوگی سے اینٹوں کا بھٹہ لگانے کے لئے ڈالر' یورو اور پاکستانی روپے کی صورت میں تین لاکھ کا قرضہ لیا۔ شدید علالت کے دوران عصمی وہ پیسے مانگتی رہی اور یہ ٹیلیفون پہ "آواز نہیں آرہی' کا ناٹک کھیلتے۔ کسی کے ذریعہ انہیں پیغام بھیجا تو اسے کہہ دیا "یار تم کہہ دو مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔" صرف اس لئے کہ وہ چل بسی تو کون سا قرضہ' کون سے پیسے؟ اور پھر وہ سچ مچ اللہ کو پیاری ہو گئی اور خود میں نے ٹیلیفون کیا تو جواب ملا۔ "کون سے پیسے؟ مجھے اس وقت بچوں کو

سکول لے جانا ہے بعد میں بات کروں گا۔۔۔" لائن کٹ۔ وہ 'بعد' آج تک نہیں آیا۔ ان اونچے پھریرے والوں کا چلن دیکھ کر کوٹلی امیر علی والی بہن مقبول بی بی نے بھی دو بیٹیوں کا جہیز گوگی بی بی کی پیٹیوں سے نکال لیا۔ اور بیٹے کو اڈے پر دو کان کھول کر دینے کے لئے جو دو لاکھ روپے کا قرضہ لیا تھا وہ ہضم کر گئے۔ وزیر آباد میں بھائی کھارے نے ساری زندگی بہنوں کو کھایا ہے۔ تین بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا کر کے سارا دن گھر کی عورتوں بیچ بستر پہ اینڈ تا اور روٹیاں توڑ تا رہتا ہے۔ گوگی بی بی کے ایصالِ ثواب کے لئے نیاز دلائی گئی۔ اس کی بیوی ڈونگا ہاتھ میں لئے اپنی بیٹیوں کے لئے ڈھیر ساری "بوٹیاں" ڈالنے کا کہہ کے مجھ سے بولی۔" گوگی باجی نے تو ہماری بیٹیوں کی شادیوں پر سارے خرچے کا ذمہ لیا تھا۔ اب ہمارا کیا بنے گا۔۔۔"
وہ مجھ سے اس نامعلوم عہد نامے کی تجدید لینے آئی تھی۔

ڈھوڈووال کا پیر گھرانہ بہت آن' بان اور شان والا ہے۔ کاش ARY کے اقرارالحسن نے 'سرعام' میں ایسے پیروں کو بھی بے نقاب کیا ہوتا جو نسلوں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ Hi-Tech لوگ پیر گھرانہ کہلاتے ہیں کیونکہ سارا ٹبر ہی پیر ہوتا ہے۔ عقیدتمند ان کے گھروں میں خدمتگار ہوتے ہیں۔ اپنے گاؤں اور اگلے کئی گاؤں کے محنت کش 'سادہ لوح لوگوں' مریدوں کی جیبوں فصلوں اور رزق پہ ان کا پیرانہ لگان و سود عائد ہوتا ہے۔ ڈھوڈووال کے پیر گیلان کے بزرگوں سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ جنت بانٹتے ہیں۔ ساری مشکلیں آسان کرنے' امتحان میں پاس کروانے' اور ملازمت دلانے والے تعویز کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ (سوائے چھوٹی پیرنی کے) کوئی دس بارہ سے آگے نہیں پڑھا چنانچہ خود ڈھنگ کی ملازمت پانے کے لئے ان کا کوئی کالا چٹا عمل کام نہیں آیا۔ اس گھر کے ٹارزن بڑے بھائی جان ہیں۔ باقی بھائیوں نے ان کے گرد حصار بنا رکھا ہے جیسے وہ گاماں پہلوان ہیں اور ان تک پہنچنے کے لئے چھوٹے پہلوانوں سے ہو کر گذرو۔ یہ میٹرک پاس ہوئے تھے کہ والد چل بسے۔ تعلیم منقطع ہو رہی تھی۔ میں نے کفالت کی ذمہ واری لی کہ جہاں تک پڑھنا

ہے میں پڑھاؤں گا۔ لیکن کسی نے ان کے کان میں فتور ڈال دیا۔ چنانچہ صاحب پہلے پیر بنے۔ پھر اس زمانے میں ایک جیتنے والی سیاسی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سفارشوں سے ٹکٹ بھی مل گیا اور جیت کر علاقہ تھانیدار ہو گئے۔ سیاسی لیڈروں کے ساتھ اٹھک بیٹھک میں سرکاری افسران سے تاریں بھی مل گئیں اور ان کے سہارے انہیں گاؤں والوں کو اپنی میٹرکانہ شخصیت سے مرعوب کرنے کا ڈھنگ بھی آ گیا۔ سر پہ جناح کیپ رکھ کر گھر سے نکلتے کہ اس طرح بڑی ہستی سمجھ کر لوگ سلام کرتے ہیں۔ گلی محلے کے علاوہ اڈے پر بھی لوگ اپنے سر کے رومال سے کرسی صاف کر کے پیش کرنے لگے۔ انہوں نے کبھی کسی میٹرک پاس کی ایسی شان و شوکت دیکھی نہ تھی۔ اسی ادا پہ جی جان سے سیاست کے عاشق ہو گئے۔ اگلی بار الیکشن ہارے تو دل ایسا ٹوٹا کہ فراقِ یار میں شوگر کی بیماری لگ گئی۔ آزردہ دل سیاسی گھوڑا بن کر دوسری پارٹی میں گھس گئے۔ لیکن انہوں نے ٹکٹ نہ دی۔ بس دل کے ٹکڑے ہزار ہو گئے۔ کوئی یہاں گرا' کوئی وہاں گرا۔ اب ہر مولانا کے ساتھ کم از کم ایک مرید اور ہر سیاسی تھانیدار کے ساتھ ایک ' تاجا' حوالدار تو ہوتا ہی ہے کہ وہ حضرت کے کمال و جلال سے لوگوں کو مرعوب کرے اور ایسے دردناک وقت میں ان کی کامیابی و کامرانی کے لئے منصوبہ بندی بھی کرتا رہے۔ چنانچہ ان بڑے بھائی جان کے پاس بھی ایکنوٹنکی تاجا "رؤف صاحب" "بھٹے والا" ہے جو اچانک محفل میں سراسیمگی پھیلاتا ہے۔ "اوئے! بھائی جان آ گئے۔" بالکل ایسے جیسے عورتیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔ "چپ کر جا۔ بھؤ آ گیا اِی۔۔۔" اس نہلہ دہلہ گروپ میں جب سے بے بی صاحب نے قدم رنجہ فرمایا سونے پہ سہاگہ ہو گیا۔ پہلے تو انہوں نے گھر میں چوری کا ڈرامہ سٹیج کیا جس میں کافی زیور اور دیگر قیمتی اشیا کا نقصان بتایا گیا۔ یعنی ہمارے امانت سامان کا تیا پانچا ہو گیا۔ بھلا پوچھے کوئی۔ کہ پاکستانی پشتینی پیروں کے گھر آگے سے تو ابلیس بھی آنکھیں' کان اور منہ ڈھانپ کر گزرتا ہے ان کے آنگن' کمروں میں کوئی جہنم چرائے گا کیا؟ بہر کیف پہلا مرحلہ طے ہو گیا۔ اب ڈر تھا کہ ہم پوچھ بیٹھے تو؟ لیکن وائے

قسمت کہ فائرنگ رینج پر بوبی کے لئے رشتہ ڈھونڈتی خالہ انہیں نظر آگئی۔ تاجا حوالدار ڈائریکٹر بنا اور بے بی صاحب نے کھچڑی کہانی چولہے چڑھادی کہ سیالکوٹ کے قریبی گاؤں میں بہت باعزت گھرانے کا ایک رشتہ ہے۔ پیروں کا ترپ کا یہ پتہ چل گیا انہوں نے حاجت مند کو ممنون و مشغول کر دیا۔ اب احسان تلے دبی خالہ سامان کی کچھ خرد برد تو سہہ ہی لے گی باقی پروگرام اس بیل کے منڈھنے پر تشکیل پا جاتے۔ مجھے پتہ چلا کہ ہونے والے رشتہ دار بھی پیر گھرانہ ہیں۔ شاہ صاحب ہیں اور ان کے ہاں عرس بھی منائے جاتے ہیں تو میں ذہنی طور پر کچھ بے آرام ہو گیا۔ میرا اپنا سلسلہ نسب نویں پیڑھی پہ اُچ شریف میں سید ھا سید جلال الدین سرخ پوش بخاری سے جا ملتا ہے لیکن میرے والد نے مجھے یہ سمجھایا تھا کہ اپنے بزرگوں کا فخر بن سکتے ہو تو ان کا نام لو۔ ورنہ ان کے حوالے سے لوگوں کے رزق میں حصہ بٹورنا گناہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں انگریزوں' امریکنوں میں بھی کوئی پیر فقیر ہوتے ہیں یا نہیں؟ عربوں میں رہتے مجھے پینتالیس سے زیادہ سال ہو گئے۔ ان میں تو نہیں ہوتے۔ چونکہ گنگا انڈیا میں سیدھی اور صرف پاکستان میں اِلٹی بہتی ہے اس لئے یہاں کا ہر نکھٹو پیر یا فقیر بن جاتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کی چوکھٹ پہ ماتھا ٹیکنے والے بھی ایک ڈھونڈو' ہزار ملتے ہیں۔ یہی وہ سر زمین ہے جہاں مرے ہاتھی کی قیمت سوا لاکھ ہوتی ہے۔ اور جہاں کئی مزاروں کی قبروں سے فقط درختوں کے تنے یا جانوروں کے ڈھانچے بر آمد ہو چکے ہیں۔ آج تو مزار پرستی ایک مافیا ہے کہ ان کی آڑ میں نت نئے دھندے ہوتے ہیں۔

پھر ایک روز ارجنٹ بلاوہ آگیا کہ وہ لڑکی کے گھر والوں سے بوبی کے بارے بات کر چکی ہے لہٰذا جتنی جلدی ہو آ جائیں۔ بوبی ویسے ہی کچھ دنوں کی چھٹی پر تھا۔ عصمی تیار ہو گئی اور مئی میں ہم پاکستان آ گئے۔ بے بی صاحب اور تاجا حوالدار اپنے ایک چچا کے ہمراہ آئے اور ہمیں ساتھ لے چلے۔ لاہور ہی میں ملاقات ہوئی۔ عصمی زنان خانہ چلی گئی اور میں' بوبی اور میزبانوں کے ہمراہ مردانے میں۔ تبھی مجھے معلوم ہوا صاحبِ خانہ سیاسی شخصیت بھی ہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ ان کے تو "اگاڑی اچھی نہ پچھاڑی"۔ یہ کہاں آ گئے ہم؟ اب آئے تھے تو بیٹھنا ہی پڑا۔ وہ لوگ آپس میں شناسا تھے۔ سیاست کی باتیں کرتے بیچ بوبی سے کوائف بھی پوچھتے رہے۔ مجھے سلام علیکم کے علاوہ کسی نے اتنی بھی لفٹ نہیں کروائی کہ۔ "ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل کیا کر رہے ہیں۔۔۔؟" البتہ معلوم تھا کہ بدلتے معاشرے میں "بندہ قابو کرنا" کا رواج عام ہو رہا ہے۔ خاموشی سے تماشۂ اہل کرم دیکھتا رہا۔ اتفاق سے پیر صاحب کی بڑی بیٹی آ گئیں۔ کوئی بات ہوئی اور انہوں نے اظہارِ خیال فرمایا۔ "میں کئی بار دوبئی گئی ہوں لیکن مجھے وہ پسند نہیں آیا۔ ان عربوں کو کسی چیز کا پتہ کیا ہے۔۔۔؟" مجھے بس خوامخواہ ہی برا لگ گیا۔ میں نے ساری عمر عربوں بیچ جھک ماری تھی کیا؟ معلوم نہیں ان لوگوں کو زعم کس بات کا ہے کہ یہی سب کچھ بہتر جانتے ہیں؟ جیسے ساری دنیا کے تمام علوم پہ ان کی اجارہ داری ہے۔ ہر معاملے میں عجب ہٹ دھرمی ہے بھارت کے دانت کھٹے کر دینے کا دعوی کرتے ہیں اور اپنے دانت آج تک اتنے میٹھے نہیں کر سکے کہ کسی کانفرنس میز پہ بیٹھ کر ان سے اپنے دریاؤں کا پانی ہی واپس لے سکیں۔ اسی خلیفہ ذہنیت نے ہمیں ڈبویا ہے۔ میں نے گلا صاف کیا اور بولا "آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ جہاز سے اترتے ایرپورٹ پر ہی ان کی برتری نظر آ جاتی ہے۔ اچھی حکومت کے عوامل کو جس اچھے طریقے سے وہ جانتے ہیں ہمارے ہاں کہیں نظر آتا ہے کیا۔؟" میں نے ایک دو مثالیں دیں۔ محترمہ ناراض سامنہ بنا کر نکل گئیں اور میں اٹھ کر باہر کار میں آ بیٹھا۔ بوقتِ رخصت غالبا" تاجے حوالدار کے چچا نے اس امر کی نشان دہی کی کہ "لڑکے کو تو آپ نے دیکھ لیا ہے اب اس کے والدین کو ہی لڑکی دکھا دیں۔۔۔" چنانچہ مجھے دوبارہ طلب کیا گیا۔ فیصلہ تو بوبی نے کرنا تھا یا اس کی ماں کی سمجھ بوجھ نے۔ میرے ذہن میں تو تاجے حوالدار و بھائی جان کے سیاسی مقاصد کی تصویر واضح ہو رہی تھی۔ دور نزدیک کی رشتہ داری بھی تھی۔ یہ رشتہ ہو گیا تو آنے والے الیکشن میں شاہ صاحب ٹکٹ دلوا ہی دیں گے۔ بہر کیف انہوں نے فورا" ہی ہاں نہیں کی۔ ہم دوبئی واپس لوٹ آئے تو ڈھوڈو وال

سے تقریباً" روزانہ ہی ٹیلیفون آنے لگے۔ ہمیں دھیرج رکھنے کی تلقین ہوتی۔ جب تک بات پکی نہ ہو جائے کسی کو بھنک نہ پڑنے دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس رشتے کے بارے باغ و بہار بہشتی مناظر دکھائے اور سمجھائے جاتے۔ دوسری طرف میں اپنی جگہ عصمی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ ایک تو پیر اور دوجے سیاسی شخصیت 'ان کے گھروں میں داماد کی حیثیت' تاش کے پتوں میں حکم کے غلام جتنی بھی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔ لیکن وہ میری کسی بات پہ دھیان نہ دے رہی تھی۔ اسی بیچ کیمو کی تیسری لائن بھی فیل اور 20 جولائی 2011 سے چوتھی لائن شروع ہو گئی۔ اگست میں مارکر 436.8 پہ جا پہنچا اور لگتا تھا کہ کیمو کا چوتھا کورس بھی ناکام ہو رہا ہے۔ بال پھر جھڑ گئے۔ شاید کسی دوائی کے اثر سے پشت کی جلد نیلی پڑ گئی اور کئی جگہ سے گوشت پھٹنا شروع ہو گیا۔ سی ٹی سکین نے بتایا کہ کینسر نے پھیپھڑوں کو پہلے سے زیادہ متاثر اور سر کی ہڈیوں کو کھرچنا شروع کر دیا تھا۔ چہرے کی رنگت جل گئی۔ ہیئت بدلنے لگی اور بڑھاپا یکبارگی اس کے نقوش کو نگلنے لگا تھا۔ بائیں جانب ہونٹ اور مسوڑے سن اور ذائقہ مفقود ہو چکے تھے اور ہلکی سی لکنت بھی آگئی تھی۔ اس درد کو میرا خدا جانتا ہے یا میں' جس کے ہاتھوں سے ساتھی کا ہاتھ پھسل رہا تھا اور کیسی یہ بے بسی تھی کہ میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ستمبر 2011 میں پاکستان سے بلاوا آگیا۔ اِدھر وہ تھی کہ ایسی حالت میں بھی اس نے بوبی کا ہاتھ پکڑا اور پاکستان جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ یوں لگتا ہے جیسے جسم میں کم ہوتی مدافعت کے ساتھ اسے علم تھا اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے چنانچہ اسے ہر کام کی جلدی تھی۔ بوبی کسی متوقع رسم کے پیشِ نظر مجھ سے سالیٹیئر ڈائمنڈ انگوٹھی کے علاوہ ایک ہیرے جڑی کلائی گھڑی بھی احتیاط" ساتھ لے گیا۔ وہاں سے خبر ملی کہ صاحب نے دونوں ہی پہنا دی ہیں اور منگنی ہو گئی ہے۔ بہر کیف وہ واپس لوٹے تو پتہ چلا اگلے ماہ دادا پیر صاحب کا 'چھوٹا عرس' ہے۔ اس سے دو دن بعد گاؤں ہی میں رسم نکاح ہو گی اور اگلے سال مارچ میں "بڑے عرس" کے بعد رخصتی ہو گی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ " تم

نے کسی امریکن لاٹری کا 'جیک پاٹ' جیتا ہے کیا؟" بھئی کسی ایک عرس سے ہی کام چلا لیتے۔
! لیکن بیٹا راضی اور اس کی اماں خاموش' تو میں کیا کرتا؟ اپنے آپ کو تسلی دی کہ شہنشاہ اکبر
نے ہاتھی انعام دے کر دروازہ بڑا کرنے کی ہدایت جاری کر ہی دی ہے تو کورنش بجالا اور
چپ چاپ چڑھ جا بابا سولی پہ ' رام بھلی کرے گا۔

اب دوبئی میں نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں اور اُدھر سیالکوٹ وزیر آباد میں جیسے ٹیلیفون
لائینیں فری ہو گئیں۔ بے بی صاحب کا جھنڈا ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی کوئی دس فٹ اوپر
پھریرا لے رہا تھا۔ وہ تقریباً" روزانہ ہی ڈائری لیتی' دیتی۔ دلہن اور اس کی بڑی بہن لاہور
میں اپنے ملبوسات کی تیاری کروا رہی ہیں۔ وہ ان کے پیغامات بھی نشر کرتی۔۔۔ "فلاں فلاں
چیز لے کر آنا۔ میں نے فلاں رنگ کا لہنگا سیٹ سلنے دیا ہے۔ زیور بھی اسی سے میچنگ ہو گا۔
اپنی شادی کے لئے میرے بہت ارمان ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔" بڑی بہن جی کا سندیسہ تھا کہ
زیور ساتھ لے کر آنا۔ بارہ چوڑیاں ہوں۔ پتلی نہ ہوں۔ دونوں ہاتھوں کے دو دو کنگن
ہوں۔۔۔ ٹیلر کو لہنگا سیٹ کا ایڈوانس دینا ہے کسی کے ذریعہ جلد پیسے پہنچوائیں۔۔" عصمی
نے لاہور میں اپنے بھتیجے کو ادائیگی کے لئے کہہ دیا۔ بعد میں ساڑھے چھ لاکھ روپے کے بل
میں نے لوٹائے۔ سیاسی اور غیر سیاسی دوگھروں کا بازیچہ میرے آگے بچھا تھا۔ میں مہروں کی
چالیں دیکھتا رہا۔ اک اور طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ فلانے فلانے مقدموں اور جھگڑوں میں
پھنسے ہمارے نت نئے رشتہ دار بھی مبارکیں پیش کرنے لگے۔ یوں لگا جیسے ہم کرکٹ کا ورلڈ
کپ جیت لائے ہوں۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ اس خوشی کے موقع پر عدیل کی بیوی 'شرمین "پہلے گھر کا' اور پھر قافلے
کا حصہ بن گئی۔ تقریب سے پانچ دن پہلے ہم لاہور پہنچ گئے۔ ہوٹل کی بکنگ ہم دوبئی سے ہی
کر چکے تھے۔ ائیر پورٹ سے ہمارا اپنا بندوبست تھا لیکن شاہ صاحب کا پہلے ان کے آستانے پہ
حاضری کا اصرار تھا۔ وہاں پہنچے تو چائے پلا کر منگنی پہ تیاری کے لئے تمام زیور اور دیگر سامان

پیشگی طلب کر لیا گیا۔ مجھے اس طریقہ کار پہ سخت تکلیف پہنچی۔ ابھی تو ہمارا سامان باہر گاڑی کے ٹب میں لدا ہوا تھا لیکن وہاں تو وطیرہ یہ تھا کہ دنبے کو پانی وانی پلا دیا ہے اب گراؤ اور ذبح کرو۔ مجھے پل پل عصمی کی طبعیت کا خیال تھا۔ نقصان جو بھی ہو جائے اسے ذہنی انتشار سے بچانا تھا۔ جب اس نے کہہ دیا تو سڑک پہ کھڑے ہو کر میں نے سامان کھلوایا اور زیور کا ڈبہ لا دیا۔ مجھے پتہ تھا سیاستدانوں سے رشتہ داری کے انداز یہی ہیں۔ چوڑیاں دیکھتے ہی دلہن کی بڑی بہن نے بہت ناگواری سے فرمایا۔ "یہ تو پتلی ہیں۔ میں نے تاکید کی تھی کہ موٹی ہونی چاہئیں۔ انہیں بدلوا کر دیں۔ اور کنگن کہاں ہیں۔۔۔؟" یوں لگتا تھا جیسے اس نے کوئی نہ کوئی بدمزگی پیدا کرنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ شاید اس نے گذشتہ بار اپنی بات سے میرے اختلاف کا غصہ ابھی تک دل میں بسا رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے اندر بنتے غبار کو دبایا اور بولا۔ "یہ داماس جیولرز کی سب سے حالیہ فیشن چوڑیاں ہیں۔ بارہ ہیں اور بارہ تولے سے کم نہیں۔ آپ کو پسند نہیں تو دے دیں۔ واپس جا کر بدلوا لوں گا۔ رہے کنگن' تو وہ آپ کو رخصتی کے موقع پر ملیں گے۔۔۔" سکولوں کالجوں میں بی ایس سی کلاسز تک پڑھایا ہے۔ کامن ویلتھ ٹیچروں اور دنیا کی درجنوں قوموں کے ہزاروں جوان اور بوڑھوں سے سالہا سال میرا رابطہ رہا ہے۔ ان کی نفسیات اور اپنے قیاسات و قیافہ پہ اعتبار ہے۔ مجھے معلوم تھا آگے کیا ہو گا۔ چنانچہ دو ہی پل میں انہیں لابی سے اندر طلب کر لیا گیا۔ دلہن کے لئے لائے ہوئے بیش قیمت سامان کا سوٹ کیس اور زیور سب کچھ ہی قبول ہو گیا۔ پتہ چلا اب ساری دنیا ہی سیانی ہو گئی ہے۔ ہاتھ آئے کبوتر کو کوئی نہیں چھوڑتا۔

اگلے روز ایک گندامندا' میلا کچیلا سا آدمی ہوائی چپل پہنے ہوٹل اپارٹمنٹ میں آن وارد ہوا۔ پتہ چلا انہی محترمہ کا ڈرائیور ہے اور وہ لہنگا سیٹ کی بقایا رقم ساڑھے تین لاکھ روپے وصول کرنے آیا تھا۔ میں نے چیک دے دیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ بعد وہ پھر آ گیا کہ کیش لا دیں ٹیلر کو بقایا ادائیگی کرنی ہے۔ سیاسی لوگ دوسرے کے چیک پر دستخط کر کے اپنا ثبوت نہیں چھوڑا

کرتے۔ ہم چونکہ ہولے ہولے ڈراپ سین کی طرف بڑھ رہے تھے لہٰذا طوعا" وکرہا" مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ تقریبا" چار بجے وہ پھر آیا اور کیش رقم لے گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ڈرائیور کو ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اس کے بعد ہی ملا ہو گا۔

اگلی رات اچانک ہی بے بی صاحب' تاجا حوالدار اور ان کے چچا آ گئے۔ ان کے چچا سے میری دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ وہ ایک انتہائی شریف النفس انسان ہیں۔ میں تب بھی ان کی عزت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں۔ وہ بیمار تھے اور یہ جب' جہاں' جدھر چاہتے تھے انہیں گھسیٹ رہے تھے۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی بیٹی اس گھر کی سب سے چھوٹی بہو ہے۔ ان میاں بیوی کو دیکھ کر خدا جانے کیوں' مجھے لگا کہ کچھ کسر رہ گئی ہے اور آخری مرحلے پر وہ بھاگتے چور کی لنگوٹی جیسی مراعات بٹورنے آئے ہیں۔ ہم ہمہ تن گوش ہو گئے۔ تاجے حوالدار صاحب بروکر بن گئے۔ "اچھا بھائیجان۔! حق مہر پچیس لاکھ روپیہ ہو گا۔۔۔" شاید شاہ صاحب گھریلو معاملات اور رشتہ داریوں میں بھی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ ابھی گذشتہ شام ہی تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کے والد اور شرعی نگران تھے یہ تمام معاملات طے کرنا ان کا حق بنتا تھا۔ تب زیور اور دیگر سامان بیٹی نے وصول کیا۔ اب یہ تاجا حوالدار آ گیا۔ یوں شاہ صاحب کہہ سکتے تھے انہیں تو کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ لیکن اس آدمی کا لہجہ و انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے اپنا قرضہ وصول کرنے آیا ہو۔ میرے نزدیک وہ بدتمیزی کی اور میں برداشت کی حدوں سے آگے نکل گئے تھے اور اب اسے لگام ڈالنی ضروری تھی۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن مجھ میں اپنے اباجی والا دھیرج نہیں تھا اس لئے اس بار میں نے اسے ٹھپ دیا اور ایک سیدھا سادہ مختصر سا جواب دیا۔

"میں سمجھوں گا بچوں کے ساتھ لاہور گھومنے پھرنے آیا تھا۔ جو نقصان ہو چکا سو ہو گیا۔ اب اور بلیک میل نہیں ہوں گا۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔ ابھی یہ تماشہ ہو رہا ہے تو آگے میرے بیٹے کے ساتھ کیا ہو گا میں سمجھ سکتا ہوں۔۔۔"

وہ اپنے سارے تخمینے اور ساری چالیں رٹا لگا کر آیا تھا۔ اس نے کافی پینترے بدلے' چچا بیچارے نے بھی ایک دو بار کوشش کی لیکن میرا جواب ایک ہی تھا۔ "یہ شادی نہیں ہو گی۔۔۔" واضح پتہ چل رہا تھا کہ ان لوگوں کے بہت سے مفادات کسی بڑے خطرے میں تھے۔ بے بی صاحب آنٹی جان کی منتیں کرتی' ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ "بہت نقصان ہو جائے گا بات مان لیں۔۔۔" خدا جانے یہ ہمیں دھمکی تھی یا چکمہ یا کچھ اور؟ میں بس اس کا منہ دیکھتا سوچتا رہا۔ یوں جیسے میں اسے جانتا نہیں تھا اور پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے بالکل قصاب کردار' بردہ فروش لگی جو اپنے کسی مفاد کی خاطر ہمیں عذابوں میں دھکیلنے کو تیار تھی۔ عصمی نے یہ اپنے بھائی کی بیٹی پالی تھی یا ڈائن؟ بہر کیف اسے جواب مل گیا کہ فیصلہ باپ نے کرنا ہے۔ یہی فیصلہ بوبی نے بھی سنا دیا چنانچہ تقریباً" تین' ساڑھے تین گھنٹے ہمارا مغز چاٹنے کے بعد' وہ لوگ اپنی بات منوانے میں ناکام رخصت ہو گئے۔ مجھے یقین تھا لاہور ہی میں اپنے ہیڈ کوارٹر گئے ہوں گے کیونکہ دو گھنٹے بعد وہ پھر آ دھمکے۔ اس بار بے بی صاحب ساتھ نہ تھی۔ ہمیں یہی کہا کہ سیالکوٹ میں مشورہ کر کے آئے ہیں۔

"اچھا بھائیجان!۔۔۔" تاجے حوالدار نے کہا۔ مجھے سمجھ نہ آیا میں اس کا بھائی کس رشتے سے بنا؟ "آپ حق مہر پندرہ لاکھ کر دیں لیکن لڑکی کا جیب خرچ چار ہزار درہم ماہانہ مان لیں۔۔۔"

میرا جی چاہا تاجے حوالدار کو اٹھا کر اوپر والی منزل سے نیچے پھینک دوں۔ لیکن تبھی وزیر آباد والے شاہ جی کی شیرنی دھاڑی۔

"کیوں میں قطرینہ کیف کو بیاہنے آئی ہوں؟" عصمی نے کہا "اور تم میاں بیوی میری طرف سے یہ رشتہ کروا رہے ہو یا ان کی طرف سے؟ ادھر سے تمہیں کتنا کٹ ملا ہے۔۔۔؟" لیکن ان کی کھال بہت موٹی تھی وہ شرمسار نہیں ہوئے۔

"تمہیں پتہ ہے چار ہزار درہم کتنا ہوتا ہے۔۔۔؟" اس خاموشی کو میں نے توڑا۔ " کل کلاں اگر وہ ضد کر کے مائیکے میں بیٹھ جائے کہ میں نے پاکستان ہی میں رہنا ہے تو میں اپنے بیٹے کے گلے میں ایک مصیبت ڈال لوں کہ وہ اسی گھر کے لئے کماتا رہے۔ تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم بلا سوچے سمجھے بولتے ہو۔ چار ہزار درہم تقریباً" ایک لاکھ روپیہ ماہانہ بنتا ہے۔۔"

"اچھا چلیں دو ہزار درہم کر دیں۔۔۔" وہ پھر بولا۔ میں نے جان لیا اس کی عقل کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اس نے یقیناً" ان لوگوں سے کچھ سودے کر رکھے تھے جن کے لئے وہ مر رہا تھا۔

"ایک پائی بھی جیب خرچ نہیں ہو گی۔۔۔" میں نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ "اور حق مہر فقط دو لاکھ روپیہ ہو گا ورنہ شادی نہیں ہو گی۔۔۔"

"لیکن بوبی نے تو گیارہ لاکھ قبول کر لیا تھا۔۔۔" وہ یکدم تڑپ کر بولا۔

میں نے بوبی کی طرف دیکھا اور اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ میں حیران رہ گیا۔ انہوں نے کب اسے گھیرا اور کب اس نے ان کا مطالبہ مانا؟۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ میں نے بارہا گانا سنا تھا۔۔۔" تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔۔۔" اب عملاً" دیکھ لیا۔ بچپن میں ایک استاد نے بتایا تھا کہ ارسطو نے سکندرِ اعظم کو کہا تھا دنیا پر حکومت کرنی ہے تو عورت سے دور رہنا۔ اب

میں نے اس فرمان کا اصل مفہوم جانا کہ عورت خود مرد کو ہی فتح کر لیتی ہے اور شادی سے پہلے عشق اس کی مت مار دیتا ہے۔

"اب اس کے بعد مجھ سے ایک بھی مطالبہ مت کرنا۔۔۔" زچ آ کر میں نے کہا

"ورنہ سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔۔۔"

چلتے چلتے وہ مجھ سے کہہ گیا کہ بارات ڈھوڈووال سے جائے گی۔ میں سمجھ گیا وہ اپنے گاؤں والوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس گھر سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنی ذات پہ بھروسہ نہیں اور جو اپنے آباؤ اجداد کے نام پہ روٹی کما رہے ہوں ان سے اس کے سوا اور کیا امید کی جا سکتی ہے؟ میں نے خاموشی سے اسے جانے دیا۔

☓☓☓

9

بھارتی گیت ہے۔ "گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا۔۔۔" اس کا اصل تعلق سہانی' دل لبھانے والی یادوں سے ہے۔ لیکن ڈسکہ کے مغرب میں اس گاؤں سے ہمیں ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ احساس کراہنے لگتا ہے۔ بلکہ یوں کہوں کہ۔ "وہاں۔ میں تو گیا مارا۔۔۔" تو مبالغہ نہ ہو گا۔ اکتوبر 2011 کا آخری عشرہ تھا۔ پچھلی راتوں میں جھوم کے بادل برسے تھے اور ایسے میں کھلے آسمان تلے پانی لگے ناہموار کھیتوں میں شادی منڈپ کی تنبو قناتیں لگی ہوئی۔ بارات کو وہیں بٹھایا اور کھانا دیا گیا۔ ہمیں سٹیج پہ بٹھاتے ہی قاضی صاحب آ گئے۔ پہلے سے مکمل تیار نکاح نامے پر بوبی کے دستخط لئے اور میرے ہاتھ میں تھما دیا کہ کوئی اعتراض تو نہیں۔ ابھی پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ نکاح کے صیغے شروع ہو گئے۔ یوں جیسے مخصوص جلدی ہو۔ اسی دوران اچٹتی نظر میں نے بس جیب خرچ قطع' حق مہر۔ گیارہ لاکھ ' اور گواہان کو دیکھا۔ دولہے کی ولدیت کے سوا میرا کہیں نام نہ تھا۔ یہاں سب پیر تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ میں ان پیروں کا پیر تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ گواہان میں باپ کے نام کی شمولیت اسے ایک یادگار جزو امانت اور بہت بابرکت بنا دیتی ہے۔ لیکن سمجھاتا کسے؟ وہاں تو مبارک مبارک کا غوغا تھا۔ پھر کچھ دیر تک دولہا دلہن کے ساتھ عزیز و اقارب کی تصویریں اترتی رہیں۔ کیمروں کے ساتھ ساتھ میری آنکھیں بھی ان مناظر کو سمیٹتی رہیں۔ عدیل نے تو آپ ہی آپ شادی کر لی تھی۔ میرے بیٹوں' بلکہ میرے گھر میں سے یہ پہلی شادی تھی جو میرے سامنے ہو رہی تھی۔ خدا ہی جانے کیا احساسات تھے۔ میرا آدھا سفر ابھی باقی تھا اور ساتھی کا ہاتھ چھوٹ رہا تھا۔ حوصلوں میں بھی تھکن اتر آئی تھی۔ اب جو نگاہ اٹھا کے دیکھا تو سمدھی' سمدھن' ان کے بچے اور دلہا دلہن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ ہمیں بیٹھے چھوڑ کر زنانہ حصے میں

کیک کاٹنے گئے تھے۔ کہاں رہ گئے؟ اب تو پنڈال میں سے لوگ' باراتی بھی جا رہے تھے۔ یوں جیسے شادی ہال کی طرح وہ کھیت گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے کرائے پر لئے گئے ہوں۔ کرایہ ختم' بتیاں بند اور باراتی سڑک پر۔ ہم سائبان تلے سے باہر نکلے تو زلزلے کے بعد کا سا سماں تھا۔ متاثرین کی ٹولیاں ادھر ادھر بکھری تھیں۔ جو دور سے آئے تھے وہ بچے' مائیں واش روم کے لئے شور کر رہے ہیں۔ کوئی جگہ ہو تو ملے۔ کھیتوں بیچ پیاہ پہ کھڑے ہم سوچ رہے تھے کہ لاہور سے یہاں گاؤں برادری میں بلا کر ہمارے ساتھ کیسا مذاق کیا گیا ہے؟ شاید ان کا کوئی گھریلو ملازم گذر رہا تھا جس سے عصمی نے سمدھن اور دلہن کا پوچھا۔

"شاہ جی اور بڑی بی بی تو جا کے سو چکے ہیں جی!" اس نے بتایا۔ "چھوٹی بی بی اور صاحب کی اندر تصویریں اتر رہی ہیں۔۔۔"

میرے ذہن میں جیسے اجنتا ایلورا رقصاں ہو گئے۔ عشق نچایا۔۔ تھیا تھیا۔۔ تھیا تھیا۔۔ اُدھر جسے جس گاڑی میں لفٹ مل رہی تھی وہ اس میں بیٹھ کر نکل رہا تھا۔ کسی لڑکی کی آواز آئی۔ "آنٹی! آپ ادھر آ جائیں۔۔۔" پتہ چلا یہ عصمی کی بھتیجی ہے جو اسی گاؤں میں بیاہی تھی۔ مجھے علم تھا وہ بری طرح نڈھال ہو چکی ہے۔ میں نے اسے ان کے ساتھ بٹھا دیا۔ ایک اور گاڑی سے مجھے پکارا گیا۔ بچوں میں سے کوئی بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ میں ان میں بیٹھا تو پتہ چلا وہ پہلی سواریاں اتار کر ہمیں لینے آئے تھے۔ پیر صاحب سے کوئی سو گز دور ان کا گھر تھا اور ان سے رشتہ داری بھی تھی۔ ہمیں بٹھا کر انہوں نے ادھر آدمی بھیجا جس نے پھاٹک بجا بجا کر سمدھن جی کو جگایا اور ہمیں باریابی ملی۔ شاہ صاحب نہیں آئے۔ اس کے باوجود میری بہت کوشش تھی کہ خوشی کا یہ موقع کسی بھی بدمزگی سے پاک رہے۔ لیکن ڈرائنگ روم کا دروازہ گذرتے ہی سمدھن نے ایک طرف پڑے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کر کے عصمی سے کہا۔ "وہ سوٹ کیس اٹھا کے اپنی گاڑی میں رکھ لیں۔ وہ آپ کا ہے۔۔۔" اور یوں میری

ساری احتیاط کا بیڑا غرق ہو گیا۔ وزیر آباد کے شاہ جی کی 'شہزادی' کینسر زدہ سہی لیکن اس جاگیر دارانہ لہجے اور دان بخشیش کے سٹائل کو سہہ نہ پائی۔

"میں کوئی کمی نہیں ہوں۔۔۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔ "آپ کے داماد کی ماں ہوں اور ایسے کئی سوٹ کیس میں اس کے صدقے میں دے سکتی ہوں۔ ہمیں اتنی دور سے کیا اس لئے بلایا تھا کہ رات کے اس پہر کھلے میدان میں چھوڑ کر خود آرام سے سو گئے۔ میری بڑی بہن (مسعودہ) بیماری کی حالت میں آئی ہے۔ میری اپنی حالت سخت خراب ہے۔ ماؤں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی آئے ہیں جو باہر ٹھنڈ میں بلبلا رہے ہیں اور آپ لوگ انہیں لاوارثوں کی طرح پٹخ کر اپنے بستروں میں دبکے ہوئے ہیں۔ رشتہ داریاں اس طرح بناتے ہیں آپ۔۔۔؟"

حیرت کی بات ہے کہ وہاں بے بی صاحب اور تاجا حوالدار بھی موجود تھے۔ بھٹی میں مکئی کے دانوں کی طرح اچھلنے والے یہ کردار وہاں یوں بچہ برخوردار بنے بیٹھے تھے جیسے ان کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ ہم نے تو واپس دوبئی چلے آنا تھا اور انہوں نے اسی دریا میں رہنا تھا۔ ان کے مفادات اس گھر سے وابستہ تھے سرکاری افسران انہیں اس گھر کے حوالے سے جانتے پہچانتے تھے۔ شاہ صاحب حکومت میں نہ سہی لیکن ان کے ٹیلیفون کی ایک ٹلی سے کتنے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ بے گناہوں کو پھنسانا' گناہ گاروں کو چھڑوانا' سب کو اپنے دبدبے میں جکڑے رکھنا کتنے ہی تو کام ہوتے ہیں جن کے لئے سیاسی پشت پناہی بہت ضروری ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں انہوں نے اپنے گھر سے چوری کے الزام میں کچھ سر اٹھانے والوں کو ان کی اوقات بتائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وہ رشتہ داری رکھ لی اور ہمیں بیچ دیا۔ اس کا واضح ثبوت اگلی صبح ملا جب تاجے حوالدار رؤف صاحب نے چورانوے ہزار روپے کا بل مجھ سے وصول کیا جس میں شادی میدان کے تمام اخراجات۔ نکاح خوان' ویٹرز' وہاں گاؤں میں

بانٹی جانے والی مٹھائیاں' پیر صاحب کے ڈرائیور اور تمام گھریلو ملازمین شامل تھے۔ لوگ ایسے ہی کہتے ہیں بیٹی کی شادی بہت مہنگی پڑتی ہے۔ یہاں تو سب فری میں ہو گیا بس ایجنٹ تاجا حوالدار رؤف صاحب ہونا چاہیئے۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو بے بی صاحب نے وہ سوٹ کیس عصمی کے سامنے لا کھولا جو ہم وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اب شادی بیاہ پہ ہمارا معاشرتی طریقہ اچھا ہے یا برا' لیکن مجھے بہت پسند ہے کہ جہیز اور بری دونوں کی نمائش ہوتی ہے۔ اور شاہدین کو "جو بھی ہے' جیسا بھی ہے" کے ساتھ قبول کر کے شادی کا گواہ بناتی ہے تا کہ بعد میں کوئی الزام تراشی نہ کر سکے۔ اب ہمارے ساتھ تو ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جو کچھ ہم لائے تھے وہ انہوں نے لاہور میں رسم نکاح سے کئی روز پہلے ہید لہن سجنے کے لئے وصول کر لیا تھا۔ وہ اس سے منکر ہو جاتے اور سب کچھ اپنا بنایا کہتے تو ہم کیا کر لیتے؟ پھر وہ سوٹ کیس جو آدھی رات ہمیں سونپ رہے تھے اور کسی نے دیکھا ہی نہ تھا۔ اسے وہ تحفے تحائف بھرا ٹرک کہہ دیتے ہم انہیں جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ "جنگل میں مور ناچا کسی نے نہ دیکھا۔۔۔" مجھے حیرت تھی کہ گذشتہ رات منع کرنے کے باوجود بے بی صاحب اور تاجا حوالدار کب اور کیسے وہ ٹرک اپنی گاڑی میں ڈال لائے تھے۔ ہمیں قطعی خبر نہ ہوئی !!۔ عصمی نے چند لمحے اس نمائش کو برداشت کیا اور پھر بولی۔

> "یہ کٹ پیسوں والا سوٹ کیس واپس انہیں ہی دے دینا۔ کسی کو دکھائے بغیر اسی لئے رات کے اندھیرے میں دیا جا رہا تھا۔ ایسے گھٹیا کپڑے میرے گھر میں کوئی نہیں پہنتا۔" بہت بعد میں پتہ چلا بے بی صاحب نے وہ واپس نہیں کیا۔

دوبئی لوٹے تو مسائل کا انبار ہی ہمارے ساتھ چلا آیا تھا۔ عصمی کا جسم و روح دونوں ہی پاکستان کے اس ہنگامہ خیز دورے میں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ پسلیوں' کمر اور بالخصوص کولہے کے درد نے اسے اتنا بے حال کر دیا کہ ایک بار پھر وہ وھیل چیئر پر آ گئی۔ جذباتی ہیجان یا ذرا سا چلنے' مشقت کا کام کرنے سے سانس دو بھر ہو جاتا۔ کبھی کبھار وہ سوتی تو جھنجھوڑ کر جگانا پڑتا۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر سینے کے اتار چڑھاؤ سے دیکھنا پڑتا کہ سانس چل رہا ہے یا نہیں؟ زندگی بے رنگ سی' جیسے سکوت کے کسی مدار میں لڑکھڑانے' ڈگمگانے لگی تھی۔ کینسر کی اگلی منزلوں کے بارے ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا اور نہ کوئی تجربہ تھا۔ ہر نیا دن ہمیں نئی اذیتوں سے دوچار کر رہا تھا۔ کبھی دوبئی کے ہسپتالوں میں بھاگتے تو کبھی العین۔ ایسے میں پاکستان سے آنے والے ٹیلیفون ذہنی انتشار میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ ہم نے تو پہلے ہی ان سے درخواست کی تھی کہ شادی کے تمام مراحل نکاح و رخصتی اکتوبر میں ہی نمٹا دیں لیکن وہ آئندہ مارچ میں رخصتی پر بضد رہے۔ ادھر دیئے کی لو بہت ٹمٹمانے لگی تھی۔ چنانچہ ہم نے میسر پلوں میں ثمرین اور احتشام کی شادیاں نمٹانے کی تاریخ مقرر کر دی تو ایک ہی ماہ بعد انہیں ایمرجنسی آن پڑی اور جلد رخصتی پر اصرار ہونے لگا۔ جنوری 2012 میں شاہ صاحب بہ نفسِ نفیس بیٹی کے ہمراہ دوبئی تشریف لے آئے۔ شاید شاپنگ کرنی تھی یا شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے تھے۔ ہم نے ان کی عزت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن جانے کیوں' کسی نے کچھ کہا نہ پوچھا۔ بیٹی نے اچانک ہی ہونے والے خاوند پر فرمان جاری کر دیا۔

"میں اپنا تمام زیور لاہور لا کر میں رکھ کر آؤں گی۔۔۔"

"میں نے اس بارے تم سے کچھ کہا کیا؟ کوئی سوال جواب کیا؟" بوبی نے پوچھا۔

"نہیں!۔۔۔" جواب ملا۔ "بس میں بتا رہی ہوں کہوہ میرا ہو گا اور میں چاہے اسے دریا میں پھینکوں کوئی اسے پوچھنے کا حق نہیں رکھتا۔۔۔"

یقیناً" بلی مارنے والا یہ سبق اسے پڑھا کر بھیجا گیا تھا۔ داماد نے شاہ صاحب کو نشان دہی کر دی کہ شاید اسی لئے میری دی نکاح کی انگوٹھی' چوڑیاں اور گھڑی اتار کر آئی ہے۔ ابھی سے بداعتمادی اور حکومت کرنے کا ایسا نشہ ہے تو آگے کیا ہو گا؟ شاہ صاحب تلملائے' بیٹی کو روکا ٹوکا بھی اور پھر زیر لب ان کے یہ الفاظ سنائی دے گئے کہ۔ "گھر پہنچ لو پھر تم سے بات کروں گا۔۔" خدا جانے وہاں کوئی بات ہوئی ہو گی یا نہیں لیکن دلہن بی جانے سے پہلے اپنے

مزید مطالبے بھی ہمیں سونپ گئی کہ۔ وہ ہر تین چار ماہ میں ایک بار پاکستان ضرور جائے گی۔ وہ زیادہ دیر اپنے ماں باپ سے دور نہیں رہ سکتی۔ اور آنٹی کا خیال رکھنا انکل کی ذمہ واری ہے' اس کی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ جس ماحول میں پلی بڑھی تھی اس میں گاؤں کے بڑے بوڑھے جوتا دہلیز سے باہر اتار کر ان کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے گھر سے چلا چاچا' تایا' بابا کرم دین اس چوکھٹ پہ پہنچ کر "اوئے کرمے" بن جاتا ہے۔ حیات وبقا کے لئے شاید اس ماحول کا نظریہ ضرورت یہی ہے۔ لیکن جس ذی حس نے اس جنگل سے باہر یورپ اور امریکہ کی درسگاہوں میں نہ صرف نمو پائی ہو بلکہ ان کی تاریخ پر اپنے نشان بھی ثبت کر آیا ہو۔ اس کی لگام پر صرف وہی ہاتھ رکھ سکتا ہے جو اس سے بہتر ہو۔

شاہ صاحب چلے گئے۔ وہ خود اپنی آنکھوں دیکھ گئے تھے کہ عصمی زیادہ دیر بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اس کی حالت ذرا سنبھل لے تو تاریخ کا تعین کر کے انہیں اطلاع دوں گا۔ لیکن ان کے گاؤں پہنچنے کے ساتھ ہی ٹیلیفونوں کا تانتا پھر بندھ گیا۔ شاہ صاحباور کبھی سمدھن جی کہتیں کہ جلد تاریخ مقرر کر کے انہیں اطلاع دیں۔ میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ عصمی کی حالت روز بروز بگڑ رہی ہے اور ہم اسے چھوڑ کر بھی نہیں آسکتے۔ علاوہ ازیں دوبئی میں دوسری دو شادیاں سر پہ آن پہنچی ہیں۔ اس لئے تھوڑا سا صبر کریں۔ لیکن وہاں ماننے سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ ڈھوڈووال کی طرف سے مزید دباؤ آیا۔ تاجے حوالدار کا خدا جانے کون سا کام اٹکا ہوا تھا' شاید کسی کی زمین ہڑپ کرنی ہو گی کہ اس نے پھر بے بی صاحب کو آگے لگا دیا۔ ایک بار پھر اس نے زیورات اور ملبوسات بارے سمدھیوں کے مطالبے ہمیں بیان کئے۔ کہ چوڑیاں اور کنگن وزنی ہوں۔ بات میرے پلے نہ پڑی کہ پہلے والی چوڑیاں انہی کے پاس ہیں۔ اب یہ ان کا بدل مانگی جا رہی ہیں یا مزید کا تقاضا ہے؟ خدا جانے اسے کچھ کمیشن ملنی تھی یا وہ اس شادی کو ہی سبوتاژ کر رہی تھی۔ اس کی فرمائش تھی کہ دوبئی میں شادیوں کو ملتوی کر کے پہلے ان لوگوں کو فارغ کر دیں۔ یوں' کوئی

کھیل تماشا ہو جیسے۔ ادھر سب انتظامات مکمل تھے اور لگ بھگ دو ہفتے رہتے تھے جب بے بی صاحب کے سب سے بڑے بھیا وقار حسین عرف 'کاری شاہ' ہمارے پاس آن دھمکے۔ یہ حضرت جرمنی میں سٹیشن ویگن پہ شہر شہر اپنا پھیری سٹال لگاتے ہیں کسی زمانے میں براستہ اٹلی۔۔ جرمنی میں وارد ہوتے ہی یہ مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ دو ہزار جرمن مارک درکار تھے۔ انہوں نے اپنی پھوپھی گوگی کو "ایس او ایس" کال دی اور شام سے پہلے میں نے رقم ان کے ہاتھوں میں پہنچوا دی (جو کچھ عرصے بعد انہوں نے لوٹا دی) لیکن جرمن مارک کے بدلے پاکستانی روپیہ وافر ملتے ملتے اب نو دولتیے ہو چکے تھے لہٰذا اسلام آباد کے گرد و نواح میں کئی نامی گرامی کالے' چٹے' نیلے' پیلے علم والے پیروں فقیروں کا وظیفہ لگا رکھا تھا جن سے پھڈے اور مقدمے بازی جیتنے کے لئے تعویذ دھاگے کرواتے۔ وزیر آباد کے شاہ جی والے مندر سے ملحقہ وقف باغ کو نگلنا چاہتے تھے کہ وہیں کی ایک سیاسی شخصیت نے ان سے پہلے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ کاری صاحب کا کوئی پھڈا مقدمہ' پیری فقیری ان کے سامنے نہیں چلی۔ یہ ہمارے اس رشتے سے بے پناہ خوش تھے کہ اس زمین کا قبضہ لینے کے لئے شاہ صاحب کا سہارا لیں گے۔ لیکن۔۔۔ دل کے جو ارمان تھے وہ رہ گئے۔ سنا ہے اسی بات پر وہ مجھ سے ناراض ہیں اور میرے سر کی قیمت لگا رکھی ہے کہ جو مجھے ان کے ہاتھوں پکڑوا دے اس کے بیٹے کو یہ جرمنی بھجوا دیں گے۔ کوئی پوچھے۔ دوبئی کے اوپر سے ہی آتے جاتے ہو۔ میں تمہارے راستے ہی میں تو بیٹھا ہوں۔

دوبئی میں شادیوں کی تیاری ہو رہی تھی کہ وسط فروری 2012 میں ایک شام اچانک ہی عصمی کو سانس کی شدید تکلیف ہو گئی۔ اسے فوری طبی امداد کے لئے العین لے جانا ممکن نہ تھا چنانچہ دوبئی ہسپتال لے گئے۔ انہوں نے اسے آئی سی یو میں ایڈمٹ کر لیا۔ پتہ چلا اسے نمونیہ ہو گیا ہے۔ یہ اچھی علامت نہ تھی۔ ہفتہ بعد احتشام کی رسم نکاح سے صرف دو روز پہلے وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوئی۔ اسی حالت میں 3 مارچ 2012 کو دوبئی کی دونوں شادیاں انجام پذیر ہو

گئیں۔ ان دنوں عصمی کو چپ سی لگ گئی تھی جیسے وہ اپنے بند باندھے خود کو یکجا رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرا احساس ڈراڈرا' سہااور بکھرا ہوا تھا کہ اس کے چہرے پہ چاہت کی اک نگاہ ڈالی تو خود ہی مہین کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔ اس کے چہرے پر خشک سالی سے متاثر زمینوں کی طرح ہلکی اور گہری لکیروں کے بے انداز جال ابھر آئے تھے۔ نموِ حیات جیسے اس وجود سے کوئی دم رخصت ہونے کو تھی۔ میرا درد اپنے سوا تھا کہ ہاتھ چھوٹتا' ساتھ ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ یہ تو سراسر بے وفائی ہے۔ اس کے بغیر میرا وجود بے معنی' بے حقیقت تھا۔ اکیلے کیسے جی پاؤں گا؟ لیکن اس کے لئے بوبی کی شادی کا فریضہ ابھی باقی تھا۔ خدا جانے وہ کیسے اپنے آپ کو یکجا رکھے تھکی تھکی اس تیاری میں تھی کہ 20مارچ 2012 کو اس کا "پلیورل اخراج" شروع ہو گیا۔ یعنی دائیں پھیپھڑے میں رطوبتیں جمع ہونے لگیں۔ سانس بہت دشوار ہو گیا۔ العین ہسپتال والوں نے اسے فوری 'ایڈمٹ' کر کے دو بوتلیں خون دیا۔ پشت پر پسلیوں میں سوراخ کیا اور ٹیوب اندر ڈال کر رطوبتیں خارج کرنے لگے۔ تیرہ دن اسے ہسپتال میں رکھا گیا۔ بچے آفس سے فارغ ہو کر روزانہ دو سو کلو میٹر دور العین ہسپتال پہنچتے اور آدھی رات گھر واپس لوٹتے۔ عین سرجری دوران مجھے بے بی صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ شاید تب آنٹی اس کا ٹیلیفون لینے سے قاصر تھی۔ وہ رخصتی کی تاریخ جلد مقرر کرنے پر اصرار کر رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس وقت ہم سب ہسپتال میں جمع ہیں اور اس کی آنٹی کس حال میں ہے۔ مجھے جواب ملا۔

"آنٹی کی بات چھوڑیں۔ وہ تو روز ہی بیمار ہوا کرتی ہیں۔۔۔"

عصمی واپس کمرے میں شفٹ کی گئی تو پتہ چلا اسے آپریشن تھیٹر میں بے بی صاحب کا ٹیلیفون ملا تھا اور جب اس نے بتایا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے تو ارشاد ہوا کہ۔

"آنٹی اتنا بھی تکبر اچھا نہیں ہوتا۔۔۔"

بولنے سے پہلے تول لینا اچھا ہے لیکن ان جانوروں کے گٹر سے بھی زیادہ متعفن اگالدان کون بند کرے جن کا مقصد ہی دل آزاری ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میں نے اس عورت کو اپنی بیٹی بنایا تھا۔ وہ شاید ہمارا گناہ' مکافاتِ عمل اور سزا تھی۔ مجھے ریتلی شارک کی مثال یاد آئی جو بھوک مٹانے کے لئے اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے۔ یہ اس سے آگے کی کوئی جنس تھی جو ماں کو بھی کھا جاتی ہے۔ اِس نے عصمی کے آخری ایام مین بھی اسے چین سے جینے نہیں دیا۔ میرے پاس تاحیات اس کے لئے کوئی دعا نہیں ہے۔

عصمی اپریل میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی۔ بحالی ہوتے کئی دن لگ گئے اس بیچ پاکستان سے ایک پیغاماتی میزائل داغ دیا گیا۔ بہو رانی نے ای میل لکھا تھا کہ اس نے خلع کے لئے درخواست دے دی ہے۔ اور وکیل کا نوٹس بھی بھیجا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ فرمان شاہ صاحب کی جانب موصول نہیں ہوا تھا اس لئے ہم نے اسے حصولِ مقاصد کے لئے صرف پینترا سمجھا اور سنجیدگی سے نہیں لیا۔ چند دن بعد بے بی صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا کہ تاریخ بتائیں اور صرف بوبی ہی آکر دولہن کو لے جائے۔۔۔ یا پھر۔۔۔ اس کی ماں اسے دوبئی چھوڑ جاتی ہے۔۔۔" یعنی مدعی ست' گواہ چست۔ میں نے خلع کیس کے بارے سوال کیا تو اُسے کچھ بھی خبر نہ تھی۔ معلوم کرنے کے لئے اس نے لائن چھوڑی تو پھر نہیں لوٹی۔ میں اس سے یہ بھی نہ جان پایا کہ ابھی تو چھ ماہ بھی نہ گذرے تھے۔ ایسی کیا آفت آگئی کہ وہ تھوڑا اور انتظار نہیں کر سکے؟

ہم اپنے مسائل میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ گھر میں ابھی ابھی دو شادیاں ہوئی تھیں لیکن ماحول میں خوشی' شادمانی کا عنصر کہیں نہ تھا۔ بلکہ ابتری کا عالم تھا۔ میں عصمی کے مزاج میں بہت تبدیلیاں دیکھ رہا تھا۔ وجوہات مجھے معلوم تھیں لیکن ان کا حل میرے پاس نہ تھا۔ سب سے بڑا عنصر تو بیٹی کا بیاہ کر چلے جانا تھا۔ وہی اس کی سب سے بڑی دوست' ہمدم' مونس و غمخوار تھی۔ دن کے وقت اسے باہر گھمانا' پھرانا اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسے دیکھنا' اس کے

درد کا مداوا بننا۔ اسے نہلانا' کپڑے بدلنا۔ بالوں میں کنگھی کرنا۔ سب کچھ یکدم سے چھن گیا اور وہ اپنی اس تنہائی کے خول میں سمٹ گئی۔ میری طرف تو اس نے دیکھنا تک چھوڑ دیا۔ پاس سے یوں گذر جاتی جیسے میرا وجود پہلے ہی سے عدم ہو چکا ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے اپنے اکیلے پن کی وہ مجھے یوں سزا دے رہی ہو۔ یا پھر وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔ میں سوچتا۔ "اسے پتہ ہے کہ میں اس کے بنا نہیں رہ سکتا۔ شاید وہ ہمارے بیچ نفرت کی فضا قائم کر رہی ہے تا کہ میں اسے یاد نہ کروں۔۔" ہماری بدقسمتی کہ ہم نے اس تبدیلی کو صرف جذباتی امر جانا۔ یہ نہیں جان پائے کہ کینسر اور کیمو نے اس کے بدن میں حیاتیاتی نظام کو بہت منتشر کر دیا ہے اور اس سبب اسے احساس ہی نہیں وہ کیا کر رہی ہے۔ ایسے میں پاکستان سے چھوٹی پیرنی کا ٹیلیفون آیا۔ سیالکوٹ کی کسی شادی میں اس کی ملاقات 'بہو بیگم' سے ہوئی تھی۔ اس کا احوال و پیغام سنانے اور اذیت رسانی کے لئے اس نے یہ زحمت کی تھی۔

"اسے خلع مل گیا ہے اور دوسری جگہ اس کی منگنی بھی ہو گئی ہے۔۔۔" وہ خبر نامہ سنا رہی تھی۔ "اور اس نے کہا ہے کہ اب وہ 'بڈھی' پاکستان آئے میں نے ایرپورٹ پر ہی اسے پکڑوا دینا ہے۔۔۔"

وہ بہت تڑپی' بہت مچلی لیکن پاکستان جانے کی اسے حسرت ہی رہ گئی۔ خدا جانے اسے پکڑوانے والوں کے ارمانوں کا کیا بنا؟ مجھے پیغام کی صداقت پر تو کوئی شک نہیں لیکن اسے نشر کرنے کا مقصد دل آزاری کرنے اور کچوکے لگانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ بوبی نے کہا۔ "آپ صرف امی کی طرف دھیان دو۔ باقی جو ہوتا ہے ہو جانے دو۔۔۔" میں تڑپا۔ بارہ تولے 22 قیراط چوڑیاں اور لہنگا سیٹ و اس سے میچنگ زیور کے لئے تقریباً" ساڑھے چھ لاکھ روپے کیش میں نے اپنے ہاتھوں دیئے تھے۔ ڈائمنڈ جڑی گھڑی اور سالیٹئر انگوٹھی ان کے علاوہ

تھی۔ شادی اخراجات اور ڈھوڈووال کے پیروں کی لوٹ کھسوٹ الگ۔ جانے وہ کون سے نایاب لمحے تھے کہ عصمی اپنے حواس میں تھی۔ اس نے مجھے ڈھارس دی۔

"سمجھ لو بیٹے کا صدقہ دے دیا ہے۔۔۔"

پھر اس کے بعد وہ لمحے میرے نصیب میں کبھی نہیں آئے۔ اس کی باتوں میں وہ خوشبو رہی اور نہ وہ چاہت' پیار اور مٹھاس۔ کبھی وہ بادِ صبا کا ایسا جھونکا تھی جس کے لمس سے احساس مہکنے' مسکانے لگتا تھا اور اب اس کے ارد گرد چار دیواروں کے اندر جیسے ببول اُگ آئے تھے یا پھر اک آگ سی دہکنے لگی۔ پرس' موبائیل یا کوئی چیز اِدھر اُدھر ہو جاتی تو ملازم قدیر کی شامت آ جاتی۔ بیٹی اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اب وہ پتہ لینے آتی تو اس سے زبردست جھاڑ جھپٹ ہوتی اور وہ روتی ہوئی سسرال لوٹتی۔ اس 'وچھوڑے' کا تمامتر ذمہ وار چونکہ میں تھا اس لئے ہر وقت اس کی فائرنگ رینج میں تھا۔ ذرا ذرا سی بات پہ وہ بھڑک اٹھتی۔ میرے ساتھ اکثر جھگڑا ہونے لگا۔

"میرے بہن بھائیوں کے گھروں سے اپنا سامان اٹھاؤ۔ انہوں نے تمہارا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔۔۔"

اب کوئی مجھے سمجھائے کہ اس کی ایسی بیماری دوران میں سامان اٹھانے جاتا کیا؟ اور جن کے پاس رکھا تھا وہ جونکوں کی طرح ہمارا خون بھی تو چوس رہے تھے۔ وزیر آباد' کوٹلی امیر علی اور ڈھوڈووال والوں نے اس سامان کا بھرپور محصول ولگان وصول کیا تھا۔ اب تھوڑا انتظار اور سہی۔ لیکن تب مجھے خبر نہ تھی کہ کینسر کے علاوہ بھی ایک اور ناسور اس کے دل و دماغ کو چاٹ رہا ہے۔ وہ دنیا سے چلی گئی۔ میں بیٹی کے ساتھ پاکستان آیا تو جانا کہ اپنے آخری ایام میں وہ کن اذیتوں سے دوچار تھی۔ درحقیقت وہ جان چکی تھی کہ ساری زندگی تنکا تنکا اس کے بنائے سامان کا حشر کیا ہوا ہے۔ حقوق العباد کے تعلق میں وہ مجھ سے میلوں آگے تھی۔ دورانِ ملازمت ہم دونوں بیچ معاہدے کے تحت' اسے کسی ضرورت مند عزیز' رشتہ دار کی مالی و

دیگر مدد کے لئے میری اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے بچوں سے شراکت کر لی۔ وہ کوئی سوال جواب کئے بغیر مجھ سے کہیں زیادہ اسے دینے لگے تو اس کے بہن' بھائیوں' بھانجے' بھانجیوں کو ایک 'امداد بینک' مل گیا۔ ادھار دینے والے کی پسلیوں بیچ چبھتا رہتا ہے اور عصمی اپنی اولاد سے بلاشبہ بے پناہ مخلص تھی۔ اس نے غالباً یہ نہیں سوچا ہو گا کہ کبھی وہ ان رشتہ داروں سے اپنے بچوں کے پیسے واپس مانگے گی اور کوئی نہیں دے گا۔ مجھے کتنے ہی لوگوں نے بتایا کہ اپنے آخری دو پھیروں کے دوران وہ ہر کسی سے اپنا قرض واپس لوٹانے کے لئے کہتی رہی لیکن سب نے جان لیا تھا کہ تین چار ماہ کے اندر وہ پاکستان آنے کے قابل بھی نہ رہے گی لہٰذا اس کے ماتھے ہی نہ لگو۔ بہت مان تھا اسے اپنے بہن بھائیوں اور ان کی دیانت داری پر۔ لیکن اب بھرم ٹوٹا تو شاید وہ چاہتی تھی کہ میں سامان اٹھانے جاؤں۔ مجھے اس تباہی کا پتہ چلے اور میں بھی اپنی چیخ اس کی بیماری میں شامل کر دوں تاکہ سارا درد سمیٹ کر وہ اطمینان سے مر سکے۔ تینوں جگہ ملا کر کم و بیش ڈیڑھ کروڑ روپے کا گھریلو سامان تھا لیکن جب سب سے بڑے سائز کی چار پیٹیاں صرف ایک پوٹلی میں سمیٹ کر پیر گھرانے اور بے بی صاحب نے میرے سامنے لا رکھیں۔ تو میں نے جانا کہ ساری کائنات کے مال وزر سے عصمی کہیں زیادہ بیش قیمت تھی۔ کاش اس نے اپنا درد مجھے کہہ دیا ہوتا تو میں نے اسے اس کرب سے بچا لیا ہوتا۔ مقبول بی بی اور کھارے شاہ نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ان چیلوں گدھوں کے نوچے سے جو بچا تھا اس میں سے بچوں کے لئے ماں کی کچھ چیزیں بطور یادگار رکھ کر میں نے باقی سب عصمی کی جانب تے رَاہِ اللہ دے دیا۔ یہی دنیا کی نفسا نفسی ہے کہ کسی مرگ پہ زیادہ بوٹیاں کھانے سے تسکین ملتی ہے جانے والے کی کمی کوئی نہیں محسوس کرتا۔ کون سی بہن' کون سی ماں یا خالہ؟ زیور بے بی صاحب پی گئی۔ تمام قرضہ اس کا خاوند تاجا حوالدار ہضم کر گیا۔ کالیداس بھیا خاموشی سے بیٹھا سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ ڈرامہ ختم ہوا تو اس نے طنزیہ حسرت سے کہا۔ "جس کو جتنا موقع ملا ہے اس نے جی بھر کے لوٹا ہے۔

مجھے تو بہت دکھ ہے کہ تم نے ہمارے گھر میں اپنا سامان کیوں نہیں رکھا؟ ہمارا بھی بھلا ہو جاتا۔۔۔!!"

موسم بدلا۔ گرمی میں ذرا تیزی آئی تو اس کے مزاج کی تندی تلخی سے گھر کا ماحول اور زیادہ دہکنے لگا۔ اس نے میرے ساتھ العین ہسپتال جانے سے بھی انکار کر دیا۔ عدیل ایک بار پھر بیوی کے ساتھ الگ شفٹ ہو گیا تھا اور ان دنوں بے کار تھا۔ اس لئے وہ اسے بلا کر ساتھ لے جاتی یا پھر آنے جانے کے لئے ٹیکسی بلا لیتی لیکن کڑکتی' جھلساتی دھوپ میں بھی اپنے لئے میرا سایہ تک اسے گوارا نہ تھا۔ شاید اس گھر میں بیٹی کا رشتہ قبول کر کے میں نے اس کا مان' فخر' بھروسہ' اعتماد سبھی کھو دیئے تھے۔ اس کے پاؤں پاؤں چلنے سے آج تک جانے اس نے کتنے ارمان جوڑے ہوں گے جنہیں میں نے یکسر بے معنی کر دیا تھا۔ چنانچہ گلہ شکوہ' دل کا درد کہنے سننے کی بجائے اس نے اپنے اور میرے بیچ فاصلے بڑھا لئے۔ اب میرے پاؤں تلے ہر طرف جلتی ہوئی زمین تھی تو کیا ہوا؟ میں نے ہی تو ناموافق موسموں میں اس کا ساتھ دینے کا عہد و پیمان کیا تھا۔ عالم بے بسی میں سارے حالات بتا کر میں نے ڈاکٹر سے فریاد کی لیکن مجھے صرف صبر کرنے کے لئے کہا گیا۔ ان طبی ناخداؤں کی خدائی اور آئین دونوں ہی عجیب ہیں۔ آدمی کو اس کی بے بسی کا بھرپور احساس کروا کے مارتے ہیں۔ لگ بھگ بیس اکیس برس پہلے میں نے لاہور میں دل کے سپیشلسٹ ڈاکٹر مبشر سے اپنے والد صاحب کی بیماری بارے پوچھا تو جواب ملا کہ "ان کا دل غبارہ بن چکا ہے۔ یہ بونس پر جی رہے ہیں آپ کو اسی پر شکر کرنا چاہیئے۔۔۔" والد صاحب پیشے کے اعتبار سے قانونی مشیر تھے لیکن اس ڈاکٹر کو قانون سمجھانے کی بجائے وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے رہے۔ مین نے غور سے اس سپیشلسٹ کو دیکھا اور چاہا کہ کاش وہ ڈاکٹر مبشر کی بجائے صرف ڈاکٹر بشر ہوتا۔ وقت بدل گیا اور اب اس کینسر والے ڈاکٹر صاحب سے میں نے صرف اتنا جاننا چاہا کہ عصمی کے دل و دماغ پر ان ادویات کا اثر ہے یا کسی اور روگ کا؟ کیا کسی ماہر نفسیات سے کونسلنگ کی خدمات حاصل کی جائیں؟ لیکن

انہوں نے صرف صبر کی گولی میرے حلق میں ٹھونس دی۔ میں انہیں زیادہ سوال جواب اس لئے نہ کر سکا کہ وہ کئی بار مجھے تنبیہ کر چکے تھے۔۔۔"ڈاکٹر میں ہوں یا تم۔۔۔؟" مجھے معلوم نہیں وہ پہلے والا ڈاکٹر مبشر اچھا تھا یا آج والا ڈاکٹر بشر؟ لیکن سوچتا ہوں اس کینسر سپیشلسٹ نے میری جھولی میں صبر و امید ڈالنے کی بجائے ذرا دھیرج سے کہہ دیا ہوتا کہ یہ میری قیامت کے آثار ہیں تو آج ہر روز میں اپنی کم علمی کے احساسِ گناہ سے نہ مرتا۔ ہوا یوں کہ اک روز بیٹھے بٹھائے عصمی نے ملازم قدیر کو وھیل چیئر باہر نکالنے کو کہا۔ پھر چھاتہ لے کر اس میں بیٹھی اور اسے لے چلنے کو کہا۔ جولائی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت۔ وہ اسے دھکیلتا چلا۔ گھر میں میری اور بیٹی کی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن وہ ہماری منت سماجت کو سنتی ہی کب تھی۔ پاس سے راہ گذرنے والوں کے لئے یہ ایک تماشہ تھا۔ گاڑیاں ان کے قریب آہستہ ہوتیں' انہیں غور سے دیکھا جاتا' اندازہ ہوتا کہ یہ کسی فلم کی شوٹنگ نہیں تو وہ لوگ یہ جاوہ جا۔ لیکن اسے ان باتوں کا ہوش کب تھا۔ وہ تو قدیر کے ساتھ پروگرام بنا رہی تھی۔ "میں ذرا ٹھیک ہو لوں تو ہم دونوں ماں بیٹا پاکستان چلیں گے اور ڈھوڈووال' کوٹلی سے اپنا سامان اٹھا لیں گے۔۔۔" پتہ نہیں اس کے اندر کیا کچھ اذیتیں پل رہی تھیں جنہیں کہہ کہہ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ باتیں چلتی رہیں۔ سیکیورٹی گیٹ پہ کوئی ٹرانسپورٹ نہ ملی تو وہ آگے گذر گئے۔ لگ بھگ چار کلومیٹر چلنے کے بعد ایک پاکستانی عورت نے کار روکی اور انہیں بٹھا لے چلی۔ اس بار وہ دوبئی کی بجائے شارجہ ہسپتال گئی تھی۔ آج سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک تڑپ' اک تلاش میں بھٹک رہی تھی کہ شاید کہیں اسے کوئی مسیحا ڈاکٹر مل جائے گا جو اسے صحتیاب کر دے۔ ایسے درجنوں ہی واقعات ہوئے کہ کبھی اسے ایک' کبھی دوسرے ہسپتال سے واپس لایا گیا۔ میرے ساتھ جانے کو وہ تیار نہ تھی۔ ہر کوشش کے بعد میں بھی تھک گیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر کے پیمانۂ صبر میں تاکید تھی کہ جو بات اسے پسند نہیں اس پر اصرار کر کے اس کی ناراضگی سے پرہیز کریں۔ چنانچہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب وہ یادیں' ان ساعتوں کی چاپ میرے ذہن کا ناسور بن گئی ہے۔ بالائی منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتا ہوں تو وہ مجھے نیچے پارک کنارے کنارے ناتواں قدموں سے چلتی نظر آتی ہے۔ چادر کو وہی ٹی کوزی کی طرح سر پہ لپیٹا ہوا' پرس کندھے پہ لٹکا' جس میں اس کا موبائل' ہنگامی ادویات' وینٹولین اور ٹیلیفون ڈائری ضرور رہی ہو گی۔ کیمو کی وجہ سے اسے بے حد پیاس لگتی تھی اس لئے ایک ہاتھ میں ہمیشہ پانی کی بوتل لٹکی ہوتی۔ ہر چند قدم بعد وہ پلٹ کر دیکھتی کہ اس کے پیچھے کوئی آیا ہے یا نہیں؟ ایسی چمکدار اور جھلساتی ہوئی گرمی میں کون اس کے ساتھ چلتا؟ قدیر بھی کسی کی اولاد تھا۔ میں نے 'ہیٹ سٹروک' یا 'سن سٹروک' کے ڈر سے اسے بھی منع کر دیا۔ یوں وہ جاتی اور جلد ہی احتشام آفس کا کام کاج چھوڑ اسے کہیں نہ کہیں سے واپس لے آتا۔ لیکن اب خدا جانے کیا ہوا ہے کہ کھڑکی سے جھانکتے جھانکتے میری آنکھیں تھک کر دھندلانے لگی ہیں وہ واپس نہیں آ رہی۔ مجھے بس اس سے یہ پوچھنا ہے کہ یوں چھوڑ کر جانا تھا تو خود میری زندگی میں یا مجھے اپنی زندگی میں شامل ہی کیوں کیا تھا؟

پھر یکبارگی عصمی کے مزاج میں اور بھی تلخیاں امڈ آئیں۔ اس کے چہرے پہ جو دلآویز سی نرمی اور اپنے پن کی کشش تھی دھیرے دھیرے اس پر کرختگی کی قدغن چپک گئی۔ ہر وقت غصہ ناک پہ دھرا اور لہجہ ابلتا ہوا۔ پیالیاں' پلیٹیں' برتن ٹوٹنے لگے۔ ڈر لگنے لگا کہیں کسی بات پر ضد میں آ کر وہ اپنے آپ کو زخمی نہ کر بیٹھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ وہ ناراض ہو کر برآمدے میں بنے سٹور کے اندر بند ہو جاتی۔ آگ برساتی گرمی اور گھٹن کا موسم۔ وہاں اے سی تھا اور نہ پنکھا۔ لاکھ منت سماجت بھی اسے وہاں سے نکال نہ پاتی۔ بس جب اس کی ہیجانی کیفیت نارمل ہوتی تو وہ باہر نکلتی۔ عقبی کورٹ یارڈ میں بوگن وِلا کی پھیلی ہوئی بیل کے نیچے ایک بڑا سا جھولا ڈال رکھا تھا۔ رات کے وقت وہ اس پہ جا لیٹتی۔ وہاں کاٹنے' ڈنک مارنے والے حشرات الارض کا ڈر تھا لیکن اسے وہاں سے اٹھائے کون؟ اور کیمو کا زہر اس کے خون

میں شامل ہونے کی وجہ سے تو وہ کیڑے مکوڑے ہی اپنی جان سے ہاتھ کھو بیٹھتے تھے۔ کبھی وہ گھر کے آگے دن بھر کی گرمی سے دہکتے کھلے ٹیرس پہ لیٹ جاتی اور یہ بھی خیال نہ کرتی کہ کنارے لگے چھوٹے چھوٹے پودوں کی دوسری جانب گزر گاہ ہے۔ یہ تو ہسپتال میں آخری ایڈمشن دوران اس نے ہمیں بتایا کہ تپی ہوئی اینٹوں کے سینک سے اسے بہت سکون ملتا تھا۔ لیکن تب ہماری جان نکلی جاتی تھی کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اسی طرح ایک روز گھر کے ہال سے لے کر بیرونی دروازے تک راہداریوں' ڈائیننگ روم اور لابی میں ٹوٹے برتن اور ڈھیروں کرچیوں کے انبار بکھرے تھے تو خوف زدہ ہو کر میں نے پولیس کو بلوالیا۔ مقصد تو یہ تھا کہ اسے کسی طرح کنٹرول میں کیا جائے۔ اس کا وہ جنون ختم ہوا تو اس روز وہ بہت روئی کہ میں نے اس پر پولیس بلوالی۔ اب وہ تو جا چکی ہے لیکن میں ہر روز اپنے پھپھولوں پہ نشتر زنی کرتا ہوں۔ کینسر اس کی رگ رگ کو کاٹتا' چاٹتا اس کے مزاج میں زہر گھول رہا تھا تو اس کا درد خود میری تبخیر و تصعید کر رہا تھا۔ تل تل اس کے ساتھ مرتا میں نہ تو رو سکتا تھا اور نہ ہی کسی کو اپنے دل کا حال کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ جس سے میرے دکھ سکھ کی سانجھ تھی وہ 'ناخدا' ہی منجدھار کی نذر ہو چکا تھا۔ یوں ہولے ہولے میرا' اس کا' ہمارے گھر' ہماری جنت کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔ بیٹے ملازمت کے بعد شام دوستوں میں گذار کر دیر سے گھر آنے لگے۔ احتشام کی بیوی ڈیوٹی سے لوٹتی تو اس کی گاڑی اکثر گھر سے کچھ فاصلے پر بچوں کے پارک سامنے کھڑی ملتی۔ میاں صاحب لوٹتے تو دونوں گاڑیاں آگے پیچھے گھر پہنچ جاتیں۔ اور کہیں جو گھریلو ماحول میں ذرا سینک یا گلے شکوے کی فضا ملتی تو وہ چند ہی منٹوں میں بیگم کو کچھ دنوں کے لئے اس کے مائیکہ شارجہ بھیج دیتا۔ ثمرین آتی اور اپنی درگت بنوا کر واپس جاتی۔ عصمی نے اپنے آپ کو 'ٹی وی' تک محدود کر لیا۔ عجیب بات ہے کہ اس مرحلے پر میں اس کی ایسی شدید تبدیلیوں کا کیموتھراپی سے تعلق قائم نہیں کر پایا۔ ہم سب یہی سمجھتے رہے کہ اختلافِ رائے کی وجہ سے وہ اپنی ناراضگی ظاہر کر رہی ہے۔ لیکن آج جب وہ نہیں ہے اور اس کی وہ

رپورٹیں' جو بہت بعد میں ہسپتال سے مجھے درخواست پر ملیں' اور جو 'کانفیڈنشل' کے عنوان سے ڈاکٹروں کی رپورٹوں میں ہی دفن ہو جاتی ہیں۔ آج میرے سامنے کھلی پڑی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جولائی 2012 میں کیمو کا پانچواں سائیکل مکمل ہونے کا درج ہے تو ساتھ ہی یہ اضافی نوٹ بھی موجود ہے کہ وہ لاعلاج ہو چکی ہے۔ شاید بیشتر وقت وہ اپنے حواس میں ہی نہ تھی۔

انہی دنوں وہ باتھ ٹب میں پھسل گئی۔ ایسا پہلے بھی دو بار ہو چکا تھا۔ لیکن اس بار وہ راشد ہسپتال سے واپس لوٹی تو بڑے دھڑلے سے مجھے بتایا کہ وہ میرے اور ثمرین کے خلاف پولیس میں رپورٹ کر آئی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہاں کا قانون بالکل الگ ہے۔ شکایت ہو گئی اور اگر وہ جرم کی زد میں آتی ہے تو پہلے آدمی پکڑ لو تفتیش بعد میں ہوتی رہے گی۔ چنانچہ بڑے سے بڑا اثار زن بھی پگڑی اترنے کے ڈر سے قانونی حدِ ادب میں رہتا ہے۔ میں تو کسی گنتی میں ہی نہ تھا۔ معاملہ بیٹی کا تھا کہ ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ کسی مشکل میں نہ آ جائے۔ ڈرا ڈرا پہلے ہسپتال پولیس پوسٹ اور پھر ان کے کہنے پر پولیس اسٹیشن پہنچا تو پتہ چلا وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس نے واقعی تشدد کی شکایت کی تھی۔ ڈاکٹر نے ضربات کا طبی معائنہ کر کے اس کی نفی تو کر دی تھی لیکن کم از کم میرے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ کینسر کے کچھ مریض ایسے بھی ہوتے ہیں' بیٹھے بٹھائے ذرا سی حرکت پہ ان کی ہڈی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور میں خوف زدہ تھا کہ اگر کہیں اس کے ساتھ ایسا ہو گیا تو۔۔۔؟ چنانچہ میں نے بیٹی کو کچھ دنوں مائیکے آنے سے منع کر دیا۔ میرا اپنا ذہنی انتشار بھی میرے صبر سے کہیں آگے گذر چکا تھا اور میں فرار کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ شاید موقع کو غنیمت جان کر احتشام نے مشورہ دیا۔ "میں نے الگ گھر کا بندوبست کر لیا ہوا ہے۔ آپ وہاں شفٹ ہو جائیں۔" مجھے مرتے دم تک یہ شرمندگی اور درد رہے گا کہ اگر عصمی ہوش میں نہ تھی تو میں اپنے حواس

میں کیوں اندھا ہو گیا اور سامان سمیت سچ مچ گھر چھوڑ گیا۔ اسی شام قدیر سے سنا کہ۔ "اماں آپ کے جانے کے بعد زور زور سے گاتی پھری تھی۔

"پنچھی بنوں' اڑتی پھروں مست گگن میں۔ آج میں آزاد ہوں دنیا کے چمن میں۔۔"

لیکن اس رات مجھے بے آرام نیند بھی نہ آئی۔ بہت پیار تھا ہم دونوں میں' پھر اب یہ کیا ہو گیا ہے؟ میری ساری جمع تفریق اور مساوات نے مجھے یہی سمجھایا کہ اسے ہاتھ ٹب میں اپنا گرنا بالکل یاد نہیں۔ جھگڑے صرف مجھ سے اور بیٹی سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ضربات کے درد کو اس نے ہم سے جوڑ دیا۔ اگلی صبح موسم کا رنگ دیکھ کر کھسکے رہنے والے بیٹوں سے میں نے درخواست کی کہ اماں کو کچھ دھیرج سمجھائیں اور ہماری صلح کروادیں۔ عجیب بات ہے کہ میں انتظار کرتا رہا کسی ایک نے بھی اس نیک کام کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ دوسری صبح مجھے خبر ملی کہ رات اسے سانس کی تکلیف ہو گئی تھی اور دوبئی ہسپتال لے گئے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا میں آخری دم تک اپنے آپ کو معاف کر سکوں گا؟ تبھی میں نے قدیر کو ٹیلیفون کیا کہ وہ میرا کمرہ صاف کر دے میں پھر واپس آرہا ہوں۔ شام کو میں سامان سمیت لوٹا تو حیرت سے اس نے قدیر کو کہا۔ "ہیں وے! تیرا بابا تے فیر واپس آ گیا اے۔۔" وہ اماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اس نے جانے کیا سوچ کر ثمرین کو آواز دی۔ "آپی! آکر امی کے پاؤں دباؤنا۔! میں کھانا بنالوں۔۔۔" عصمی کچھ نہ بولی تو بیٹی نے اس کے پاؤں گود میں لئے اور دبانے لگی۔ میں بھی دھیرے سے سامنے صوفے پر آن بیٹھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں بیٹوں کو کوہ قاف سے جو بیش قیمت آبدار موتی لانے کی فرمائش کر رہا تھا وہ اتنی آسانی سے مجھے مل گیا تھا۔ پھر اس کے بعد ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے اس کا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ کیموتھراپی بھی یہ کہہ کر روک دی گئی تھی کہ اب روایتی ادویات سے اس کا علاج ہو گا تاکہ کیمو کے زہریلے اثرات اس کے خون میں سے خارج ہو جائیں۔ اور ہم اپنے تئیں خوش ہو رہے تھے کہ اب شاید اس

کی طبعی بشاشت بھی لوٹ آئے گی۔ اور ہوا بھی کچھ یونہی۔ عدیل کی تین سالہ بیٹی آ جاتی۔ دادی پوتی ایک دوسری کی کنگھی پٹی کرتیں' کھانا کھلاتیں اور گھر میں اک ٹھہراؤ آگیا۔ لیکن انہی دنوں وہ بینائی کم ہونے کی شکایت کرنے لگی۔ پتہ چلا دونوں آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے۔ وہ آبدار آئینے جو میری راہوں میں اجالے پھیلاتے تھے' دھیرے دھیرے دھندلانے لگے۔ پھر وہ ان پر ہاتھ کا سایہ کر کے پوچھتی۔ "یہ آپ نے ساتھ میں دو بلیلاں کیوں بٹھار کھی ہیں۔۔۔؟" ہم سب ان باتوں کو کھیل مذاق سمجھتے۔ میں نے جواب دیا۔ "تمہیں ٹھیک سے نظر نہیں آرہا۔ غور سے دیکھو تو میں نے اپنے ساتھ دو شیر بٹھار کھے ہیں۔۔۔" اب اس میں اک عجیب سا تحمل اور قوتِ برداشت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے ہمیں دیکھتی رہ جاتی۔ باہر جانے لگے تو اس نے احتشام کی بیوی کو خبردار کیا کہ اس کی کار کی چھت پر دو سانپ بیٹھے ہیں۔ کبھی وہ آکر خبر دیتی کہ باہر لان میں جھولے پر دو آدمی بیٹھے ہیں۔ ان میں سے بڑی بڑی مونچھوں والا جو سگریٹ پی رہا تھا وہ بہت خطرناک ہے۔ آپ باہر نہ جانا۔۔۔"

ایک صبح اس نے عجیب سے خوفزدہ' ڈرے ڈرے لہجے اور انداز میں مجھے گذشتہ رات کا واقعہ سنایا۔

"آپ تو بہت گہری نیند سو رہے تھے آپ کو پتہ ہی نہیں رات یہاں کیا ہوا۔۔۔؟"

میں قطعی لاعلم تھا۔ بہت حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا۔۔۔؟" وہ بولی۔

"دروازے پہ گھنٹی ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول تو باہر دو شرطے (Policemen) کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور بہت مارا۔ پھر مجھے کھینچتے ہوئے لے چلے۔ میں پانی مانگ رہی تھی انہوں نے کہا کہ پانی تو ہم تمہیں کبھی بھی نہ دیں گے۔ محلے کے سارے لوگ باہر جمع تھے لیکن کسی نے مجھے نہیں چھڑایا۔ پھر سامنے والے عربی کا بیٹا آیا۔ اس نے شرطوں کے ساتھ جھگڑا

کیا کہ پانی تو تمہیں دینا ہی پڑے گا۔ اور اسی نے مجھے پانی کی بوتل لا کر دی۔۔۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی کہانی کا اختتام و انجام اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن گذشتہ رات اک واقعہ ہوا تھا جو اس کے ذہن میں ایسا موڑ لے گا اس کا مجھے قطعی اندازہ نہ تھا۔ گذشتہ رات بیٹھے بٹھائے یکدم وہ پانی کی بوتل لئے ہیجانی کیفیت میں گھر سے نکلی تھی۔ تب گھر میں صرف میں اور قدیر تھے۔ ہم پیچھے بھاگے کہ اسے واپس لے آئیں ورنہ اس وقت وہ کسی ہسپتال میں جا پہنچی تو خبر ملنے تک کہاں تلاش کریں گے۔ اس کا راستہ روکا اور بڑی مشکل سے اسے لے کر آئے۔ اس دوران وہ بار بار پانی کے گھونٹ بھرتی رہی۔ شاید اپنی منتشر ذہنی کیفیت میں اس نے ہمیں پولیس باور کر کے یہ واقعہ تشکیل کر ڈالا۔ یا پھر چند روز پہلے اس نے ڈھیروں برتن توڑ ڈالے اور گھر میں جا بجا بکھری کرچیوں پہ اس کے زخمی ہونے کے خوف سے میں نے پولیس بلائی تھی۔ شاید وہ صدمہ اس کے تحت الشعور میں یوں پیوست ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے بہت گھن آئی۔ خدا جانے یہ میرا گناہ تھا یا نہیں لیکن میں تب' اور آج بھی اپنے آپ کو بہت کوستا اور ملامت کرتا ہوں۔ احساس کی یہ سوزش آخری لمحوں تک مجھے بھی جلاتی رہے گی۔

بعد میں کینسر مریضوں کے لواحقین سے ایسے پچاسوں ہی واقعات معلوم ہوئے۔ لیکن میں خدا کو حاظر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تب ہم میں سے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا اور ہمارے پوچھنے کے باوجود کسی ڈاکٹر نے بھی ہمیں نہ بتایا کہ یہ کیا علامات ہیں اور کس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہیں؟ یہ تو بہت بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ اسے 'ہیلو سینیشن' (Hallucination) کہتے ہیں۔ یہ تو رونے والوں کے آنسوؤں بیچ ایسی ڈھیروں کہانیاں سن سن کر جانا کہ یہ دیئے کی آخری ٹمٹماہٹ تھی۔

مجھے گھر لوٹے شاید دو روز ہوئے تھے کہ اسے سانس میں شدید دقت ہوئی۔ راشد ہسپتال ایمر جنسی میں لے کر گئے تو وہاں سے جواب مل گیا کہ اسے مخصوص کینسر ہسپتال لے جائیں۔ پھر توام ہسپتال العین لے گئے۔ رات بھر انہوں نے ماسک چڑھائے رکھے اور آکسیجن اور دوسری ادویات دیتے رہے۔ صبح کے قریب اس کی طبعیت سنبھلی تو واپس لوٹے۔ لیکن 9 ستمبر کو اس سے بھی شدید دورہ پڑا۔ سارا گھر اسے لے کر آگے پیچھے العین ہسپتال میں پہنچے۔ وہ کچھ ہوش میں آئی تو اس نے ثمرین سے پوچھا۔ "ہیں نی بِٹو!۔ گھر سے تو تم مجھے گھمانے پھرانے کے لئے لے کر نکلے تھے۔ میں یہاں العین ہسپتال پہنچی کیسے۔۔۔؟" انہوں نے ایڈمٹ کر لیا۔ چار دن رکھا۔ یکے بعد دیگرے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ اس نے آنکھوں کے آپریشن کی اپائنٹمنٹ بھی لے لی کہ اسے عدیل کی بیٹی "شونو" کی شکل صاف نظر نہیں آتی۔ آپریشن کے بعد سب سے پہلے وہ اسے دیکھے گی۔ لیکن اسے اور ہمیں کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ اتھاہ اندھیرے اس قدر تیزی سے ہماری جانب بڑھ رہے ہیں کہ وہ ہمیں نہیں ہم ہی پھر کبھی اسے دیکھ نہ پائیں گے۔ 26 ستمبر کو اس کی اپائنٹمنٹ تھی۔ ہم پہنچے تو پہلی بار موجود ہونے کے باوجود اس کا کنسلٹنٹ ڈاکٹر اسے' بلکہ ہم میں سے کسی کو نہیں ملا۔ ہمیں پیپر تھما دیئے گئے کہ آئندہ مریضہ کا علاج "پیلیٹو کیئر" ڈیپارٹمنٹ میں ہوگا۔ اتنا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود میں نے "پیلیٹو" (Palliative) کا لفظ ہی زندگی میں پہلی بار سنا تھا۔ یہ کیسے جانتا کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ عصمی کے لئے تو کنسلٹنٹ ڈاکٹر کا نہ ملنا ہی سب سے بڑا صدمہ تھا۔ اس نے خود ہی باور کر لیا کہ اس نے علاج سے جواب دے دیا ہے۔ وہاں اسے ایڈمٹ کر لیا گیا اور پھر اس ڈیپارٹمنٹ کے پتھریلے چہرے والے ہیڈ' پاکستانی ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو مجھے پتہ چلا کہ جلادوں' بے رحم کاموں کے لئے واقعی بے حس پاکستانی ڈاکٹروں سے بہتر کوئی بھی نہیں۔ آتے ہی انہوں نے عصمی کو سپاٹ لہجے میں مشورہ دیا کہ اسے گھریلو ماحول میں رہنا چاہیئے۔ اس نے جواب دیا کہ اس بار تو وہ پوری طرح ٹھیک ہو کر ہی گھر جائے گی۔" میری

آنکھوں کا آپریشن ہو گا۔ میں اپنے اچھے ڈاکٹروں کو دیکھوں گی جنہوں نے مجھے ٹھیک کیا ہے تو گھر جاؤں گی۔۔۔" میں نے ہیڈ صاحب کے چہرے پر ناگواری دیکھی۔ انہوں نے کمرے میں سے باہر بلا کر مجھے اور بیٹوں کو بتایا کہ اس کا آخری وقت ہے ہمیں اسے گھر لے جانا چاہیئے۔ تب میں نے جانا کہ یہ وہ وارڈ ہے جہاں آدمی صرف موت کی چاپ سننے آتا ہے اور یہیں سے وہ اپنی صلیب اپنے کندھوں پہ اٹھا کر آخری منزل کو چلتا ہے۔

ڈاکٹر بات کر رہا تھا اور میرا پورا وجود لرزاں تھا کہ ابھی جو ہے وہ کچھ پل میں نہیں ہو گا۔ ایک زندگی جو ہمارے درمیاں رواں دواں ہے کسی لمحہ عدم ہونے والی ہے۔ اس خوف کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو اس درد سے گذرے ہیں۔ میں ریزہ ریزہ تھا لیکن عصمی کی آخری امید چھیننے کو تیار نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے مشورے کو یکسر رد کر دیا۔ واپس کمرے میں گیا تو معلوم ہوا وہ ڈاکٹروں سے بہتر خود ان کی نبض پڑھنے لگی تھی۔ اندر وہ قدیر سے کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر نے گاڑی میں آکسیجن سلنڈر رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اب میں باہر بھی نہیں جا سکتی۔ اپنے والی بات ختم ہو گئی۔۔۔"

کنسلٹنٹ کا ملاقات سے احتراز اور اس ڈاکٹر کا ہمیں باہر بلا کر بات چیت کرنا' اس کے لئے واضح اشارے تھے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ باقی سب چہروں کے کینوس بورڈ پر لکھا تھا۔

XXX

اسے ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے شاید تیسرا روز تھا۔ چہرے پہ اک تناؤ سا اور آنکھوں میں بے چین الجھنیں۔ ہمارے بیچ بیٹھی بھی وہ کہیں اور تھی۔ شام کو قدیر اسے وھیل چیئر پہ نیچے ہال اور پڑوس میں سپر مارکیٹ تک گھمانے لے گیا کہ طبعیت بہل جائے۔ کچھ گھنٹہ ڈیڑھ بعد لوٹے تو عصمی کے چہرے پر اک نئی حیرت و پریشانی ہویدا تھی۔ اس نے اپنے سر پہ دوپٹہ ٹھیک کیا۔ بہت سلجھے انداز میں مجھے سلام و علیکم کہا اور بے پناہ سادگی سے پوچھا۔

"کیسے ہیں آپ۔۔۔؟"

مجھے سمجھ نہ آیا اسے سنجیدہ سوال سمجھوں یا اک نئی شرارت؟ بے یقینی کی حالت میں مسکرا کر ہونقوں کی طرح میں نے جواب دیا۔

"جی! اللہ کا شکر ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس آپ کی دعائیں ہوں تو۔۔۔"

"آپ ابھی تو نیچے والے کمرے میں تھے۔۔۔" اس نے میرا مزاح میرے حلق ہی میں گھونٹ دیا اور بولی۔ "آپ اتنی جلدی اوپر اس کمرے میں کیسے آ گئے؟ آپ کا بھی کوئی مریض ہے یہاں۔۔۔؟"

میری عقل سچ مچ میرے گلے میں ہی پھنس گئی۔ ثمرین میرے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تو عصمی پھر بولی۔

"یہ عورت بھی تو وہیں تھی۔۔۔" پھر اس نے پلٹ کر قدیر سے کہا۔ "چل دے۔ میرا پرس اٹھا۔ پتہ نہیں کہاں لے آئے ہو۔ اوپر اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔۔۔"

ثمرین نے اس کا پرس پکڑ لیا اور اب جھگڑا ہو گیا۔ وہ جانے پر بضد تھی اور ہمیں پہچان بھی نہ رہی تھی۔ تصور میں وینا' رباب و سرود کے سارے تار ٹوٹ بکھرے۔ مذاح وظرافت کا خانہ خراب ہو گیا۔ اسے روکنے کا جتن کرتے ثمرین سے نرس بلانے کے لئے کہا۔ اس نے بھاگم بھاگ کوئی دوائی لا کر دی اور تب اسی سے پتہ چلا کہ یہ سارا انتشار 'ہیلو سینیشن' (Hallucination) کہلاتا ہے۔

اگلے روز اس نے اک نیا باب کھول دیا کہ قدیر مجھے ایک ٹوٹی پھوٹی موٹر سائیکل پہ بٹھا کر پتہ نہیں کہاں کہاں پھراتا رہا اور پھر اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے ان لوگوں کے کمرے میں لے گیا۔ بہت سوچا تو اندازہ ہوا کہ وھیل چیئر کو سڑک پہ دھکیلتے چونکہ کچھ جھٹکے لگے ہوں گے لہٰذا وہ ٹوٹی پھوٹی موٹر سائیکل بن گئی۔ سپر مارکیٹ تک دائیں بائیں موڑ' کہاں کہاں' کا فاصلہ بن گئے۔ اور کاؤنٹر پہ بل ادا کرنے لگے تو وہاں کھڑے سیلز مین اور گرل اس کمرے میں قدیر کے رشتہ دار بن گئے۔ پھر اسے کمرے میں بار بار بلیلاں' سانپ اور کئی دوسرے جانور نظر آنے لگے۔ وہ تعفن کی شکایت بھی کرنے لگی۔ ہم نے ڈاکٹر سے اپنی پریشانی بیان کی۔ اس نے بالائی منزل پر ایک زیادہ روشن کمرے میں منتقل کر دیا تو وہ قدرے پر سکون ہوئی اور ہماری پریشانی کم ہوئی۔

مجھے' ثمرین اور قدیر کو ہسپتال میں ساتھ رہتے لگ بھگ ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ بیٹے اور بہویں فارغ ہوتے تو آفس سے سیدھے العین ہسپتال کا رخ کرتے اور رات گئے واپس لوٹتے۔ ہمیں کمرہ تو ملا تھا لیکن وہ بنیادی طور پر ایک مریض اور ایک تیمار دار کے لئے تھا۔ ان کے لئے ایک بیڈ اور ایک دراز ہو جانے والی کرسی تھی۔ باقی دو کے لئے فرش حاضر تھا۔ چنانچہ میں اور قدیر وہیں براجمان ہو گئے۔ باتھ روم لے جانے کی ضرورت ہوتی تو ثمرین مدد کرتی۔ آدھی رات درد کی وجہ سے پاؤں' ٹانگیں دبانے یا نرس کو بلانے کے لئے قدیر اٹھتا۔ میری تھکی تھکی کمر اور عمر کا اکہترواں سال ڈھل رہا تھا پھر بھی کھوٹے سکے کی طرح جیسے تیسے ان کے کام آ ہی

جاتا تھا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین تو بہت پہلے ہی سے سمٹتی سکڑتی فقط ایک مدار کی پابند ہو گئی تھی۔ کبھی دل میں گیت مالا کے سر بکھرا کرتے تھے تو تخیل میں ملگجی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ آتیں۔ موسم شرابی سا ہو جاتا۔ چنار کے درختوں بیچ پگڈنڈیوں پر اجلی سفید برف بچھ جاتی اور جی چاہتا کسی کاٹیج کی سیڑھیوں پہ بیٹھے اس کا ہاتھ تھاموں اور اسے سناؤں۔۔۔

"۔۔۔میں بھی وہیں رہوں' میرا ساجن جہاں رہے۔۔"

سچ ہے۔ ساتھی اچھا مل جائے تو جنت کی تلاش و آرزو بھی نہیں رہتی۔ لیکن وہ جولانیاں جانے کہاں کھو گئیں۔ اب تو میرے اندر برہا کی سسکیاں اور کراہیں رات بھر مجھے عذابوں سے گذار رہی تھیں۔ صبح سے دن بھر ڈاکٹروں' نرسوں کے راؤنڈ شروع ہو جاتے جس کے سبب بے آرامی بڑھتی گئی۔ دماغ جیسے سر سے اوپر معلق ہو گیا اور آنکھیں حواس کا ساتھ چھوڑنے لگیں۔ جمعرات 4 اکتوبر خود عصمی نے ہی سہ پہر ہمیں دوبئی گھر کی طرف دھکیل دیا کہ ایک رات وہاں آرام کریں اور اپنے حلیئے درست کر کے آئیں۔ شفٹ بدل گئی۔ ثمرین اور شرمین وہاں رہیں اور ہم چلے آئے۔ اگلی صبح قدیر 'اماں' کے لئے بریانی بنا لے چلا۔ وہاں پہنچے تو ثمرین نے بتایا کہ عصمی کی گذشتہ رات بہت بے چین' بہت بے سکون گذری تھی۔ کبھی بیڈ پہ لیٹتی اور پھر چند منٹ بعد صوفے پہ آ جاتی۔ یوں وہ رات بھر سو نہیں پائی۔ صبح ڈاکٹر راؤنڈ پہ آیا تو دوسری ادویات کے ساتھ نیند کے لئے اسے زینکس (Xanax) کھلا گیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک بار میں خود بھی اس گولی کو بھگت چکا تھا۔ وہ تو اچھے بھلے آدمی کو گھما دیتی ہے۔ لیکن وہ بہر کیف ڈاکٹر تھا۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی وہ گولی دی ہو گی۔ شاید اسی لئے وہ کچھ پُرسکون تھی۔ اسے بریانی دی۔ اس نے کھائی لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ زندگی کی آخری بریانی کھا رہی ہے۔ کچھ وقت گذرا تو اس نے ثمرین کو ایک روز گھر جا کر آرام کرنے کی چھٹی دے دی۔ وہ گئی تو سہ پہر عدیل آ گیا اور ماں کے ساتھ اس کا مسکہ لاڈ ہونے لگا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں شام ہو گئی۔ احتشام فیملی قدرے تاخیر سے پہنچی۔ وہ ماں اور ہم سب کے لئے پیزا

لے کر آیا تھا۔ تب تک مجھے وہ معمول سے کچھ زیادہ چپ لگی لیکن میں نے کچھ پوچھا نہیں کہ شاید اپنی سوچوں میں میری دراندازی اسے اچھی نہ لگے۔ وہ پیزا کھانے لگی تو میں نے اسے کہا۔

"ان لوگوں نے واپس بھی جانا ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ انہیں کہو وقت پہ جائیں۔۔۔"

میری یہ بات سب نے سنی لیکن میں دراصل عصمی کی خاموشی توڑنی چاہتا تھا۔ اور تبھی اس کی آواز سنائی دی۔

"جاؤ پہائیا! جانا ہے تو وقت پر جاؤ۔۔۔!!"

یہ انداز اس کا نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ میں پیزا کا لقمہ تھا جسے وہ ٹماٹر کیچ اپ (Tomato Ketchup) میں لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ پلیٹ کی بجائے بار بار ٹرے سے ٹکرا رہا تھا۔ میرے جی میں اک خوف سا رینگ آیا۔ برسوں پہلے میں نے اس کی ماں کو بھی بالکل ایسی کیفیت میں دیکھا تھا۔ کھانا کھاتے وہ لقمہ سالن کی بجائے چنگیر میں مار مار منہ میں ڈال رہی تھیں اور پھر وہ نہیں رہیں۔ ان کی وہ جھلک ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں کوندی اور کچھ سمجھ پاسکنے سے پہلے ہی تحت الشعور میں ڈوب گئی۔ دل پہ یکلخت بوجھ سا بن گیا لیکن اب بچے واپس جانے لگے تھے لہٰذا دھیان ادھر بٹ گیا۔ اس اثنا میں عصمی لیٹ گئی۔ اب میں' شرمین اور قدیر وہاں رہ گئے تھے۔ چند ہی منٹ میں ہمیں لگا کہ وہ سو گئی ہے۔ گذشتہ رات اس کی بے آرامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنے لہجے مزید دھیمے کر لئے بلکہ غیر ضروری باتیں ہی بند کر دیں۔ شاید پندرہ بیس منٹ گذرے ہوں گے کہ نرس انجکشن لگانے آگئی۔ وہ شاید اسی حالت میں اپنا کام کر کے چلی جاتی لیکن خدا جانے کیوں میں نے اسے ٹوک دیا کہ یوں نیند میں سوئی کی چبھن سے وہ دہل سکتی ہے اس لئے جگا کر انجکشن دے۔ اور یہی لمحہ تھا جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ ہوش کی حدوں سے آگے جا چکی تھی۔

اس کا ہاتھ تھپتھپایا' اسے آوازیں دیں' ہلایا جلایا' اس نے جواب دیا نہ آنکھیں کھولیں۔ بھاگم بھاگ نرس کو' اور اس نے ڈاکٹر آن کال کو بلایا۔ وہ کچھ تاخیر سے پہنچا۔ بہر کیف وہ کسی بھی طرح ہوش میں نہیں آئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ 'کوما' (Coma) میں ہے تو اس نے اس کا اقرار کر لیا۔

اب جو کوئی بھی ضروری اقدامات تھے 'آکسیجن ماسک اور دیگر مانیٹر لگا دیئے گئے۔ ہمیں بتا دیا گیا کہ صبح دماغ کا سکین ہو گا۔ تب تک میری ہستی' میرے وجود اور اپنے آپ کو سمیٹے رکھنے کے سبھی تانے بانے' جتن ٹوٹ بکھرے تھے۔ میں نے بچوں کو ٹیلیفون کر دیئے کہ "ماں کوما میں ڈھل گئی ہے۔ واپس لوٹ آؤ۔۔۔" خود مجھے آنے والے لمحوں پہ اعتبار نہیں رہا تھا میں انہیں تسلی کیا دیتا۔ عدیل آدھ راہ سے لوٹ آیا۔ احتشام دوبئی گھر کر دروازے سے پلٹا۔ پھر بوبی اور ثمرین بھی آ پہنچے۔ اک صرف عصمی ہی رہ گئی جس کا محل وقوع مجھے معلوم نہ تھا۔

صبح کب اور کیسے ہوئی مجھے معلوم نہیں۔ برین سکین (Brain Scan) کے لئے سٹریچر سے مشین پر منتقل کیا تو ہمیں باہر جانے کے لئے کہا گیا۔ بوبی اور عدیل نکل گئے۔ میں ابھی دروازے تک پہنچا تھا کہ اس کا نرخرہ بولنا شروع ہو گیا۔ یوں جیسے وہ مجھے کچھ یاد دلا رہی ہو۔ لگ بھگ نصف صدی پہلے میری نانی نے میرے سامنے دم توڑا تھا۔ وہ فالج کی وجہ سے کوما میں تھیں۔ بہت دنوں مکمل سکوت کے بعد یکبارگی ان کا نرخرہ بولا تو باقی سب نے سمجھا وہ ہوش میں آ رہی ہیں لیکن ابا جی نے نانا جان کو نانی کی پائینتی کھڑے کر کے کہا۔

"مامی کے آخری لمحے ہیں ماموں! انہیں بخش دیں۔۔۔"

یہی لگا جیسے عصمی مجھے بھی اپنا وہی حق یاد دلا رہی ہو۔ وہاں صرف ہم دونوں ہی تھے اور میرے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پھسل چکا تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی کہ سکیننگ کے بعد کسی طور اسے واپس کمرے میں لے جاؤں اور پھر وہاں ساری اولاد' ان کے تعلق داروں اور خبر پرسی کرنے والوں کے بیچ میں نے اس کے پاؤں تھامے اور کہا۔

"عصمت شہزادی! زندگی کے وہ تمام گناہ' جن کا تعلق میری ذات سے ہے' وہ میرے ہیں۔ میں اللہ اور اس کے رسول کو حاظر و ناظر جانتے ہوئے ان سے' اور اپنی ذات سے جڑے تمام حقوق و فرائض سے تمہیں آزاد کرتا ہوں۔۔۔"

رونے کی آوازوں سے کمرے کی فضا میں ہیجان پیدا ہو گیا لیکن یہ امر بے حد عجیب تھا کہ اس کے زخرے کی آواز یکبارگی بند ہو گئی جیسے اسے فقط اسی لمحے کا انتظار تھا۔ بچے اسے پکارنے' ہلانے لگے تھے۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پہ جمی تھیں وہاں اک ہنگام اضطرب تھا۔ مجھے لگا وہ کوما کے باوجود ہمارے بہت قریب تھی اور ہماری آوازیں سن رہی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ تھامے احتشام اسے پکار رہا تھا اور بائیں جانب بوبی اسے پھر عمرہ پہ چلنے کا کہہ رہا تھا۔ اس کے ہر نقش میں دیئے کی لو شدت سے پھڑکی تو میں نے اپنی تمامتر تڑپ سے اسے پکارا۔

"عصمت شہزادی! تم ہمیں سن رہی ہو۔ سبھی بچے تمہارے انتظار میں ہیں۔ تمہیں ہمارے لئے واپس آنا ہے۔ آنکھیں کھولو عصمت شہزادی! ۔۔۔"

اس کے پپوٹے کپکپائے۔ چہرے پہ اذیتیں گہری ہو گئیں۔ خدا جانے وہ راہ میں حائل کن پردوں کو ہٹا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے پلکیں لرزیں اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ آنسوؤں سے جل تھل تھیں۔ لب اک بار لرزے لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی ساکت ہو گئے۔ شاید تبھی بائیں آنکھ سے اک بے بس آنسو ڈھلا اور مجھے لگا جیسے وہ اپنے اور میرے بیچ کے سارے عہد و پیمان' رشتے' کہانیاں' سبھی بندھن سمیٹ لے گئی ہو اور فقط ایک آنسو دے گئی۔ جس نے میری روح پہ دستک دی اور دھیرے سے کہا۔

"لو بھئی۔ ہم تو چلے۔ ہمارا تمہارا ساتھ بس یہیں تک تھا۔۔"

جس شام میں اپنا سامان لے کر گھر سے چلا گیا تھا۔ اس رات اکیلے میں' میں اس سنگ بیٹے پلوں کو چنتا' دیپوں کی طرح اپنے ارد گرد سجاتا رہا۔ اس کا چہرہ روشن ہوا تو میرا جی چاہا۔ اک بار اسے بانہوں میں لوں اور اس کے گال سے گال ملا کر بار بار اسے پکارتا رہوں۔

"۔۔۔ عصمی! تم بن جی نہ پاؤں گا۔۔۔"

لیکن میرا گلا رندھ گیا اور وہ آنکھیں آپ ہی آپ موند گئیں۔ پھریوں جیسے پلوں میں صدیوں کے فاصلے طے کرتی وہ ایسی تیزی سے اپنے نقطۂ عدم میں ڈوبی کہ ہم اسے بلاتے رہے' بچے اسے ہلاتے' جھنجھوڑتے رہے وہ پھر نہیں جاگی۔ اسی شام چھ بج کر بیس منٹ پر اس کا سانس اور دل کی دھڑکن بھی تھم گئی۔ بجلی کے جھٹکے بھی اسے نہ جگا سکے۔ اوراقِ پارینہ کی کہانیوں میں وزیر آباد کی گوگی بھی ایک کہانی بن گئی تھی۔

)()()(

میرے زمان و ادوار سبھی وقت کی دھول میں اٹے ہیں اور اس کی قبر کنارے بیٹھ انہیں کُرید تا میں اِنتظار کر تا رہا ہوں اِک ہتھیلی کا۔ کہ میرے آگے پھیلے اور میں اپنی جان اس پر رکھ دوں۔

"۔۔۔ کہاں رہ گئی تھیں عصمی! اتنی شامیں تمہاری راہ تکتے میری آنکھیں بھی دھندلانے لگی ہیں۔ ڈرتا تھا۔ تم سامنے کہیں دور سے گذر گئیں تو تمہیں دیکھوں گا کیسے۔۔۔؟ "

"ہائے ڈیا! ۔۔۔ "مدھم سی سرگوشی ہو۔" آتے آتے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ پر آج آپ کو لینے آئی ہوں جی!۔۔۔"

جبلِ رحمت سے بڑھے اس ہاتھ کو تھام کر میں چپ چاپ اس کے ساتھ چل دوں۔ اس نے آٹھ برس میرا انتظار کیا تھا۔ اور اس کی راہ تکتے میرا تو اک اک لمحہ آٹھ آٹھ صدیوں میں ڈھل گیا ہے۔ نگاہیں ہر سو اسے تلاش کرتی ہیں۔ اللہ ہی جانے' اس نے آدم کو 'عورت' کے عنوان سے یہ کیسی دمساز دی ہے کہ اس کا ساتھ ہو تو مرد کو اس کی تکمیل کا' اس کے وجود کا یقین دلاتی ہے اور کبھی ہاتھ چھوٹ جائے تو وہ بکھر ' منتشر ' عدم ہو جاتا ہے۔ پیچھے بس دھول رہ جاتی ہے۔

اور مجھے عصمی کو بتانا ہے کہ۔

تم بِن میں خلا کے سکوت میں بے مدار بے وقعت ہو گیا ہوں۔!!!

XXXXXXX

ساری زندگی وہ بار بار مجھے کہتی رہی۔ ''ایک بار پھر مجھ پر کوئی کتاب لکھونا۔۔۔'' لیکن انسانی سرشت میں ہے کہ جسے پالیا اس کی قدر نہیں رہتی۔ میں ہنس کر اسے ٹال دیتا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ساتھ چلتے ایک روز وہ میرا ہاتھ چھوڑ دے گی تو میں اسے بہت یاد کرتے اس کی آرزو پوری کروں گا۔ ''وزیر آباد کی گوگی'' اسی کی کے گرد بکھرے لمحوں کی داستان ہے۔ اسے کینسر تشخیص ہوا اور ہم اس مرض کے آدابِ سفارت سے نابلد تھے۔ بے شمار غلطیاں ہوئیں۔ گھر کے اندر کوتاہ بین تھے تو اس چار دیواری کے باہر دانش مند رشتہ داروں نے بھی اپنی بلاؤں کا منہ اسی کی طرف موڑ دیا۔ ساری کہانیوں کو سمیٹ کر وہ چلی گئی۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کے کسی پیارے کو ایسا اذیت ناک مرض ہو۔ بس جی جان سے اس کا خیال رکھیئے گا۔ ورنہ یہ بت ٹوٹتے ہیں تو اپنے پیچھے کراہتی یادیں اور خس و خاشاک لمحے ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ کہانی صرف اس لئے لکھی گئی کہ آپ لرزتی ٹمٹماتی لو کے پسِ منظر میں ان دیکھی موہوم سی تحریروں کو پڑھیں اور درد کی بجائے چاہتوں کی خوشبو میں اسے رخصت کرسکیں۔

لاہور • حیدر آباد • کراچی